میر خدا بخش مری

سابق چیف جسٹس و گورنر بلوچستان

خ ت
240

مارشل لا

آئین اور عدالتیں

مترجم
نذیر حق

Marfat.com

کلاں - ذخیرہ

یہ کتاب فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کے زیرِ اہتمام
شائع ہونے والی مقبولِ عام کتاب A JUDGE
MAY SPEAK کا سلیس اُردو ترجمہ ہے۔

58921

جُملہ حقُوق محفُوظ ہیں

© 1992 Justice Khuda Bakhsh Marri

فیروز سنز لاہور

بار اوّل ---------- ۱۹۹۲ء

مطبع ـــ فیروز سنز لاہور

مجلّد ـــ 969 0 01115 4

Marfat.com

فہرستِ ابواب

حرفِ اوّل

باب اوّل	——	ملٹری ازم اور عدالتی انجینئرنگ	۷
باب دوم	——	ایک بروقت انتباہ	۴۵
باب سوم	——	قانون کی حکمرانی کی موت	۵۵
باب چہارم	——	فل بنچ کا فیصلہ	۸۱
باب پنجم	——	متعصب اور اجارہ دار پریس	۱۰۵
باب ششم	——	محروم صوبے اور بے بس عوام	۱۴۸
باب ہفتم	——	حرفِ آخر	۱۹۷

تتمّہ جات

Marfat.com

Marfat.com

حرف اول

عارضی دنیاوی فوائد بلاشبہ اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں ۔ لیکن ان فوائد کی خاطر مسلمہ اصولوں کو پس پشت ڈالنا ' جس کے نتیجے میں حکومت کے تمام شعبوں میں افراتفری مچ جائے ' نہ صرف قوم بلکہ آنے والی نسلوں کے ساتھ بھی بہت بڑی زیادتی ہے ۔ اس ملک میں عدلیہ ' قانون کی حکمرانی ' اتفاق رائے سے حکومت ' بنیادی انسانی حقوق ' چھوٹے صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی متوازن تقسیم اور جمہوری روایات کو کس طرح ' کیوں اور کس نے پامال کیا اور تباہ کر کے رکھ دیا اور طاقت اور سازشوں کے ذریعے حکمرانی کا اصول عوام نے کس طرح تسلیم کر لیا ؟ میں نے اس کتاب میں انہی گھمبیر سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے ۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں ' یہ فیصلہ تو قاری ہی کرے گا میں نے اس ملک پر طاری کیفیت کا احوال بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور مباحث کے دوران بعض تجاویز بھی پیش کی ہیں ۔ کئی ایک معاملات میں میری کم علمی قابل معافی ہو سکتی ہے لیکن میرے خلوص نیت پر شک نہیں کیا جانا چاہئے ۔ اس کے علاوہ یہ کتاب مستقبل کے مورخین کے لئے کچھ مواد پیش کرتی ہے تاکہ اس کے مطالعہ سے وہ اپنے نتائج اخذ کر سکیں اور شاید اصلاح احوال کے لئے تدابیر بھی پیش کر سکیں ۔ میں نے اپنے اہل وطن کو جگانے اور بے حسی اور آرام طلبی کو ترک کر کے یہ سوچنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وطن کو کس طرح اس بد نصیبی سے نجات دلائی جا سکتی ہے جو خود اہل وطن نے اس پر مسلط کی ہے اور پھر یہاں ایک منصفانہ ' جمہوری اور متحمل معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے جس میں کسی کو اپنے ہمسایہ سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو ' بلکہ لوگ ایک دوسرے سے مدد ' تعاون ' باہمی مفاہمت اور برادرانہ خلوص و محبت کے طلب گار ہوں۔

میں ایک آخری بات کہنا چاہتا ہوں ۔ میں بہت سے واقعات کا عینی شاہد ہوں بلکہ بعض حوادث میں تو میرا کچھ کردار بھی رہا ہے لہٰذا دوران تحریر بسا اوقات میرا نام آنا ناگزیر ہے ' کتاب میں جن دستاویزات کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ان میں بھی میرا نام ضرور

Marfat.com

موجود ہے ۔ اس کے لئے میں اپنے قاری سے معذرت ہی کر سکتا ہوں ۔ میں محترمہ بیگم معین ہدایت اللہ کا شکر گزار ہوں جو کراچی کی ایک شاعرہ اور مصنفہ ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کے مسودے کو پڑھا اور اس میں ٹائپ کی غلطیاں درست کیں ۔ میں اپنی بیٹیوں یاسمین ، نسرین ، پروین اور روبی مری کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے کتاب کے مسودے پر بار بار نظر ثانی کی اور قیمتی تجاویز سے نوازا جناب ظہیر سلام ڈائریکٹر فیروز سنز اور کراچی برانچ کی مینجر مسز گل افشاں بھی میرے سپاس کی مستحق ہیں کہ انہوں نے میری اس کتاب کو ہندو پاک کے قدیم ترین اور عظیم ترین پبلشنگ ہاؤس --- فیروز سنز لاہور سے چھپوانے اور شائع کرانے میں سخت محنت سے کام لیا ۔ میں اپنی اہلیہ مسز ایلس مری کا بھی تہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب پر کام کے دوران میری حوصلہ افزائی کی ۔

جسٹس (ریٹائرڈ) میر خدا بخش بجارانی مری بلوچ
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی بار ایٹ لاء (لنکن ان لندن)
سابق چیف جسٹس گورنر و وزیر اعلیٰ بلوچستان
۲ جیل روڈ کوئٹہ بلوچستان
12۔ بی تیسرا سنٹر لین ڈیفنس سوسائٹی کراچی

Marfat.com

باب اول

ملٹری ازم اور عدالتی انجینئرنگ
(آئین سازی کے چالیس سال)

پاکستان ' قانون آزادی ہند مجریہ 1947ء کے تحت 14 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آیا ۔ قانون آزادی ہند کے تحت حکومت پاکستان اس وقت تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء کی دفعات کے تحت کام کرتی رہی تا آنکہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ملک کا آئین تیار کر لیا ۔ اس وقت تک قانون سازی کا سارا کام وفاقی اسمبلی کو کرنا تھا اور ملک کا سربراہ گورنر جنرل کہلاتا تھا ۔ سات سال کی تاخیر اور طویل و عریض بحث ' مباحثہ کے بعد بالاخر دستور ساز اسمبلی نے دستوری تجاویز تیار کرلیں اور ان کی منظوری دی ۔

گورنر جنرل ملک غلام محمد آئین کے نفاذ اور اس کے تحت ہونے والے عام انتخابات سے خوفزدہ تھے کیونکہ انتخابات میں شکست انہیں صاف نظر آ رہی تھی ۔ چنانچہ انہوں نے بعض سیاست دانوں اور بیوروکریسی کے ساتھ سازش اور گٹھ جوڑ کے بعد 24 اکتوبر 1954ء کو دستور ساز اسمبلی توڑ دی اور اس کے لئے یہ بہانہ بنایا کہ " اسمبلی اپنا نمائندہ کردار کھو چکی ہے " اس طرح ملک غلام محمد نے ملک کے پہلے آئین کو ' قانون کا درجہ حاصل ہونے سے قبل ہی ' موت کے گھاٹ اتار دیا ۔

اگر کوئی شخص اس دور کے " قومی اخبارات " کی شہ سرخیوں کا ملاحظہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ سدا بہار مفاد پرست خوشامدیوں ' جن میں تاجر اور سیاستدان بھی شامل تھے ' کے ایک گروہ نے گورنر جنرل کو دستور ساز اسمبلی کو توڑنے پر "محافظ ملت" کا خطاب تک دے دیا اور انہیں خطابات سے لاد دیا ۔ مجھے آج بھی اس غم و اندوہ اور ذہنی کرب کا احساس ہے جو مجھے گورنر جنرل کی وہ تصاویر کراچی کے انگریزی اخبار " ڈان " کے پہلے صفحے پر دیکھنے پر ہوا جس میں انہیں ہار پہنائے جارہے تھے اور ان کا استقبال کیا جا رہا تھا ۔ یہ تصاویر تاجروں کی اس نام نہاد کمیٹی کے ایک تاجر

Marfat.com

رکن نے دکھائی تھیں جس نے ملک غلام محمد کو " محافظ ملت " کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس وقت میں انگلستان میں قانون کا ایک طالب علم تھا۔ میں نے بعض دوسرے ساتھی طلبا کی مدد سے اس تاجر کو جو اپنے اس کارنامے پر لاف زن تھا۔ کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر ہم ناکام رہے کیونکہ وہ تو انگلستان سے ایک اور ٹیکسٹائل ملز کی مشینری خریدنے کا پرمٹ لے کر آیا ہوا تھا۔ محض دلائل کسی قوم کو ذہنی اور جسمانی غلامی سے نجات نہیں دلا سکتے۔ پاکستان میں آئین سازی پر یہ پہلا مہلک وار تھا۔ چند ایک سیاستدانوں کے سوا ' عدلیہ ' فوج یا سول انتظامیہ میں سے کسی نے بھی اس اقدام کے عواقب و نتائج پر کوئی زیادہ غور و فکر کی ضرورت محسوس نہ کی۔ دستور ساز اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین خاں کی کسی سیاسی تنظیم نے حمایت نہ کی۔چنانچہ ان کے لئے عدالت سے رجوع کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا اور انہوں نے سندھ چیف کورٹ میں گورنر جنرل کے اس حکم کو چیلنج کر دیا جس کے تحت دستور ساز اسمبلی کو ختم کیا گیا تھا عدالت نے 9 اکتوبر 1955 کو فیصلہ (پی ایل ڈی 1955ء سندھ 96) سنایا اور قرار دیا کہ دستور ساز اسمبلی ' جب دستور سازی کر رہی ہو تو اس کے منظور شدہ قوانین کو گورنر جنرل کی توثیق کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ وفاقی قانون ساز اسمبلی کے طور پر قانون سازی کے لئے ہوتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ رٹ درخواست میں دفعہ 223 الف کے جواز کو چیلنج کیا گیا تھا کیونکہ گورنر جنرل سے اس دفعہ کی منظوری نہیں لی گئی تھی۔

وفاقی حکومت نے وفاقی عدالت میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل (آئینی سول اپیل نمبر ایک 1955ء) دائر کر دی۔ اس اپیل کی سماعت فل بنچ نے کی جس کے سربراہ چیف جسٹس محمد منیر تھے۔ ان کے ساتھ بنچ میں مسٹر جسٹس اکرم جسٹس کارنیلس جسٹس محمد شریف اور جسٹس رحمان تھے۔ (پی ایل ڈی 1955 وفاقی عدالت 240) عدالت نے فیصلہ دیا (جسٹس کارنیلس نے اختلافی نوٹ لکھا) کہ سندھ چیف کورٹ کو یہ اپیل سننے کا اختیار ہی نہ تھا کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ 223 الف کو (ترمیمی ایکٹ 1954ء) جس کے تحت یہ دفعہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں شامل کی گئی تھی ' گورنر جنرل کی منظوری حاصل نہ تھی۔ آئینی اور قانونی حدود جو

Marfat.com

بھی رہی ہوں ' وفاقی عدالت کے اس فیصلے سے گویا " پنڈورا بکس " کھل گیا ۔ اس سے مستقبل کی عدالتوں میں الفاظ کی جنگ شروع ہو گئی جو بد قسمتی سے آج تک جاری ہے ۔ اور اس میں ماضی کا جواز اور عدم جواز زیر بحث ہے ۔ پھر یکے بعد دیگرے مارشل لاء آئے اور ملک پر فوج کی حکومت قائم ہوتی رہی ۔ چونکہ اس فیصلہ سے دستور ساز اسمبلی 1950ء کے بطور قانون ساز اسمبلی بنائے ہوئے متعدد قوانین کالعدم ہو گئے ' گورنر جنرل نے یہ آئینی خلا پر کرنے کے لئے یک طرفہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء کی دفعہ 42 کے تحت " ہنگامی آرڈی نینس نمبر 9 1955ء " جاری کیا اور اسے موثر بہ ماضی قرار دیتے ہوئے دستور ساز اسمبلی کے تیار کردہ قوانین پر اپنی توثیق ثبت کر دی ۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ نہایت افسوسناک عدالتی اور انتظامی (ہیرا پھیری) تھی جو پاکستان کے عوام کے ساتھ روا رکھی گئی اگر قانونی ہیرا پھیری سے گریز کیا جاتا تو ہماری موجودہ نہ ختم ہونی والی آئینی دعویٰ بازی اور یکے بعد دیگرے مارشل لاء کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی۔ مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا کیونکہ آئینی نکات کی سادہ تشریح کے اصول پر عمل نہ کیا گیا۔ محولہ بالا عدالتی فیصلہ کے فوراً بعد اکبر خان بنام حکومت اور یوسف پٹیل بنام حکومت کے مقدمات (پی ایل ڈی 1955ء وفاقی عدالت 387) سامنے آئے جن میں آرڈی نینس 9 مجریہ 1955ء کے جواز کو چیلنج کیا گیا تھا اس کے بعد گورنر جنرل نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ 213 کے تحت سپیشل ریفرنس نمبر ایک 1955ء وفاقی عدالت میں پیش کیا ۔

اس ریفرنس میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ آیا گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی کو توڑ کر صحیح اقدام کیا ہے یا نہیں عدالت نے اس کا جواب دیا:۔ " ان خصوصی حالات میں ' جن کا ذکر ریفرنس میں کیا گیا ہے ' گورنر جنرل کو اسمبلی توڑنے کا اختیار حاصل ہے اور عبوری عرصہ کے دوران بھی اسے (گورنر جنرل) ایسا اختیار حاصل ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ سکے ۔ اور یہ کہ گورنر کو ' عبوری عرصہ کے دوران " عام سول قانون یا مملکتی نظریہ ضرورت " کے تحت یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ان قوانین کو موثر بہ ماضی منظوری دے سکے جن کا ذکر ہنگامی آرڈی نینس مجریہ 1955ء کے

Marfat.com

شیڈول میں کیا گیا ہے۔" ذرا " فرمان " ' " قوانین کی موثر بہ ماضی منظوری " " مملکتی نظریہ ضرورت " اور " خصوصی حالات " کے الفاظ کے افسوسناک استعمال پر غور کیجئے جن کے منحوس سائے آج تک ہماری آئینی تاریخ پر منڈلا رہے ہیں۔

اس موقع پر چیف جسٹس منیر نے بڑے دکھ کے ساتھ قرار دیا۔

" ہم ایک عمیق غار کے دھانے پر پہنچ چکے تھے اور ہمارے سامنے تین متبادل راستے تھے۔ ہم اسی راستے پر واپس چلے جاتے جس پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے تھے ۔ یا اس خلا کو ' غار کو قانونی پل کے ذریعے پر کرتے ' یا پھر اس عمیق غار میں گر جاتے جہاں سے بچ نکلنے کی کوئی امید نہ تھی "

نہ | وفاقی عدالت کے اس فیصلے کے کوئی پانچ سال بعد انہی چیف جسٹس صاحب نے اپنے 1955ء کے فیصلے کے بارے میں گویا اعتراف کیا کہ:۔

"ان مقدمات کی وجہ سے ججوں کو جس شدید ذہنی کرب سے گذرنا پڑا ' اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔۔۔۔ دنیا میں کسی جگہ بھی عدلیہ کو اس طرح کے کرب سے گزرنا نہیں پڑا ہو گا جسے "عدالتی اذیت" قرار دیا جاسکتا ہے۔۔۔۔ ملک میں انتشار اور افراتفری مچ جاتی۔۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مملکت کا "دباؤ" عدلیہ کے حق میں تھا اور گورنر جنرل کا ہتھیار نہیں تھا۔۔۔۔ ایسے مواقع پر قانون کتابوں میں نہیں ملتا بلکہ یہ کسی اور کے پاس ہے (یعنی گورنر جنرل) اس طرح ان واقعات میں مضمر ہوتا ہے جو روبہ عمل آچکے ہیں۔

میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ گورنر جنرل کے ریفرنس سے جو صورتحال پیدا ہوئی ' اس سے انہی قوانین کے تحت نمٹا جا سکتا تھا جو تمام مہذب ممالک کے عام قوانین کا حصہ ہیں اور جو ہر مہذب قوم کے تحریری آئین میں مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔۔ یعنی سول قوانین یا نظریہ مملکتی ضرورت (1955۔ 1۔ ایف سی ای 5۔474)

"سول ضرورت یا فوجی ضرورت کے قوانین' دونوں کی بنیاد ایک مشترکہ اصول پر ہے" یوں چیف جسٹس نے اپنا افسوسناک نظریہ ضرورت پیش کیا جو ایک نظیر بن گیا اور اس کے بعد سیاسی مہم جو اس پر تسلسل کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔

"غیر معمولی ہنگامی صورت حال کے دوران مملکت اور معاشرہ کے تحفظ اور آئین

Marfat.com

اور حکومت کو انتشار اور تباہی سے بچانے کے لئے سربراہ مملکت کو جو اختیارات حاصل ہیں ' مارشل لاء کے دوران فوج کے سپہ سالار کو ان سے مشابہ اختیارات ہی حاصل ہوتے ہیں"

"گورنر جنرل کو جس افتاد کاسامنا تھا' اور جو دستور ساز اسمبلی کے قانون سازی کے اختیار کے غلط استعمال سے پیدا ہوئی تھی ' مولوی تمیزالدین خان کیس اور یوسف پٹیل کیس کے نتائج سے ظاہر ہے جن کا ذکر ریفرنس میں کیا گیا ہے چنانچہ یہی کہا جائے گا کہ گورنر جنرل نے ایک متوقع سانحہ سے بچنے نیز حکومت اور معاشرہ کو مکمل تباہی سے بچانے کے لئے ہی یہ اقدام کیا ہو گا گورنر جنرل کا 16 اپریل 1955ء کا فرمان ہے کہ ہنگامی آرڈی نینس 1955ء کے شیڈول میں متذکرہ قوانین موثر بہ ماضی ہوں گے 'عبوری عرصہ میں اس وقت تک جائز متصور ہوں گے ۔ تاکہ نئی دستور ساز اسمبلی ان کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہ کر دے ۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ چونکہ عبوری عرصہ کے دوران ان قوانین کے جواز کی بنیاد " ضرورت " ہے لہٰذا دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے میں کوئی تاخیر نہیں کی جانی چاہئے۔

جسٹس کارنیلس اور جسٹس محمد شریف نے ایک اقلیتی فیصلہ بھی دیا ۔ ان دونوں جج صاحبان نے قرار دیا کہ سول ضرورت کا عمومی قانون ایسے معاملات تک محدود رہتا ہے جہاں جنگ یا دوسری قومی ابتلا کی صورت میں انتظامیہ شہریوں کے نجی حقوق میں مداخلت کر سکتی ہے لیکن یہ اختیار آئینی قانون میں تبدیلی تک کبھی محیط نہیں ہوا ۔ اور اکثریتی فیصلہ میں قانون کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے اس کا تعلق کلی اور غیر متنازعہ شاہی اختیارات کے عرصہ سے ہے" جسٹس کارنیلس نے موخر الذکر کے بارے میں کہا۔

"ان معاملات کا ریکارڈ بمشکل اس قابل ہے کہ اس کا حوالہ کسی ایسی کارروائی میں دیا جا سکے جو نمائندہ اداروں کے قیام و نفاذ کے ضمن میں ناگزیر ہو"
(1955 ایف سی آر 554 اور 560)

آئینی بل کو فروری 1956ء کے آخری ہفتہ میں منظور کر لیا گیا ۔ گورنر جنرل

Marfat.com

اسکندر مرزا نے یہ اہتمام کیا کہ وہ صدر مملکت ہوں' 2 مارچ 1956ء کو اس کی توثیق کی اور "اسلامی جمہوریہ پاکستان 23 مارچ 1956ء کو "پیریٹی اورون یونٹ" کے نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ لیکن 1956ء کے آئین کے تحت عام انتخابات کبھی نہ ہو پائے۔ اکتوبر 1958ء میں صدر اسکندر مرزا نے تمام اختیارات خود سنبھال لیئے آئین منسوخ کردیا۔ پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں برطرف کر دیں۔ جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈ مسٹریٹر مقرر کردیا اور اعلان کیا کہ آئین خطرناک مصالح سے بھرا ہوا ہے۔ جن سے پاکستان اندرونی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔۔۔۔۔ ملک میں پہلے ہوشمندی کا دور دورہ ہونا چاہئے' اس کے بعد میں ایک ایسا آئین وضع کروں گا جو پاکستان کے مسلم عوام کی سوجھ بوجھ کے مطابق ہو۔

10 اکتوبر 1958ء کو صدر نے (قوانین کے نفاذ کے دوام کا) حکم جاری کیا جس کے تحت قرار دیا گیا کہ اب جمہوریہ کو "پاکستان" کہا جائے گا' ملک پر ممکن حد تک آئین کے مطابق حکومت کی جائے گی۔۔۔ تمام عدالتیں (مارشل لاء ریگولیشنز' آرڈرز کے مطابق) اپنے اختیارات کے مطابق کام جاری رکھیں گی۔ تمام مارشل لاء ریگولیشنز اور آرڈرز کو بھی قانونی حیثیت حاصل ہو گی۔ چونکہ بعد میں آنے والے سالوں کے دوران آج تک ملک کی آئینی تاریخ کا یہی انداز رہا ہے لہٰذا اس کا بار بار ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

13 اور 19 اکتوبر 1958ء کو سپریم کورٹ میں آئینی فوجداری اپیلوں پر بحث ہوئی۔ ان میں اولین اپیل حکومت کی تھی جو ایک شخص کے خلاف دائر کی گئی تھی۔ ان اپیلوں میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ آیا ہائی کورٹ کی جاری کردہ رٹ (حکم) قوانین کے نفاذ کے دوام کے حکم مجریہ 10 اکتوبر 1958ء کے آرٹیکل 1 کی دفعہ 7 کے تحت "ساقط" ہو جاتی ہے۔ ان اپیلوں پر 27 اکتوبر 1988ء کو فیصلہ سنایا گیا۔

چیف جسٹس منیر نے نظریاتی مفروضوں پر بحث کے بعد قرار دیا۔

اثبات قانون کا ایک بنیادی نظریہ' جس پر اصول قانون کی عمارت کھڑی ہے' ایک ماہر قانون سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تاریخی اعتبار سے اس پہلے آئین کے

Marfat.com

جواز پر غور کرے اور یہ دیکھے کہ آیا یہ آئین کسی ایسے شخص نے دیا ہے جس نے اندرونی طور پر اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے' یا کسی بیرونی حملہ آور کی دین ہے یا کسی قومی ہیرو کی عطا ہے یا اسے کسی عوامی یا دوسری نوع کی اسمبلی نے تیار کیا ہے۔ آئین میں بعد ازاں کی جانے والی ترامیم اور ان کے تحت تیار کئے جانے والے قوانین کا جواز بھی پہلے آئین کے تحت ہی متعین کیا جا سکتا ہے جہاں ایک آئین یوں تسلسل سے نافذ ہو' کوئی قانون جو ایک بار بن چکے' اس وقت تک نافذ ہی متصور ہو گا جب تک آئین کے مطابق اس میں تبدیلی نہ کر دی جائے' یا اس میں ترمیم کر دی جائے یا اسے ختم نہ کر دیا جائے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آئین یا اس کے تحت قومی نظام قانون کسی اچانک سیاسی تبدیلی کے باعث جو اس آئین کے تصور کے مطابق نہیں ہوتی' تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی سیاسی تبدیلی "انقلاب" کہلاتی ہے اور اس کے قانونی اثرات یہ ہوتے ہیں کہ نہ صرف اس وقت موجود آئین تباہ ہو جاتا ہے بلکہ قومی نظام قانون کا جواز ہی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اگر یہ درست ہے تو انقلاب کامیابی کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنی اہلیت (بطور قانون) ثابت کر دیتا ہے بلکہ وہ قانون کا منبع بھی بن جاتا ہے۔ اسی مفروضہ کے مطابق "قوانین کے نفاذ کے دوام کا حکم" خواہ یہ عبوری اور کتنا ہی غیر مکمل کیوں نہ ہو' نیا قانونی نظام ہے اور اسی قانونی نظام کے تحت ہی قوانین کے جواز اور عدالتوں کے فیصلوں کی حقانیت کا تعین کیا جائے گا چنانچہ نئے قانونی نظام کے تحت صدر مملکت کسی بھی قانون کو کسی وقت بھی تبدیل کر سکتا ہے اور قانون سازی میں صدر کے اختیارات پر کوئی قدغن نہیں ہوگی۔ فرنٹیر کرائمز ریگولیشن (جس کے بارے میں ہائی کورٹ نے رٹ جاری کی) کو عدالت عالیہ نے اس بنیاد پر کالعدم قرار دیا ہے کہ یہ آئین کے آرٹیکل 5 کے منافی ہے لیکن آئین کا یہ آرٹیکل' چونکہ نئے قانونی نظام کے تحت' خود بھی کالعدم ہو چکا ہے لہٰذا وہ ریگولیشن آرٹیکل 4 کے مطابق اب بھی نافذ العمل ہے اور ان تمام مقدمات کی کارروائی' جن میں اس ریگولیشن کے جواز کو چیلنج کیا گیا ہے' ساقط ہو جاتی ہے چنانچہ ریگولیشن کے تحت دی گئی سزائیں

Marfat.com

درست ہیں۔ باقی تین ججوں جسٹس شہاب الدین جسٹس امیرالدین اور جسٹس کارنیلس نے چیف جسٹس کے اخذ کردہ نتائج سے اتفاق کیا اس طرح (دو سو) کیس کا فیصلہ 27 اکتوبر 1958ء کو سنایا گیا۔

اسی شام (27 اکتوبر 1958ء) تین جرنیلوں (لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان' لیفٹیننٹ جنرل ڈبلیو۔ اے۔ برکی اور لیفٹیننٹ جنرل کے ایم شیخ) نے جو کابینہ کے رکن بھی تھے صدر اسکندر مرزا سے ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ وہ جنرل محمد ایوب خان کے حق میں صدارت سے دستبردار ہو جائیں۔ صدر مرزا فوراً اس پر آمادہ ہو گئے اور جنرل ایوب خان ملک کے صدر بن گئے۔

یوں جسٹس منیر کا یہ فیصلہ جو انہوں نے ڈوسو کیس میں دیا ایک نظیر بن گئی' جسے بدقسمتی سے ملک میں اکثر و بیشتر روبہ عمل لایا گیا چنانچہ کامیاب "انقلاب" اقتدار پر قبضہ اور آئین میں تبدیلی کا مسلمہ طریقہ طے پایا اور ایسا کرنے والوں کے لئے کوئی سزا' کوئی مکافات عمل بھی نہیں!!

ایک مغربی مصنف مسٹر ہربرٹ فیلڈ مین نے ڈو سو کیس کے فیصلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا "یہ بات بھی' البتہ' بعید از قیاس ہے کہ اگر سپریم کورٹ فرد واحد کی طرح بھی احتجاج اور مخالفت میں اٹھ کھڑی ہوتی تو اس سے ان تبدیلیوں پر جو وقوع پذیر ہو چکی تھیں' معمولی سا بھی اثر ہوتا"

بلاشبہ مسٹر فیلڈ مین درست کہتے ہیں۔ اگر سپریم کورٹ فرد واحد کی طرح احتجاج کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی اور اس کی مخالفت کرتی تو بھی عملاً صورت حال پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر سپریم کورٹ گورنر جنرل کے من مانے حکم کے خلاف فیصلہ دیتی تو اخلاقی اور آئینی سطح پر اس کے زبردست اثرات رونما ہوتے۔ اس سے رائے عامہ بیدار ہوتی اور ملک کے عوام کی نظروں میں عدلیہ کا وقار بڑھ جاتا ممکن ہے ایسا کرنے میں بعض خطرات کا سامنا کرنا پڑتا مثلاً ججوں کو برطرف کیا جاسکتا تھا یا جبری ریٹائر کر کے گھر بھیجا جا سکتا تھا اور زیادہ سے زیادہ نظربند کیا جا سکتا تھا لیکن ایسے خطرات کے باوجود بعض ججوں نے یہ خطرہ مول لیا۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو اندرونی صعوبتوں سے بچانے کے لئے بعض اقدامات کئے قانون کی حکمرانی کا علم بلند

Marfat.com

رکھا اور اپنا وقار بلند کیا۔ بہت سے ممالک کی قانونی تاریخ ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بادشاہ وقت نے ان کو بغداد کا قاضی القضاۃ مقرر کرنے کی پیشکش کی مگر امام صاحب نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔ سلطان نے حکم دیا کہ امام کو اس وقت تک پیٹا جائے جب تک وہ بغداد کا قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول نہ کرلیں۔ امام نے تشدد برداشت کیا مگر سلطان کی پیشکش قبول نہ کی کیونکہ امام ابو حنیفہؒ کی یہ سوچی سمجھی رائے تھی کہ ملک جن سیاسی و معاشرتی حالات سے گذر رہا تھا ان حالات میں وہ شریعت کے مطابق عدل نہیں کر سکتے تھے۔ صد افسوس کہ ہمارے ہاں پاکستان میں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔

یہ ماضی بعید کا قصہ نہیں ہے کہ سرتھامس مور انگلستان کے چانسلر یعنی قاضی القضاۃ تھے وہ شاہ ہنری ہشتم کے گہرے دوست بھی تھے۔ شاہ نے انہیں ملک کے اعلیٰ ترین عدالتی منصب پر فائز کیا تھا یہ 1535ء کا ذکر ہے کہ سرتھامس مور نے ملکہ این، جو ایک فاحشہ عورت تھی، کی رسم تاجپوشی میں شرکت سے انکار کر دیا۔ انہوں نے "شاہی خاندان کی بالادستی" کا حلف اٹھانے سے بھی معذوری ظاہر کر دی حالانکہ انگلستان کے چرچ یعنی مذہبی رہنماؤں نے اس شاہی حکم کو تسلیم کر لیا تھا اور بجائے پاپائے اعظم کے شاہی خاندان کی بالادستی کا حلف اٹھا لیا تھا۔ سرتھامس مور نے شاہی حکم اور حلف اٹھانے سے انکار یہ جانتے بوجھتے ہوئے کیا تھا کہ اس سے نہ صرف ان کا روزگار چھن جائے گا، انہیں مالی نقصان ہو گا اور وہ چھوٹی یا بڑی شاہی مراعات سے محروم ہو جائیں گے، بلکہ انہیں جان سے جانے کا بھی خطرہ لاحق تھا۔ اس کے باوجود اس عظیم انسان نے حق و صداقت کی راہ نہ چھوڑی۔ انہوں نے اس جھوٹے اور بے بنیاد مقدمہ کا بھی بڑی ہی جرات اور پامردی سے مقابلہ کیا۔ ان کے خلاف بغاوت کا الزام عاید کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے خلاف استغاثہ اس قدر کمزور اور ان کی صفائی اتنی مضبوط اور دو ٹوک تھی کہ مقدمہ میں ان کی بریت یقینی تصور کی جا رہی تھی یہاں تک کہ مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک وکیل مسٹر رچ جو شاہی وکیل تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور گواہ کے کٹہرے میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے جھوٹا حلف اٹھا کر بیان دیا کہ سرتھامس مور نے وہ الفاظ کہے تھے جن کی بنا پر ان پر بغاوت کا الزام صادق آتا

Marfat.com

ہے۔ سرتھامس مور نے پروقار انداز میں نہایت سکون کے ساتھ صرف اتنا کہا "مسٹر رچ' حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنی زندگی کا لاحق خطرات سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ آپ نے جھوٹی قسم کھائی ہے۔" سرتھامس مور کو موت کی سزا سنائی گئی۔ جب ان کا سر قلم کرنے کے لئے مخصوص جگہ پر ٹکایا گیا تو انہوں نے اپنا وہ تاریخی جملہ کہا جسے ان کی تمام باتوں سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ سرتھامس مور نے کہا "ٹھہرو' مجھے اپنی داڑھی کو سنوارنے دو کیونکہ میری ڈاڑھی نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

کیا ہم نے اپنے اندر کوئی ابو حنیفہؒ کوئی تھامس مور یا ان کا کوئی مثیل پیدا کیا ہے جس نے حق و صداقت پر مبنی اصولوں کا بول بالا کیا ہو؟ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس کے برعکس ہم نے مسٹر رچ جیسے کئی دوروغ گو پیدا کئے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ رچ بادشاہ کا سولسٹر جنرل تھا۔ بعد میں مسٹر رچ کے ساتھ اس کی زندگی میں کیا ہوا' اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن اس ملک کے رچ صاحبان تو خوب پھلے پھولے پاکستان کے غریب عوام کی قیمت پر انہوں نے خوب خوب ترقی کی اور خوشحالی سے ہمکنار ہوئے اور ہو رہے ہیں اگر سرتھامس مور پر بغاوت کا جھوٹا مقدمہ نہ چلا ہوتا تو مسٹر رچ جو آج بھی بدنامی کا داغ لیئے ہوئے ہیں۔ تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے ہوتے۔ لیکن ہمارے ملک میں رچ صاحبان کو بد دل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس ملک کی سیاسی اور آئینی تاریخ ان "راسپوٹینوں" کو ہمیشہ کے لئے یاد رکھے گی۔

جنرل ایوب خان' جو بعد میں فیلڈ مارشل ایوب خان بنے' کا دس سالہ دور حکومت سرکاری طور پر "ترقی کی دہائی" قرار دیا گیا مگر عوام نے بجا طور پر اسے "زوال کی دہائی" قرار دیا۔ اس دور حکومت میں' جیسا کہ ہر فوجی آمریت کے دور میں ہوا کرتا ہے' عوام کو سیاسی رائے اور اداروں سے محروم کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنے مخالفوں کو ترغیب و تحریص، میں مبتلا کیا۔ انہیں پوری طرح بد عنواں بنایا۔ یا پھر وحشیانہ قوت کے ذریعے ان کی آواز اس حد تک دبا دی کہ اب ملک میں صرف جنرل صاحب کی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ انہوں نے دنیا کے ہر موضوع پر اس طرح بلند آہنگ میں بات کی گویا وہ ہر علم پر حاوی ہیں۔ جب تک وہ نفع پہنچاتے رہے ان کے پالتو ان کی

Marfat.com

پالیسی کے ہر موڑ کو' ہر خامی کو صحیح قرار دیتے اور اس کا جواز پیش کرتے رہے۔ انہوں نے ایوب حکومت کے جواز کے سوال کو سرے سے ہی نظر انداز کئے رکھا۔ انہوں نے رائے عامہ کے بتدریج بڑھتے ہوئے دباؤ کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اچانک صدر ایوب خان نے خود کو چاروں طرف سے گھرا ہوا پایا۔ ان پر ہر طرف سے لعن طعن ہو رہی تھی۔ وہ پیش قدمی کی قوت سے محروم ہو گئے۔ ان کے پاؤں جکڑے گئے جیسا کہ ہر فوجی حکمران کا مقدر ہوتا ہے۔

24 مارچ 1969ء کو صدر ایوب خان نے فوج کے کمانڈر انچیف جنرل یحیٰ خان کو تحریری طور پر اطلاع دی کہ وہ صدارت کے عہدے سے مستعفی ہونا اور ملک کی باگ ڈور مسلح افواج کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملک میں سول انتظامیہ اور آئینی اتھارٹی غیر موثر ہو کر رہ گئی ہے۔۔۔۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں حکومت سے الگ ہو جاؤں اور مسلح افواج' جو اس وقت واحد قانونی اور موثر اتھارٹی ہیں' ملک کا نظم و نسق سنبھال لیں۔۔۔۔ صرف مسلح افواج ہی عوام کے پاگل پن کو ختم کر کے ملک میں ہوش و خرد بحال کر سکتی ہیں اور سول و آئینی انداز میں ملک کو دوبارہ ترقی کی راہ پر ڈال سکتی ہیں؟۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ 7 اکتوبر 1958ء کو جب آئین منسوخ کیا گیا' اس اقدام کا ایک یہ جواز بھی پیش کیا گیا تھا کہ "پہلے ملک میں پرامن انقلاب کے ذریعے ہوشمندی بحال کی جانی چاہئے" اور اب دس سال کے طویل عرصہ کے بعد ایک آمر نے' جس نے ملک کے سیاسی ڈھانچے اور مملکت کے ہر ادارے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے جرم کا ارتکاب کیا تھا' اپنا ہی بنایا ہوا 1962ء کا آئین ضمیر کی معمولی سی چبھن محسوس کئے بغیر منسوخ کر دیا۔ وہ اب پھر کہہ رہا تھا "صرف فوج ہی ملک میں ہوش و خرد کو بحال کر سکتی ہے" کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایوب خان نے 1958ء میں جب ملک میں اقتدار پر قبضہ کیا تو اس نے دیکھا کہ ملک ہوش و خرد سے عاری ہے۔ ملک سے ان کی مراد یقیناً پاکستان کے عوام تھے اور دس سال کی آمریت کے بعد اور اس دوران انہوں نے' ان کے حواریوں نے جو کچھ کیا' جب وہ بے بس

Marfat.com

ہو گئے اور انہیں اقتدار سے مجبوراً دستبردار ہونا پڑا تو انہوں نے دیکھا کہ پاکستان کے عوام ' تو اب تک عقل و دانش سے عاری ہیں ۔ معمولی سی عقل رکھنے والا شخص بھی یہ جان سکتا ہے کہ ایک فوجی آمر اور اس کے مٹھی بھر خوشامدی عقل و دانش سے محروم تھے یا پاکستان کے کروڑوں عوام ؟ میں اس کا فیصلہ قارئیں پر چھوڑتا ہوں۔

اب جنرل یحیٰ خان اکھاڑے میں اترے۔ دیکھئے اب بھی ملک اور ملک کے عوام وہی ہیں ہاں ان پر دس سال تک غیر انسانی آمریت ضرور مسلط رہی ہے ۔ بدبختی کا یہ دن 25 مارچ 1969ء ہے جب ملک پر از سر نو مارشل لاء مسلط کر دیا گیا یحیٰ خان راتوں رات فوج کے سپریم کمانڈر' چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت بن گئے۔ 26 مارچ کو انہوں نے پاکستان کے مجبور و بے کس عوام سے ریڈیو پر خطاب کیا۔

"مسلح افواج ملک پر طاری انارکی کو خاموش تماشائی بن کر نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ انہیں اپنا فرض ادا کرنا تھا اور ملک کو مکمل تباہی سے بچانے کے لئے کارروائی کرنا ہی تھی۔۔۔ میری اس کے سوا کوئی خواہش' کوئی مقصد نہیں کہ ملک میں ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن میں آئینی حکومت کا قیام ممکن ہو"

31 مارچ کو یحیٰ خان نے اعلان کیا کہ انہوں نے صدر مملکت کا عہدہ سنبھال لیا ہے تاکہ بعض عمومی ذمہ داریاں آسانی کے ساتھ انجام پا سکیں۔ جونہی عوام کے نمائندے نیا آئین بنائیں گے۔ وہ صدر کے منصب سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ انہوں نے جلد ہی "عبوری آئین کا حکم" مجریہ 1969ء جاری کر دیا۔ یہ حکم پرانا ہی تھا اور اسے ایوب خان کے مارشل لاء کے نفاذ کے حکم سے ہی اخذ کیا گیا تھا کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ "تمام سڑکیں روم کو ہی جاتی ہیں" اس حکم کا انشاء یہ تھا کہ تمام اختیارات یحیٰ خان کی ذات میں ہی مرکوز ہیں۔ کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں کہ بارہ سال بعد ایک اور "عبوری آئین کا حکم مجریہ 1981ء جواب عوام میں پی سی او 1981ء کے نام سے معروف ہے' چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر و صدر جنرل ضیاء الحق نے جاری کیا جو آج بھی کئی ترامیم کے ساتھ جو 1985ء میں کی گئیں' نافذ العمل ہے۔ ہاں اس میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ اس حکم کے ذریعے عدلیہ کا وقار اور مسلمہ اختیارات

Marfat.com

بھی کم کر دیئے گئے۔ اور اب اسے ملک کے چیف ایگزیکٹو کا تابع مہمل بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ دنیا کے تمام مہذب ممالک میں عدلیہ کو جو تحفظ اور ضمانت حاصل ہوتی ہے جو 1973ء کے آئین میں بھی موجود ہے' اس حکم کے ذریعے ختم کر دی گئی ہے یہ بات باعث شرم و حیرت ہے کہ پاکستان کے موجودہ آئینی ڈھانچہ میں عدلیہ کو جو وقار' تحفظ اور اختیارات حاصل ہیں' وہ اس وقار' تحفظ اور اختیارات سے کہیں کم ہیں جو عدلیہ کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت حاصل تھے۔ اگر کوئی ترقی ہوئی ہے تو وہ ترقی معکوس ہے۔ یحیٰ خان کے دور میں ملک و قوم کو جو نقصانات اٹھانے پڑے ان کی فہرست بڑی طویل اور تکلیف دہ ہے۔ پاکستان کی فوج کو شیخ مجیب الرحمان کی مکتی باہنی اور بھارتی فوج نے شکست دے دی۔ بھارت نے 90 ہزار پاکستانی فوجیوں کو جنگی قیدی بنا لیا۔ سابق مشرقی پاکستان خوفناک اور لرزہ خیز خونریزی کے بعد الگ ہو کر ایک آزاد ملک بنگلہ دیش بن گیا۔ ان سب المیوں کے باوجود یحیٰ خان نے 28 مارچ 1971ء کو اپنی نشری تقریر میں کہا۔

"ہم اقتدار کے بھوکے چند غیر محب وطن افراد کو اس ملک کو تباہ کرنے اور بارہ کروڑ افراد کی زندگیوں سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔۔۔۔ میں نے 6 مارچ کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے' آپ کو بتایا تھا کہ مسلح افواج کا فرض ہے کہ وہ ملک کا دفاع کریں اور ملک کی سلامتی اور یک جہتی کے تحفظ کو یقینی بنائیں۔ میں نے افواج پاکستان کو اپنا فرض ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور حکومت کی اتھارٹی مکمل طور پر بحال کرنے کو کہا ہے۔۔۔۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا سب سے بڑا مقصد اب بھی یہی ہے کہ عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کیا جائے جونہی حالات نے اجازت دی میں اس مقصد کے حصول کے لئے نئے اقدامات کروں گا۔

افسوس ! اس وقت کے حکمرانوں اور ان کے سربراہ یحی خان نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ وہ لوگوں کو بڑی بڑی امیدیں دلاتے رہے' ایسے وعدے کرتے رہے جو کبھی پورے نہ ہو سکے اور آدھا ملک جاتا دیکھ کر بھی وہ اقتدار سے چمٹے رہنے کی سعی کرتے رہے۔ اپنی 28 جون 1971ء کی نشری تقریر میں یحی خان نے عوام کو "مژدہ" سنایا۔

" موجودہ حالات میں میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں ماہرین کے

Marfat.com

ایک گروپ سے ایک نیا آئین تیار کراؤں۔۔۔۔ چونکہ قوم کو حال ہی میں ایک شدید جھٹکا برداشت کرنا پڑا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ابھی مزید ایک عرصہ کے لئے مارشل لاء کا "سہارا" حاصل رہے گا۔۔۔ جہاں تک ملک میں امن و امان کا تعلق ہے میں عسرت یہ اعلان کرتا ہوں کہ فوج کو مشرقی پاکستان میں صورت حال پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ اس نے شرپسندوں تخریب کاروں اور مداخلت کاروں کو کچل کر رکھ دیا ہے مجھے اپنے عوام کے جذبہ حب الوطنی پر پورا پورا اعتماد ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہرپاکستانی میرے ساتھ دلی تعاون کرے گا تاکہ ملک میں جمہوریت کی بحالی' ملک کی یکجہتی اور سالمیت کا تحفظ اور عام آدمی کی حالت کو بہتر بنانے کامقصد حاصل ہو سکے خدا ہمیں ہماری جدوجہد میں کامیابی عطا کرے۔ خدا آپ کا محافظ ہو' خدا آپ پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔"

لیکن بظاہر اللہ تعالیٰ نے یحیٰ خان کی یہ دعا قبول نہ فرمائی مشرقی یا مغربی پاکستان کے عوام کے لئے ان کی دعائیں کسی کام نہ آسکیں اور کامیابی ہمارے دشمن بھارت کے حصہ میں آئی۔ یحیٰ خان نے پاکستان کے مایوس غمزدہ اور منقسم عوام کو ایک اور طویل' بے مغز نشری تقریر کا مکلف ٹھہرایا۔ انہوں نے کہا۔

"میرے پاس انتقال اقتدار کا اپنا منصوبہ ہے۔۔۔۔ آئین 20 دسمبر 1971ء کو شائع کردیا جائے گا اور 27 دسمبر کو قومی اسمبلی کا اعلان ہو گا۔۔۔۔ قومی اسمبلی کو آئین میں ترامیم تجویز کرنے کاموقع فراہم کیا جائے گا۔ مجوزہ ترامیم میرے حضور پیش کی جائیں گی۔ قومی اسمبلی کا اجلاس 27 دسمبر 1971ء کو بلایا جائے گا۔ جس کی صدارت ایوان کے معمر ترین رکن کریں گے جس کی نامزدگی میں ہی کروں گا اس کے بعد حلف برداری کی تقریب ہو گی۔"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آئین سازی کے ذریعے اپنی صدارت اور پانچ سالہ حکومت پکی کرنے کے بعد یحیٰ خاں نے ایک ہی سانس میں مزید کہا۔۔۔۔ "ہمیں کسی طور بھی اپنے بنیادی مقاصد' دفاع وطن' اور جمہوری طرز حیات کے حصول' سے انحراف نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس میں زبردست خطرات پنہاں ہیں۔ اگر ہم نے اپنے مقاصد سے انحراف کیا تو اس کی بھاری قیمت ادا کرنا ہو گی۔۔۔۔ آیئے پوری قوم فرد

Marfat.com

واحد کی طرح اٹھ کھڑی ہو اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پیش قدمی کرے۔ آیئے ہم دنیا کو دکھائیں کہ ہم پاکستانی کس مٹی سے بنے ہیں" میں (مصنف) یحی خان کے ان الفاظ پر تبصرہ کرنے سے خود کو قاصر پاتا ہوں کیونکہ میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں جن سے تبصرہ کا حق ادا ہو سکے۔

بھارت کے ساتھ چودہ روزہ جنگ کے تیزی سے بدلتے ہوئے واقعات سے بھی یحی خان اور ان کے خوشامدی ٹولہ نے کوئی سبق اس کے سوا نہ سیکھا کہ انہیں ہر قیمت پر اقتدار سے چمٹے رہنا ہے۔

جب مسٹر بھٹو مرحوم دسمبر 71ء کے پہلے ہفتے میں پاکستان کا استغاثہ اقوام متحدہ میں پیش کرنے کے لئے نیویارک گئے صدر یحیٰ خان اپنی نئی آئینی تجاویز کی تفصیل بیان کرتے رہے جن کے تحت وہ مزید پانچ سال کے لئے صدر مملکت اور کمانڈر انچیف کے عہدہ پر فائز رہ سکتے تھے انہیں اپنے وزراء پر بالادستی حاصل رہتی اور وہ جب چاہتے ملک میں مارشل لاء لگا سکتے سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض پانچ سال تک صدر اور کمانڈر انچیف کے عہدہ پر فائز رہنے میں کیا کشش تھی ۔ بھلا وہ عمر بھر کے لئے صدر اور کمانڈر انچیف کیوں نہ بن جاتے۔ یوں سب کے لئے راوی چین ہی چین لکھتا۔

16 دسمبر 1971ء کو ساڑھے آٹھ بجے شام صدر نے ایک نشری تقریر میں جنگ جاری رکھنے کے عزم کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ 20 دسمبر کو اپنا آئین نافذ کرنے اور نمائندہ حکومت کے قیام کے پروگرام پر بھی عمل پیرا رہے۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ 16 دسمبر 1971ء کے ہولناک اور تباہ کن دن کو بھی جب پاکستان کی افواج جنرل نیازی کی کمان میں بھارتی جرنیل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھیں اور پاکستان کی مشرقی کمان کے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز وجود میں آ چکی تھی۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یحیٰ خان جیسے آہنی اعصاب کا مالک کوئی شخص ہی محولہ بالا نشری تقریر کر سکتا تھا۔انہوں نے کہا "ایسی جنگ عظیم (جو صرف 14 دن جاری رہی) کے دوران کسی ایک محاذ پر پسپائی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی" اس کے بعد

Marfat.com

یحییٰ خان نے بڑے شکریہ کے ساتھ عوامی جمہوریہ چین اور امریکہ کی امداد کا ذکر کیا۔۔۔۔ مگر یہ امداد تھی کہاں؟

اسی شام مسز اندرا گاندھی کا ایک بیان نشر ہوا جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ انہوں نے اپنی مسلح افواج کو مغربی سرحدوں پر یک طرفہ جنگ بندی کا حکم دے دیا ہے جس پر 17 دسمبر کو 8 بجے رات سے عمل در آمد ہو گا۔ 17 دسمبر کو ساڑھے تین بجے شام یحی خان کا ایک بیان بھی ریڈیو پاکستان پر پڑھ کر سنایا گیا۔ جس میں انہوں نے بڑی وفاداری اور بزعم خویش بروقت' یہ اعلان کیا تھا کہ انہوں نے اسی شام کو ساڑھے سات بجے سے پاک فوج کو فائر بندی کا حکم دے دیا ہے ایسا کرتے وقت یحی خان یہ بالکل بھول گئے کہ صرف ایک دن قبل انہوں نے کیا فرمایا تھا۔ 16 دسمبر کو ہی انہوں نے اعلان کیا تھا کہ مغربی محاذ پر جنگ جاری رہے گی۔

یہی کہا جا سکتا ہے کہ صرف یحی خان جیسا کوئی اعلیٰ تربیت یافتہ شخص ہی اس طرح کی قلابازی کھا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا منشا کچھ اور تھا۔ 20 دسمبر 71ء کو جب یحی خان جیسا کہ پاکستان میں معمول ہی بن چکا ہے' اپنا یک نفری آئین نافذ کرنے والے تھے اور بطور صدر اپنی پانچ سالہ میعاد کا آغاز کرنے والے تھے۔ وہ معزول ہو چکے تھے' ان کی ہر طرف مذمت کی جا رہی تھی اور آنے والے کئی سالوں کے لئے گھر میں نظر بندی ان کا مقدر بن چکی تھی تاکہ وہ آرام کر سکیں۔ اور اپنے کئے پر غور و فکر کر سکیں۔ ذوالفقار علی بھٹو ملک کے صدر بن گئے ۔ بعد میں انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا جب عبوری آئین کا نفاذ عمل میں آیا اور مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کر دیا گیا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھٹو نے ایک اور فوجی انقلاب کے ذریعے ' مسلح افواج کی مدد سے' اقتدار سنبھالا ۔ بعض حلقوں میں مسٹر بھٹو کے سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہونے پر بڑی لے دے کی جاتی رہی ہے ' ایسا کرنے والے یہ حقیقت جان بوجھ کر فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ قومی اسمبلی میں مغربی پاکستان سے پارٹی کے باقاعدہ منتخب لیڈر تھے ۔ اور مشرقی پاکستان میں شکست کے بعد کوئی جرنیل چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت میں فرائض سنبھالنے کا خطرہ مول نہیں

S8921

Marfat.com

لے سکتا تھا۔ لہٰذا مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی سول ایڈمنسٹریشن کے تحت ہی پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت معرض وجود میں آئی اور پاکستان کو پہلا جمہوری آئین ملا جو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب ہونے والی اسمبلی نے تیار کیا تھا۔ اس آئین کے تحت پاکستان میں ایک وفاقی نظام حکومت قائم ہوا۔ چار صوبے اور ایک مضبوط مرکزی حکومت معرض وجود میں آئی۔ دو ایوانوں پر مشتمل پارلیمنٹ (آئین کا پارٹ 3۔5 آرٹیکل 59) قائم ہوئی اور ایک آزاد عدلیہ (پارٹ 3 آرٹیکل 179۔212) وجود میں آئی۔ آئین میں بنیادی حقوق کی ضمانت (پارٹ 2 آرٹیکل 8۔28) بھی دی گئی۔

نومبر 1971ء میں جب بنگلہ دیش کی جنگ کا آغاز ہوا۔ پاکستان میں ہنگامی حالت نافذ کی گئی جو پیپلز پارٹی کے پورے دور حکومت میں نافذ رہی۔ ہنگامی حالت سے بنیادی حقوق پر زد پڑی اور عوام کے یہ حقوق بڑی حد تک محدود کر دیئے گئے۔ ڈیفنس آف پاکستان کے رولز کے تحت جو ڈیفنس آف پاکستان آرڈی نینس مجریہ 1971ء کے تحت بنائے گئے تھے، اس پورے عرصے میں نافذ رہے جن کے تحت مقدمہ چلائے بغیر لوگوں کو نظربند رکھا گیا۔ انہیں خصوصی ٹربیونلوں میں سرسری سماعت کے بعد قید و بند کی سزائیں سنائی گئیں۔ سیاسی مخالفوں کے خلاف ڈیفنس آف پاکستان رولز کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ عام لوگوں اور قومی اسمبلی میں اپوزیشن نے اس پر بھرپور احتجاج کیا مگر بھٹو حکومت نے کسی کی نہ سنی۔

غلام محمد کی طرف سے دستور ساز اسمبلی کی غیر قانونی اور یک طرفہ برطرفی اور اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کا بھوت پاکستان پر اپنا تاریک سایہ ڈالے رہا۔ غلام محمد اور ان کے بعد آنے والی حکومتوں کے جواز کا اہم اور متنازعہ سوال عوام اور حکمران دونوں کے ذہنوں پر چھایا رہا اور چھایا ہوا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عاصمہ جیلانی کیس (پی ایل ڈی 1972 ایس سی 139) سابقہ حکومتوں کے عدم جواز کا گند صاف کرنے، مارشل لاء کے نفاذ کے سدباب اور ملک میں سول حکومت اور آئین کی تشکیل کی ایک کوشش تھی۔ سپریم کورٹ نے اس کیس کا فیصلہ 20 اپریل 1972ء کو کیا۔ مختصراً اس مقدمہ میں عدالت عالیہ کے سامنے سوال یہ تھا کہ عدالت عالیہ کو آئین 1962ء کے آرٹیکل 98 کے تحت "عدالتوں کے اختیارات (شکوک دور

Marfat.com

کرنے) کے حکم مجریہ 1969ء کی دفعات سے پیدا ہونے والی رکاوٹوں کے باوجود ' مارشل لاء ریگولیشن 78 مجریہ 1971ء کے تحت قیدی کی نظربندی کے جواز پر فیصلہ دینے کا اختیار حاصل ہے یا نہیں ؟" عدالت کے سامنے ایک اور سوال یہ تھا کہ آیا دوسو کیس میں جس نظریہ (نظریہ ضرورت) کا حوالہ دیا گیا ہے ' وہ قانون کے مطابق درست ہے ؟

مارچ 1969ء کے حوادث کے جواز پر غورو فکر کرتے ہوئے چیف جسٹس محودالرحمٰن نے لکھا :

"... یہ بالکل واضح ہے کہ 1962ء کے آئین کے تحت فیلڈ مارشل ایوب خان کو کسی اور کو اقتدار سپرد کرنے کا اختیار نہ تھا ۔ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو سکتے تھے ۔ہنگامی حالت کا اعلان کرسکتے تھے ..... اور حالت موجودہ میں اگر صورت حال سول انتظامیہ کے قابو میں نہ رہتی تو وہ ملک میں مارشل لاء کا نفاذ بھی کرسکتے تھے تا ہم یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ کوئی فوجی جرنیل کس اتھارٹی کے تحت مارشل لاء کا نفاذ کرسکتا ہے ۔ 1958ء میں بھی جب صدر مملکت نے مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان کیا تھا ۔ کسی فوجی جرنیل کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ آئین منسوخ کردے ۔ آغا محمد یحی خان کی طرف سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور بعد میں صدارتی منصب سنبھالنے کا اقدام غاصبانہ تھا لہٰذا غیر قانونی اور غیر آئینی تھا ۔اس غیر قانونی اور غیر آئینی حکومت کے تمام قانون اور انتظامی اقدامات محض "جواز" کی بنیاد پر جائز قرار نہیں دیئے جا سکتے مگر ایسے قوانین اور اقدامات جو نظریہ ضرورت کے تحت تحفظ یافتہ ہیں یعنی جو قانون اوراقدامات قوم کی بہبود کی خاطر بنائے اور اٹھائے گئے ہیں اور ملک کی انتظامیہ کو کسی رکاوٹ کے بغیر چلانے کے لیے ضروری ہیں ' جائز تصور کئے جا سکتے ہیں ۔ ..... مارشل لاء ریگولیشن 78 مجریہ 1971ء جس کے تحت ان دونوں افراد کو نظربند کیا گیا ہے ' غیر قانونی ہے اور اسے نظریہ ضرورت کا تحفظ نہیں دیا جا سکتا ۔ (پی ایل ڈی 1972ء ایس سی (183-204)

میں بڑے ادب کے ساتھ اس عمومی نکتہ چینی سے اتفاق کروں گا کہ جسٹس منیر نے نہ صرف " ہینس کالسن نظریہ " کا غلط اطلاق کیا بلکہ وہ اس مغالطہ میں بھی مبتلا

Marfat.com

ہوئے کہ یہ نظریہ جدید مسلم قانون میں مستعمل ہے ۔ کالسن کے تو حامی اور پیروکار بھی اس حد تک نہیں گئے جس حد تک کالسن چلا گیا تھا۔ " یحیٰ خان کی مارشل لاء انتظامیہ کو خلاف قانون اور بلا جواز قرار دینے کے بعد عدالت عالیہ کو اس امر پر غور کرنا تھا کہ آیا وہ اس انتظامیہ کے تحت روبہ عمل لائے جانے والے قانون سازی کے کسی اقدام کو جائز قرار دے سکتی ہے ۔ ایک ہزار نو سو پچپن مقدمات اور گورنر جنرل کے ریفرنس نمبر 1 مجریہ 1955ء کے حالات کو ذھن میں رکھتے ہوئے فاضل عدالت نے لکھا:۔ ؟

"..... میں اس بھاری ذمہ داری سے بخوبی آگاہ ہوں جو عدالتوں پر آ پڑی ہے ۔ عدالت کو کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہئے جو انتشار کو بڑھاوا دے ' حالات کو درہم برہم کردے یا حالات کی ابتری میں اضافہ کا موجب ہو ۔ عدالتوں کو یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ اپنے فرائض قانون کے منشاء کے مطابق ادا کرسکیں ممکن حد تک معاملات کو بگڑنے سے بچانے کی سعی کرنی چاہئے ....."

چیف جسٹس نے ان لوگوں کو شدید انتباہ بھی کیا جو مستقبل میں یحیٰ خان کی نقل کرتے ہوئے پاکستان کے قانونی نظام کو غصب کرنے کی کوشش کریں ۔

" ممکن ہے مملکت کی زبردست قوت پر قبضہ کرتے ہوئے ' عوام اور عدالتوں کی آواز عارضی طور پر دبا دی جائے لیکن یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ کوئی بھی غاصب اپنا جو بھی نظام قانون نافذ کرے گا ۔ وہ غیر قانونی ہو گا اور عدالتیں نہ تو اسے تسلیم کریں گی اور نہ ہی اس پر عمل درآمد کی پابند ہوں گی ۔ غاصب کے ہاتھ سے جونہی ریاست کی قوت نکل جائے تو اولین فرصت میں غاصب پر مملکت سے غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا جانا چاہئے اور اسے غداری کی مناسب سزا دی جانی چاہئے ۔ تاکہ مستقبل کے غاصبوں کے لیے ایک مثال قائم ہو اور ملک و قوم کی قسمت جواء بازی اور کھیل سے محفوظ رہے (پی ایل ڈی 1972ء ۔ ایس سی 3 ۔ 242) البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ عاصمہ جیلانی کیس کا فیصلہ 20 اپریل 1972ء کو سنایا گیا جو مارشل لاء انتظامیہ کا آخری دن تھا۔ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے اس انتظامیہ (جس کا چارج انہوں نے 20 دسمبر 1971ء کو یحیٰ خان سے لیا تھا کے خاتمہ کی تاریخ 14

Marfat.com

اپریل 1972ء کو ہی متعین کردی تھی۔

دوسو کیس کے فیصلہ میں مسٹر جسٹس یعقوب علی خان ' جج سپریم کورٹ نے لکھا....."اوپر دیئے گئے حقائق کی بنیاد پر یہ تسلیم کرنا ممکن ہی نہیں کہ پاکستان کے عوام نے جانتے بوجھتے ہوئے عمومی طور پر یحیٰ خان کی حکومت یا اس کے قانونی نظام کو تسلیم کرلیا تھایا انہوں نے حسب عادت اس کی اتباع شروع کر دی تھی۔ اس نے کوئی کامیاب انقلاب یا فوجی انقلاب برپا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ جن حالات میں یحی خان نے مملکت کی قوت (اقتدار) پر قبضہ کیا تھا ان پر بنیادی تبدیلی کے نظریہ کالسن کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس نے لوگوں کواپنا حکم ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن قانونی طور پر عوام پر یحی خاں کے احکامات کی پیروی لازم نہ تھی۔

" ایک اور نظریہ یہ ہے کہ اعلی عدالتوں کے جج صاحبان جنہوں نے آئین کے دفاع حفاظت اور تحفظ کا حلف لیا ہوتا ہے اپنا حلف نہیں توڑیں گے اور نہ ہی یہ اعلان کریں گے کہ غاصب کی بالادست قوت کے باعث وہ اپنی قانونی ذمہ داریوں سے ازخود سبکدوش ہو گئے ہیں اگر جج صاحبان یہ دیکھیں کہ حکومت ان کے احکامات اور فیصلوں پر عمل درآمد کرنا نہیں چاہتی تو ان کے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے منصب سے ہی سبکدوش ہو جائیں۔ جو جج صاحبان غاصب کے تحت فرائض ادا کرنے پر تیار ہوں انہیں چاہئے کہ وہ اس غاصب کے نافذ کردہ قانونی نظام کے تحت اپنے عہدہ کا ازسرنو حلف اٹھائیں۔ لیکن ایسا کرنا ججوں کے ذاتی فیصلہ اور صوابدید پر منحصر ہے اور اسکا کوئی قانونی اثر نہ ہو گا۔ اگر انہوں نے یہ راہ اختیار کی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انہوں نے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا اصول تسلیم کرلیا ہے۔ اور وہ غاصب کے ساجھے دار بن گئے ہیں۔ اگر وہ اپنے عہدے کا حلف توڑ دیں اس کی خلاف ورزی کریں اور قومی نظام قانون کی تباہی کو قانونی تسلیم کرلیں' غاصب کی قانون سازی اور انتظامی اقدامات پر قانون کی مہر تصدیق ثبت کر دیں تو بھی نتائج وہی ہوں گے چنانچہ پاکستان کے تمام شہریوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جہاں کہیں اور جب کہیں ان کے اپنے مفاد میں ہو وہ آئین کی دفعات کو بروئے کار لائیں اور ہائی کورٹ اور ان کے ذریعے سپریم کورٹ تک پہنچیں کہ یہ ان کا قانونی اور آئینی حق

Marfat.com

ہے ۔ یہ دونوں عدالتیں بھی اپنے حلف اور فرائض منصبی کے تحت اس امر کی پابند ہیں کہ آئین کی دفعات کو زندہ رکھیں ' انہیں نافذ کریں اور انہیں ہر نوع اور ہر طرح کے نقصانات سے بچائیں اور ان کا مکمل طور پر تحفظ کریں ۔ اگر کسی طرف سے آئین کی دفعات کی خلاف ورزی کی کوئی کوشش ہو تو اس کی مدافعت کریں ۔

"یہ بات یاد رکھی جانی چاہئے کہ کسی غاصب کی حکومت خواہ کتنی ہی موثر کیوں نہ ہو' قومی نظام قانون کے حیطہ کار میں اسے قانونی تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک عدالتیں اس حکومت کو " قانونی " تسلیم نہ کرلیں "

" چنانچہ یحیٰ خان کی حکومت 20 دسمبر 1971ء تک جب انہوں نے اقتدار سے علیحدگی اختیار کرلی ' بالفعل تو تھی قانونی ہرگز نہ تھی "

جب تک اس ہدایت پر عمل نہ ہو ' کوئی نیا قانونی نظام معرض وجود میں نہیں آ سکتا تھا ۔ نہ ہی ایوب خان اور نہ ہی سکندر مرزا قانون سازی کے جائز منابع ہو سکتے تھے ۔ بھلا عدالت کسی ایک یا دوسرے کو کس طرح جائز قانون ساز تسلیم کر سکتی ہے ۔ کسی ایسے شخص کی شراب میں ڈوبی گندی زبان یا داغدار قلم سے کوئی جائز قانون وارد ہی نہیں ہو سکتا جو قومی نظام قانون کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہو ۔

بلا شک و شبہ الفاظ درحقیقت بڑے دلیرانہ ہیں تاہم پاکستان کا ہر شہری جانتا ہے جس وقت یہ فیصلہ لکھا جارہا تھا تو " بے چارہ یحیٰ خان " جو غاصب تھا ایک بڑے فاصلے پر بحفاظت اپنے گھر میں نظر بند تھا ۔ لہٰذا اس وقت نہ وہ اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے قابل تھا اور نہ ہی کسی کو مالی و معاشی فائدہ یا نقصان پہنچانے پر قادر تھا ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا نومبر 1977ء میں بیگم نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ نے اپنے متذکرہ بالا فیصلے کو مثال بنا کر کیوں تقلید نہیں کی ؟ اگر اس فیصلہ کی تقلید کی گئی ہوتی تو اس کے نتائج کیا ہوتے ؟ جواب ظاہر ہے فیصلہ کی تقلید کی صورت میں 1977ء کا مارشل لاء نافذ کرنے والا غاصب قرار دیا جا سکتا تھا ۔ مگر سابقہ فیصلے سے کیوں گریز کیا گیا ؟ 7 مارچ 1977ء کو بنگلہ دیش کے قیام کے بعد پاکستان میں پہلے عام انتخابات ہوئے ۔ جب 9 مارچ کو انتخابی نتائج کا اعلان ہوا تو پیپلز پارٹی نے ' جس کی قیادت وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے 200 نشستوں میں سے 155 پر

Marfat.com

کامیابی حاصل کی ۔ پاکستان قومی اتحاد کو 36 نشستیں ملیں 8 نشستوں پر آزاد امیدوار کامیاب ہوئے اور مسلم لیگ (قیوم گروپ) کو صرف ایک نشست ملی ۔ پولنگ سے ایک روز قبل تک پاکستان یا کسی اور جگہ کوئی فرد ایسا نہ تھا جسے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی کا یقین نہ ہو ۔ لیکن پیپلز پارٹی نے جتنی زیادہ نشستیں حاصل کیں اتنی کسی کو امید نہ تھی ۔ پی این اے (قومی اتحاد) نے فوری الزام لگایا کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے ۔ احتجاج شروع ہو گیا ۔ مظاہرے ہونے لگے ' ہڑتالیں ہوئیں اور ان میں بتدریج شدت پیدا ہوتی چلی گئی جس نے بڑھ کر فسادات کی شکل اختیار کر لی ۔ ان ہنگاموں اور فسادات میں تین سو افراد زندگی سے محروم ہو گئے ۔ وزیر اعظم نے اپوزیشن پارٹیوں سے مذاکرات کی میز پر بیٹھنا قبول کر لیا ۔ مذاکرات 3 جون (1977ء) کو شروع ہوئے ۔ 2 جولائی کو ایک سمجھوتہ طے پا گیا کہ قومی اسمبلی چھٹی آئینی ترمیم کو ختم کر دے گی جس کے بعد 15 جولائی کو قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی جائیں گی ۔ اپوزیشن چھٹی آئینی ترمیم پر معترض تھی ۔ یہ بھی طے پایا کہ 6 اکتوبر کو قومی اسمبلی اور 8 اکتوبر کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات دوبارہ منعقد ہوں گے ۔

ہائی کورٹ کے پانچ سینئر ججوں پر مشتمل الیکشن کمیشن کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ انتخابات کی نگرانی کے لیے مسلح افواج کی خدمات حاصل کر سکے گا ۔ پی این اے کی کونسل نے 3 جولائی کو وزیر اعظم کو دس نئے مطالبات پیش کر دیے اور یوں اس معاہدہ کو جو انتخابات کرانے کے ضمن میں ہوا تھا ' عملاً مسترد کر دیا ۔ اس سے اگلے روز (4 جولائی) مسٹر بھٹو نے نہایت غصہ کے عالم میں پی این اے پر الزام عائد کیا کہ وہ معاہدوں سے منحرف ہو گیا ہے اور کہا کہ وہ بھی اپنی کابینہ کے وزراء اور ارکان پارلیمنٹ ' سے مشورہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے ۔ پاکستان قومی اتحاد نے دھمکی دی کہ اگر بات چیت آگے نہ بڑھی تو وہ مزید احتجاجی مظاہرے کرے گا ۔ 5 جولائی 1977ء کی شام کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق نے قوم سے خطاب کیا اور اس بات کی وضاحت کی کہ مسلح افواج نے اسی روز ملک بھر میں کیوں مارشل لاء نافذ کیا ہے ' وزیر اعظم کو معزول کر دیا ہے ' قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں اور صوبائی گورنروں اور وزراء کو برطرف کر دیا ہے ۔ انہوں نے کہا:۔

Marfat.com

" آپ پر یہ پوری طرح واضح ہونا چاہئے کہ جب سیاسی رہنماء ملک کو بحران سے نکالنے میں ناکام ہو جائیں تو مسلح افواج کے لیے خاموش تماشائی بنے رہنا ایک ناقابل معافی جرم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ فوج کو ملک بچانے کے لیے مجبوراً مداخلت کرنا پڑی ..... لیکن آئین کو منسوخ نہیں کیا گیا ۔ البتہ آئین کے بعض حصوں پر عمل درآمد معطل کردیا گیا ہے ۔ مسٹر فضل الٰہی چودھری کمال مہربانی صدر پاکستان کے طور پر اپنے فرائض ادا کرتے رہنے پر رضامند ہو گئے ہیں ..... مارشل لاء احکام یا ہدایات جب بھی ضرورت ہوئی ' میرے احکام کے تحت جاری کی جائیں گی ۔ میں نے آج ہی صبح مسٹر جسٹس یعقوب علی ' چیف جسٹس آف پاکستان ' سے ملاقات کی ہے ۔ میں قانونی معاملات میں ان کی رہنمائی اور مشوروں کا ممنون ہوں میں یہ بات بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے نہ کوئی سیاسی عزائم ہیں اور نہ فوج ملک کے دفاع کے فریضہ سے صرف نظر کرنا چاہتی ہے .....

..... میرا اب سب سے بڑا مقصد ملک میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا انعقاد ہے جو اس سال (1977ء) اکتوبر میں ہوں گے ۔ ..... میں آپ کو پختہ یقین دلاتا ہوں کہ میں اس شیڈول سے آنا کانی نہیں کروں گا ..... میرے دل میں عدلیہ کی بے حد عزت ہے ' تاہم جب کوئی مارشل لاء آرڈر یا مارشل لاء ریگولیشن جاری کیا جائے گا تو اسے کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا ۔"

مارشل لاء کے لاگو ہونے کے بعد معزول وزیر اعظم جسے نظر بند کیا جا چکا تھا ' کی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو نے 1973ء کے آئین کی دفعہ 184 (3) کے تحت سپریم کورٹ میں ایک درخواست (آئینی درخواست نمبر ایک 1977) دائر کی جس میں سابق وزیر اعظم اور پیپلز پارٹی کے دس دیگر رہنماؤں کی نظر بندی کو چیلنج کیا گیا تھا ۔ یہ نظر بندی مارشل لاء کے حکم نمبر 12(1977) کے تحت عمل میں آئی تھی ۔

درخواست دہندہ کے وکیل یحیٰ بختیار نے بڑی حد تک عاصمہ جیلانی کیس پر انحصار کرتے ہوئے دلائل پیش کئے ۔ انہوں نے موقف اختیار کیا کہ چیف آف آرمی سٹاف کو 1973ء کے آئین کے تحت مارشل لاء نافذ کرنے کا کوئی اختیار نہیں ۔ اور ان کا یہ اقدام آئین کے آرٹیکل 6 کے تحت بغاوت کے مترادف ہے ۔ چنانچہ اس کے نتیجے

Marfat.com

میں ' 5جولائی 1977ء اور مارشل لاء آرڈر نمبر12 مجریہ 1977ء' سبھی بلا جواز ہیں۔ مارشل لاء حکومت کی طرف سے مسٹر اے۔کے بروہی نے اس مقدمہ میں دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ 5 جولائی 1977ء تک پاکستان پر 1973ء کے آئین کے تحت حکومت کی جا رہی تھی لیکن اس روز چیف آف آرمی سٹاف کی طرف سے (جو اب سی ایم ایل اے ھیں) مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ملک میں ایک نیا قانونی نظام معرض وجود میں آگیا ہے ۔ اس نئے نظام قانون نے خواہ یہ عارضی ہی کیوں نہ ہو ' سابق نظام قانون کی جگہ لے لی ہے ۔ اور اس طرح اعلیٰ عدالتوں کے دائرہ کار میں تبدیلی ہو گئی ہے ۔ اس سے ایک ماورائے قانون یا غیر معمولی آئینی صداقت معرض وجود میں آئی ہے جو" انقلابی جواز " "یعنی برالفاظ دیگر " نظریہ ضرورت " کے نظریہ کے تحت آتی ہے ۔ اس کے بعد شریف الدین پیرزادہ نے عدالت میں اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے بروہی کے اس نظریہ کی تائید کی کہ 5 جولائی 1977ء کو کیا جانے والا اقدام 'حالات کے تحت' غاصبانہ اقدام نہیں تھا۔ بلکہ یہ اقدام تو ایک غاصب کو بے دخل کرنے کے لئے تھا جس نے 7مارچ 1977ء کے انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کے ارتکاب کے بعد غیر قانونی طور پر اقتدار حاصل کر لیا تھا ۔ وکلاء کے بحث مباحثہ کے بعد عدالت نے چیف جسٹس انوارالحق کی سرکردگی میں اپنا فیصلہ سنایا۔ اب ہم چیف جسٹس کے فیصلہ کے بطن البطون کی طرف آتے ہیں ۔

1۔ 1973ء کا آئین آج بھی مملکت کا قانون ہے ' اس شرط کے ساتھ کہ اس کے بعض حصے ' مملکتی ضرورت کے تحت ' معطل کر دیئے گئے ھیں ۔

2۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ' غیر معمولی آئینی اقدامات کے ذریعے اختیار' اقتدار سنبھالنے کے بعد ' ریاست کے مفاد اور عوام کی بہبود کے تحت ' ایسے تمام اقدامات ' قانون سازی اور نفاذ قانون کا قانونی حق رکھتا ہے جو تمام عدالتی حکام نے نظریہ ضرورت کے تحت درست اور قانونی قرار دیئے ہیں ۔ مثلاً

(الف) تمام اقدامات یا قانونی احکامات جو 1973ء کے آئین کے مطابق ہیں یا ایسے قوانین جو 1973ء کے آئین کے تحت بنائے اور نافذ کئے جاسکتے ہیں ' جن میں آئین

Marfat.com

میں ترامیم بھی شامل ہیں۔

(3) اور یہ کہ اعلیٰ عدالتوں کو مارشل لاء حکام کے کسی حکم یا اقدام پر عدالتی نظرثانی یا اس کے قانون کے مطابق ہونے یا نہ ہونے پر غور کرنے کا اختیار حاصل ہے اگر ان احکام یا اقدامات کو قانون نظریہ ضرورت کے اصول کے مطابق عدالت میں چیلنج کیا گیا ہو۔ آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت عدالتوں کے اختیارات پوری طرح موجود ہیں اور وہ کسی مارشل لاء ریگولیشن یا صدارتی حکم میں ان اختیارات کے برعکس کسی امر کی موجودگی کے باوصف اپنے اختیارات کو بروئے کار لا سکتی ہیں۔ چیف جسٹس نے اس نکتہ پر زور دیا کہ:

"میں نے یہ قرار دیا ہے کہ نیا قانونی نظام صرف ایک عارضی عرصہ کے لئے اور ایک مخصوص اور مقررہ مقصد کے لئے ہے۔ نئی حکومت کسی نئے نظام قانون کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ آئینی انحراف کے ایک مرحلہ کی نمائندہ ہے جو "ضرورت" کی پیداوار ہے---"

(بیگم نصرت بھٹو کیس کا مفہوم، کم از کم ایک نقطہ پر واضح ہے کہ 1973ء کا آئین نافذ ہے اور عدلیہ کو آرٹیکل 199 کے تحت کسی امر پر نظرثانی کے اختیارات حاصل ہیں مگر حکومت اس ضمن میں، دوسری سوچ کی حامل تھی اور باقاعدہ طور پر عدلیہ کے اختیارات میں جبری مداخلت کی جاتی رہی مثلاً۔

16 اکتوبر 1979ء کو صدر نے دستور کی دوسری ترمیم کا حکم مجریہ 1979ء جاری کیا جس کے تحت تمام سیاسی جماعتیں غیر قانونی قرار دے دی گئیں اور متعدد سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس ترمیم کے تحت آرٹیکل 212۔ الف کا اضافہ کیا گیا۔ آئین کے آرٹیکل 212 میں ایسے انتظامی ٹریبونل قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے جو عام سول قانون کے واضح محدود دائروں میں عدالتی نظرثانی سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ نئے آرٹیکل 212 الف سے آرٹیکل 212 کا دائرہ بے حد وسیع ہو گیا۔ اس کے تحت اب مارشل لاء یا کسی اور قانون جس میں خصوصی قوانین شامل تھے، کے تحت مقدمات چلانے کے لئے ٹریبونلوں کا قیام عمل میں لایا جا سکتا تھا۔ اس ترمیم کے تحت حکومت کو یہ اختیار بھی مل گیا کہ وہ جس مقدمہ کو چاہے عام سول عدالت

Marfat.com

سے مارشل لاء کی عدالت میں تبدیل کر دے ۔ سول عدالتیں جن میں اعلیٰ عدالتیں بھی شامل تھیں ۔ اب فوجی ٹریبونل کے کسی فیصلہ کے خلاف اپیل کی سماعت نہیں کرسکتی تھیں ۔ اس حکم کے تحت فوجی عدالت کا حکم قطعی قرار پایا ۔

اس آئینی ترمیم سے اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات میں زبردست کمی ہوئی ۔ مارشل لاء ریگولیشن جو اس ترمیم (مارشل 72) کے تحت بنائے اور نافذ کئے گئے ' ان کی بدولت سول عدلیہ کی قیمت پر فوجی عدالتوں کا دائرہ سماعت بے حد وسیع ہو گیا۔ اب فوجی عدالتوں کو وسیع پیمانے پرسول اور فوجی نوعیت کے مقدمات کی سماعت کا اختیار مل گیا ان میں تعزیرات پاکستان کے تحت درج مقدمات بھی شامل تھے ۔ 1979ء کی آئینی ترمیم کے بعد آنے والے چند مہینوں میں ملک کے طول و عرض میں ایک سو سے زائد فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا ۔ ان عدالتوں میں عام شہریوں ' جن میں سیاسی نظربند بھی شامل تھے ' کے خلاف مقدمات کی سمری سماعت شروع ہو گئی ۔ سینکڑوں افراد کو قید و بند اور کوڑوں کی سزا محض اس بنیاد پر دی گئی کہ انہوں نے عام سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کی تھی جو مارشل لاء کے تحت ممنوع قرار پا چکی تھیں ۔

صدارتی حکم نمبر ایک کے تحت جو 27 مئی 1980ء کو نافذ کیا گیا تھا آئین کے آرٹیکل 199 میں ترمیم کر دی گئی ۔ اس کے تحت ہائی کورٹوں کا رٹ جاری کرنے کا اختیار محدود کردیا گیا ۔ اعلیٰ عدالتوں کو ایسا کوئی حکم جاری کرنے سے منع کر دیا گیا جو کسی مارشل لاء ریگولیشن یا کسی مارشل لاء آرڈر ' یا مارشل لاء کے تحت کئے گئے کسی اقدام جو کیا جا چکا ہو یا مارشل لاء حکومت کرنے کا ارادہ رکھتی ہو کے جواز یا اس کے اثرات کے بارے میں ہو۔ اس حکم کے تحت عدالت عالیہ کو کسی فوجی عدالت یا ملٹری ٹریبونل کے فیصلہ یا اس کی طرف سے دی گئی سزا پر نظرثانی سے بھی روک دیا گیا ۔ عدالت مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی طرف سے دیئے گئے اختیار کے تحت کئے جانے والے کسی اقدام کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہیں کرسکتی تھی ۔ اس حکم میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ عدالتوں کے اختیارات کا خاتمہ موثر بہ ماضی ہو گا ۔ حکم میں اعلان کیا گیا کہ 1977ء میں ملک پر فوجی قبضہ قانون کے عین مطابق تھا اور اس کے

Marfat.com

بعد فوجی حکام کی جانب سے جو بھی آرڈرز ' احکامات جاری ہوئے ہیں وہ سب قانون کے عین مطابق ہیں ۔ ان احکامات اور آرڈرز میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے آرڈرز اور مارشل لاء آرڈرز اور ریگولیشنز شامل تھے ۔

مارشل لاء آرڈر 77 کے تحت جو مارشل لاء آرڈر 72 کی جگہ تقریباً بیک وقت جاری کیا گیا تھا ' فوجی عدالتوں کادائرہ اختیار مزید بڑھا دیا گیا اس اقدام سے سول عدالتوں کے اختیارات مزید کم کئے گئے ۔ فوجی عدالتوں کو " بغاوت ' تخریب کاری ' سرکشی ' سبوتار' خلاف قانون کارروائیوں اور ---- مسلح افواج کے ارکان کو ورغلانے کے الزامات کے تحت مقدمات چلانے کے لئے خصوصی اختیارات دیئے گئے فوجی عدالتوں کوکسی بھی مارشل لاء آرڈر یا مارشل لاء ریگولیشن کی خلاف ورزی اور تعزیرات پاکستان کے تحت کسی بھی ارتکاب جرم کے مقدمات کی سماعت کا اختیار مل گیا ۔ صرف یہی نہیں بلکہ ۔:

24 مارچ 1981ء کو صدر ضیاء الحق نے عبوری آئین کا حکم مجریہ 1981ء (پی سی او) جاری کیا جس کے تحت 1977ء کے بعد فوجی حکومت کی طرف سے کئے گئے تمام اقدامات کو قانون کے مطابق قرار دیدیا گیا (آرٹیکل 15 (1) اور (2)) اس آرڈر کے تحت ایک صدارتی حکم کے ذریعے 1973ء کے آئین کی بنیاد کو ہی گرا دیا گیا ۔ آئین کی صرف ان دفعات کو ہی برقرار رہنے دیا گیا ۔ جن کا ذکر پی سی او میں موجود ہے ۔ تاہم صدر مملکت کے اختیارات کے متعلق حصہ کو موجود رہنے دیا گیا لیکن انتخابات ' صوبائی اسمبلیوں ' پارلیمنٹ اور بنیادی انسانی حقوق کے متعلق آئین کی دفعات کو خارج کر دیا گیا ۔ آرٹیکل 16 کے تحت صدر نے از خود یہ اختیارات سنبھال لئے کہ وہ جب چاہیں ' جس طرح چاہیں آئین میں ترمیم کر سکتے ہیں اس طرح پی سی او نے عدلیہ کی آزادی کا خاتمہ کردیا اور تمام بڑی سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا اس کے مطابق مارشل لاء حکومت کے کسی حکم کسی اقدام یا کسی فعل کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا ۔ نہ ہی مارشل لاء کی عدالتوں سے یا کسی ٹریبونل سے دی جانے والی سزا کو ہی کسی عدالت میں چیلنج کیا جاسکتا ہے پی سی او کے ذریعے سپریم کورٹ کی رولنگ 10 نومبر 1977ء کو بھی کالعدم قرار دیدیا گیا جس

Marfat.com

میں مارشل لاء کی حکومت کو مشروط طور پر جائز تو قرار دیا گیا تھا لیکن اس کے اختیارات محدود کر دئے گئے تھے ۔ پی سی او کا نفاذ اس وقت عمل میں آیا ۔ جب سپریم کورٹ فوجی حکومت کی قانونی حیثیت کو چیلنج کرنے والی درخواستوں کی سماعت شروع کرنے والی تھی مزید اس حکم کے تحت سپریم کورٹ کے ان تمام فیصلوں کو بھی کالعدم قرار دے دیا گیا جو مارشل لاء کی حکومت اور فوجی ٹریبونلوں کے تمام فیصلوں کی قانونی حیثیت کے بارے میں صادر کئے گئے تھے ۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں نے فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے بارے میں جو احکام امتناعی جاری کئے تھے یا کوئی فیصلے صادر کئے تھے وہ سب یک دم معطل کر دیئے گئے۔ (آرٹیکل 15 (6)

ان میں قابل ذکر بلوچستان ہائی کورٹ کے فیصلے تھے جن کے تحت قومی عدالتوں نے موت کی کئی سزاؤں پر عمل درآمد روک دیا تھا ۔ یہ سزائیں خصوصی فوجی عدالتوں نے سنائی تھیں ۔ جولائی 1980ء میں بلوچستان ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ فاضل عدالت فوجی عدالتوں کے قیام کو چیلنج کرنے والی درخواستوں کی سماعت کرسکتی ہے اور فیصلہ صادر کر سکتی ہے ۔ " ہم یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ عدالت اس سوال کا جائزہ لینے کا اختیار رکھتی ہے کہ آیا صدارتی حکم نمبر 21 مجریہ 1979ء اور صدارتی حکم نمبر ایک مجریہ 1980ء بشمول ان دستاویزات کا جواز جن کے ذریعے ایسی ترامیم عمل میں لائی گئی ہیں ' اس عدالت کے دائرہ کار میں آتے ہیں یا نہیں " ۔ پھر عدالت نے آئین کے آرٹیکل 212 اور 199 میں آئینی ترامیم (مجریہ 16 اکتوبر اور 27 مئی 1980ء کو کالعدم اور غیر قانونی قرار دے دیا ۔ عدالت نے ان دونوں ترامیم کو ہمہ گیر اور بنیادی نوعیت کی ترامیم قرار دیا اور فیصلہ دیا کہ یہ خصوصی حکومت کے اختیارات سے باہر ہیں ۔ عدالت نے رولنگ دی کہ سپریم کورٹ نے 1977ء میں جو فیصلہ دیا تھا اور اس میں " ضرورت " کے جو اصول متعین کئے گئے تھے یہ ترامیم ان اصولوں پر پوری نہیں اترتیں عدالت عالیہ نے فیصلہ دیا کہ آئینی ترامیم کے باوجود جو اس کے برعکس ہیں ' عدالت کو کسی امر پر نظرثانی کے اختیارات حاصل ہیں جو آئین (1973) کی رو سے عدالتوں کو تفویض کئے گئے ہیں ۔ چنانچہ بلوچستان ہائی کورٹ نظر بندوں کی موت کی سزاؤں پر عمل درآمد روکنے کے احکام جاری کرتی رہی ۔

Marfat.com

پی سی او 1981ء کے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی پاکستان کے متعلق رپورٹ میں کہا گیا ہے ۔۔

" پی سی او نے عدالتوں کا یہ اختیار قطعی طور پر ختم کر دیا ہے کہ عدلیہ مارشل لاء کے حکم نمبر 78 کے تحت سیاسی کی نظربندی کے احکامات کو غیر قانونی قرار دے کر کالعدم قرار نہیں دے سکتی ۔ نہ ہی کوئی عدالت سیاسی نظربندوں کے مقدمات کی سرسری سماعت کے بعد فوجی عدالتوں سے دی جانے والی سزاؤں کو ختم کر سکتی ہے ۔ اسے کوڑوں کی سزا یا پھانسی کی سزاؤں کے خلاف حکم امتناعی جاری کرنے کا بھی اختیار نہیں رہا جیسا کہ قبل ازیں عدالت اس بناء پر کہ فوجی عدالت میں مقدمہ کی منصفانہ سماعت کے لئے موزوں قانونی تحفظات فراہم نہیں کئے جاتے ' سزاؤں پر عمل درآمد روکتی رہی ہے ۔ پی سی او کے نفاذ کے بعد کئی سابق سیاسی قیدیوں نے جو ملک سے فرار ہو گئے ہیں ۔ اور سیاسی قیدیوں کے رشتہ داروں نے ایمنسٹی انٹرنیشنل کو بتایا ہے کہ انہیں نظربندوں کی جان کا خطرہ ہے کیونکہ اب وہ عدلیہ سے امداد حاصل نہیں کر سکتے پاکستان میں بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ اور دفاع کے لئے جو وکلاء سرگرم رہے ہیں ' اب سیاسی نظربندوں کو کسی قسم کی قانونی امداد فراہم کرنے کے قابل نہیں رہے ۔ انہوں نے سیاسی نظربندوں کے اعزا کو بتایا ہے کہ اب عدالتوں میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کو جون 1981ء میں جو خطوط ملے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے " میرے بھائی نے ہائی کورٹ کے متعدد وکلاء سے مشورہ کیا ہے ۔ وہ ہائی کورٹ میں رٹ دائر کرنا چاہتا تھا لیکن وکلاء نے اسے بتایا ہے کہ حالیہ آئینی ترامیم کے بعد عدالتی چارہ جوئی ممکن نہیں "

پی سی او کے اثرات فوراً ہی ظاہر ہوئے ۔ اس کے بعد دو سیاسی نظربندوں کو پھانسی دے دی گئی ۔

بلوچستان کے 21 سالہ طالب علم عبدالحمید بلوچ کو ایک ریکروٹنگ ایجنٹ کے قتل کے الزام میں خصوصی فوجی عدالت سے موت کی سزا سنائی گئی ۔ بلوچستان ہائی کورٹ نے 8 دسمبر 1980ء کو اس سزا کے خلاف حکم امتناعی جاری کردیا ۔ کیونکہ اس کے مقدمہ کی سماعت اور سزا میں زبردست بے قاعدگیاں سرزد ہوئی تھیں ۔ عبدالحمید پر

Marfat.com

جس شخص کے قتل کا الزام تھا اس کا نام دوبار تبدیل کیا گیا کیونکہ ہر بار " مقتول " زندہ پایا گیا تھا۔ چنانچہ پی سی او کے نتیجے میں (جس کے تحت بلوچستان کے چیف جسٹس میر خدا بخش مری کو بھی برطرف کر دیا گیا۔) عبدالحمید کی سزائے موت کے خلاف بلوچستان ہائی کورٹ کا حکم امتناعی معطل کر دیا گیا اور " مجرم " کو جون 81ء میں کوئٹہ کے قریب مچھ جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

جہاں تک مسٹر کمال اظفر کے مضمون " قلوپطرہ کی لمبی ناک " جو روزنامہ ڈان کراچی میں شائع ہوا اور جسٹس ریٹائرڈ دراب پٹیل کے مضمون " لمبی اور تاریک سرنگ، سرے پر کوئی روشنی نظر نہیں آتی " کا تعلق ہے معمولی سا انصاف پسند شخص بھی کہے گا کہ یہ دونوں باتیں تو ہر شخص پر اس روز ہی واضح ہو گئی تھیں۔ جب بھٹو حکومت نے 1973ء کے آئین میں پانچویں اور چھٹی ترمیم کی تھی۔ اپوزیشن نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ان دونوں ترامیم کے خلاف سخت شور مچایا مگر بے سود۔ ان شاطرانہ ترامیم کے ذریعے بعض ججوں کی میعاد ملازمت میں " ضرورت سے زیادہ توسیع اور بعض دوسرے ججوں کی میعاد ملازمت مختصر کر دی گئی۔ اس " قانونی تدبر " کے باعث لاہور اور پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس سردار اقبال اور مسٹر جسٹس صفدر شاہ ان شرائط ملازمت کے برعکس جن کی ضمانت آئین میں دی گئی تھی، ریٹائر ہونے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے حکومت کی سر میں سر ملانے کی نسبت اپنا منصب چھوڑ دینا مناسب تصور کیا۔

ججوں کو ان کی مرضی کے بغیر ایک سال کے لئے ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں قابل تبادلہ قرار دیا گیا اور یوں ان کے لئے ایک آئینی ضمانت ختم کر دی گئی۔ اس حکومت کے دور میں ہی ہائی کورٹوں کا رٹ جاری کرنے کا اختیار ختم کر دیا گیا ججوں کے بارے میں کاناپھوسی کی ایک مہم چلائی گئی اور انہیں " برہمن " قرار دے کر ان کا تمسخر اڑایا گیا۔ پارلیمنٹ میں ججوں کے متعلق ناروا الفاظ کہے گئے۔ پھر ایسا ہوا کہ جب بلوچستان کے نئے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی تقرری کا سوال پیدا ہوا تو میرے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ ایک خاص علاقہ سے تعلق رکھتا ہے اور اپنی رائے پر مضبوطی سے ڈٹ جاتا ہے لہٰذا وہ کسی صوبہ کا چیف جسٹس بنائے جانے کے قابل نہیں

Marfat.com

۔ لیکن دوسرے کے بارے میں کہا گیا کہ وہ نرم خو اور جھک جانے والا ہے ' حکومت کو ایسا ہی شخص چاہئے۔ لہٰذا وہ چیف جسٹس بنائے جانے کے قابل ہے ۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس حکومت نے ' جس نے آئین بنایا تھا ' آئین کو پوری طرح کام ' کرنے کا موقع بھی نہ دیا ۔ بلوچستان کی صوبائی حکومت کو نہایت ہی غیر جمہوری انداز میں برطرف کر دیا گیا ۔ اس پر سرحد کی صوبائی حکومت نے بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا ۔ یہ بھٹو دور کی چند مثالیں ہیں نہ صرف یہ بلکہ جسٹس پٹیل کی "تاریکی" اور کمال اظفر کی " قلوپطرہ کی لمبی ناک " اس وقت بھی پوری طرح نمایاں تھی جب 22 ستمبر 1977ء کو سپریم کورٹ کے ججوں کو "صدارتی حکم (مابعد فرمان) 9 مجریہ 1977ء سپریم کورٹ کے ججوں کا (حلف منصب کا) حکم 1977ء " کے تحت حلف اٹھانے پر مجبور کیا گیا وہ بھی اس ذہنی کرب کے ساتھ کہ اب کسی جج نے صدر کے مقرر کردہ وقت پر حلف نہ اٹھایا تو اس کی ملازمت ختم ہو جائے گی ۔ پہلے سپریم کورٹ کے سبھی ججوں نے نیا حلف اٹھا لیا سپریم کورٹ کے جج جسٹس قیصر خان نے بعد میں بیگم بھٹو کیس میں اپنا الگ فیصلہ لکھتے ہوئے بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ کہا " ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ ہم از سر نو حلف اٹھائیں یا پھر ملازمت چھوڑ دیں اس حکم کے تحت ہم نے از سر نو حلف اٹھایا جس میں 1973ء کے آئین کا ذکر تک نہ تھا " ۔ اس بناء پر جسٹس قیصر خان نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ججوں نے نیا حلف اٹھا کر نئے قانونی نظام کو تسلیم کر لیا ہے نئے حلف اٹھانے کے باوجود جس میں 1973ء کے آئین کا ذکر ہی نہ تھا ۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ایس انوار الحق نے بیگم بھٹو کیس میں نئے حلف کا تین بار ذکر کیا ۔ " نیا حلف سپریم کورٹ کے ججوں کا یہ اختیار ختم نہیں کرتا کہ وہ نئے قانونی نظام کے قانونی جواز کا جائزہ لیں اور اس بارے میں اپنے ضمیر اور قانون کے مطابق فیصلہ صادر کریں ۔۔۔۔" اس سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ نے بھی ' ملک کے باقی لوگوں کی طرح اس حقیقت کو جو ویسے بھی عیاں ہے تسلیم کر لیا ہے کہ 5 جولائی 1977ء کو ملک میں موجود قانونی نظام میں ایک انقلابی تبدیلی وقوع پذیر ہو چکی ہے (پی ایل ڈی 1977 ایس سی 674)

" لہٰذا نیا نظام اپنے اخلاقی جواز اور جمہوری اداروں کی بحالی کے وعدہ کی

Marfat.com

بدولت از خود "موثر" ہو گیا۔ مجھے مزید کہنے دیجئے کہ یہی امر مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ججوں کا نئے حلف پر آمادہ ہونے کی بنیاد بھی تھا"۔ (پی ایل ڈی 1977 ایس سی 704)

"صرف یہ حقیقت کہ سپریم کورٹ کے ججوں نے از سر نو حلف اٹھایا ہے ۔۔۔۔ اعلیٰ عدالتیں 1973ء کے آئین کے تحت قائم ہوئی تھیں اور اسی آئین کے تحت ہی مارشل لاء کے نفاذ کے باوجود' کام کر رہی ہیں" (پی ایل ڈی 1977 ایس سی 715-6)

کیا یہ ایک طرح کی ذاتی تائید و حمایت نہ تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟۔ نومبر 1977ء سے عبوری آئینی حکم مجریہ 1981ء کے نفاذ تک سپریم کورٹ کو پورا پورا موقع حاصل تھا کہ وہ یہ دیکھتی کہ بیگم بھٹو کیس میں اپنے ہی وضع کئے گئے اصولوں پر سختی سے کارروائی کرتی مگر سپریم کورٹ ایسا کرنے میں ناکام رہی نہ اس کی کوئی معقول وجہ پیش کی گئی دوسرا موقع متذکرہ بالا اصولوں پر عمل درآمد کا اس وقت آیا جب 16 اکتوبر 1979ء کو 1973ء کے آئین میں ترمیم کر کے اس میں دفعہ 212 الف کا اضافہ کر کے اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات بے حد کم کر دیئے گئے مگر سپریم کورٹ نے معاملہ کو آگے نہیں بڑھایا۔ اس آرٹیکل کی دفعہ 3 یوں ہے۔

"تاہم اس سے قبل جن امور کا ذکر ہو چکا ہے' ان کے باوجود جہاں فوجی عدالت یا ٹریبونل قائم ہو چکا ہے۔ ہائی کورٹ سمیت کوئی دوسری عدالت کسی نوع کا حکم امتناعی جاری نہیں کرے گی۔ کوئی حکم صادر نہیں کرے گی' یا کسی ایسے معاملہ کے بارے میں جو فوجی عدالت یا ٹریبونل کے دائرہ کار میں آتا ہو' یا فوجی عدالت یا ٹریبونل نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہو' یا اسے فوجی عدالت یا ٹریبونل میں تبدیل کر دیا گیا ہو' کسی نوع کی کارروائی نہیں کرے گی' اس طرح کے کسی بھی معاملہ کے بارے میں کسی بھی عدالت میں' سپریم کورٹ میں اپیل کے سوا' کسی بھی طرح کی کارروائی کالعدم تصور ہو گی"

کیا یہ ترمیم بیگم بھٹو کیس کی نفی نہیں کرتی اس کا جواب اثبات میں ہے۔ اس کے باوجود سپریم کورٹ نے اس ترمیم کے بارے میں کوئی اقدام نہ کیا۔

Marfat.com

مئی 1980ء میں ایک اور آئینی ترمیم کا حکم جاری کیا گیا ۔ جس کے مطابق 1973ء کے آئین کے آرٹیکل 199 میں موجود عدلیہ کے اختیارات میں بنیادی اور ہمہ گیر تبدیلی کر دی گئی یہ ترمیم اس طرح ہے ۔

" (3 الف) کسی عدالت کے کسی فیصلہ کے باوجود ' اس میں عدالتی نظرثانی کے متعلق عدالتی اختیارات کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی شامل ہے ' عدالت عالیہ اس آرٹیکل (الف) کے تحت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یا کسی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے جاری کردہ مارشل لاء ریگولیشن ' یا اس کے تحت کئے گئے کسی اقدام ' یا کسی کارروائی یا اس کے تحت آئندہ کئے جانے والے کسی اقدام یا متوقع کارروائی کے بارے میں کوئی حکم جاری نہیں کرے گی ۔"

(ب) "کسی فوجی عدالت یا ٹریبونل کے کسی فیصلہ یا ان کی دی ہوئی کسی سزا کے قانونی جواز کے بارے میں کوئی حکم جاری نہیں کرے گی ۔"

(ج) "عدالت عالیہ کسی ایسے معاملہ کے بارے میں جو فوجی عدالت یا ٹریبونل کے دائرہ اختیار میں آتا ہے ' نہ تو کوئی حکم امتناعی جاری کرے گی اور نہ ہی کوئی حکم جاری کرے گی یا کسی درخواست کی سماعت کرے گی ۔"

(د) "عدالت عالیہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ' مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یا ان کی اتھارٹی کے تحت کام کرنے والے کسی فرد کے بارے میں کوئی حکم جاری نہیں کرے گی ۔"

(3 بی) "جیسا کہ دفعہ 3 الف میں مذکورہ ' ایسا ہر حکم یا حکم امتناعی جو آئینی (ترمیم) حکم 1980 کے نفاذ سے پہلے یا بعد میں کسی بھی وقت جاری کیا گیا ہو ' کسی عدالت کے فیصلے کے باوجود ' کالعدم متصور ہو گا اور اس کا کوئی اثر نہ ہو گا ۔ اسی طرح کوئی حکم جاری کرنے ' حکم امتناعی کے اجراء یا کوئی بھی عدالتی کارروائی جو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ سمیت کسی بھی عدالت میں زیر سماعت ہو گی ' ختم ہو جائے گی "

" (3 ج) 5 جولائی 1973ء کا فرمان ' تمام صدارتی احکام ' چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے احکام ' مارشل لاء ریگولیشنز ' اور مارشل لاء آرڈرز جو 5 جولائی 1977ء کو یا اسکے بعد جاری کئے گئے یا وضع کئے گئے ہیں ۔ کسی عدالت کے فیصلہ

Marfat.com

کے باوجود' قانون کے مطابق وضع شدہ قرار دیئے جاتے ہیں۔"

آئین میں ان ترامیم کے بعد کیا "سرنگ کی تاریکی" اور "قلوپطرہ کی لمبی ناک" کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے ؟ کیا یہ مناسب وقت نہ تھا کہ سپریم کورٹ اس امر کا نوٹس لیتی جیسا کہ اسے اختیار حاصل تھا' کہ اس کے فیصلوں پر عمل درآمد کیا جائے ؟

چلئے بحث کی خاطر یہ مانے لیتے ہیں کہ اول تو کسی شہری کو عدالتوں کی توجہ اس طرف دلانی چاہئے تھی ' یا حکومت خود عدالتوں کو متوجہ کرتی ' کیونکہ عدالتیں اس صورت میں ہی حرکت میں آ سکتی تھیں ۔ لیکن یہ دلیل بھی کارآمد نہیں کیونکہ بلوچستان ہائی کورٹ کا فل بنچ ' اب معروف کیس ' " آئینی درخواست نمبر 78/247 سلیمان قاسم وغیرہ بنام چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر و صدر خصوصی فوجی عدالت وغیرہ" میں اپنا متفقہ فیصلہ سنا چکا تھا ۔ یہ فیصلہ کوئٹہ میں 2 جولائی 1980ء کو سنایا گیا تھا ۔ اپنے اس فیصلہ کے تحت بلوچستان ہائی کورٹ نے حکومت کی طرف سے آئین میں شامل کی گئی تمام دفعات کو کالعدم قرار دے دیا تھا اور اپنے فیصلہ میں ہی وفاقی حکومت کو اس فیصلہ کے خلاف اپیل کرنے کی اجازت بھی دی تھی مگر سپریم کورٹ نے اس اپیل کا کوئی فیصلہ 25 مارچ 1981ء تک نہ سنایا جب عبوری آئین کا حکم جاری کیا گیا اور عدالتوں کو سرے سے ان اختیارات سے محروم کر دیا گیا۔

متذکرہ بالا کے علاوہ بھی سپریم کورٹ کو اپنے فیصلہ پر مہر توثیق ثبت کرنے یا نہ کرنے کا ایک اور موقع بیگم بھٹو کیس میں ملا تھا ائیر مارشل اصغر خان کی رٹ درخواست سپریم کورٹ میں دائر کی گئی ثبوت کی ضرورت نہیں پھر بھی میں اس وقت 21 اکتوبر 1979ء کی ایک اخباری رپورٹ کا حوالہ دوں گا

" لاہور 21 اکتوبر ۔: پاکستان سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس اسلم ریاض حسین نے آج ایک آئینی درخواست چیف جسٹس آف پاکستان کو بھجوائی ہے تاکہ اس کی سماعت کے لئے ایک بڑا بنچ تشکیل دیا جائے ۔ اس درخواست میں کالعدم تحریک استقلال کے سربراہ ایر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان کی تربیلا کے نزدیک پہور کے مقام پر نظربندی کو چیلنج کیا۔

" یہ درخواست کالعدم تحریک استقلال کے رہنما ملک حامد سرفراز نے آئین

Marfat.com

پاکستان کے آرٹیکل 184 کے تحت دائر کی ہے ۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ میں نظریہ ضرورت کی جو توجیح کی گئی۔ اس کے مطابق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو آئین 1973 سے زیادہ کوئی اختیار حاصل نہیں ہے ۔ چونکہ اب صدر نے عام انتخابات غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیئے لہٰذا نظریہ ضرورت کا اصول از خود کالعدم ہو گیا ہے اور عوام کے بنیادی حقوق خود بخود بحال ہو گئے ہیں ۔ چنانچہ مارشل لاء کے آرڈر 12 کے تحت اصغر خان کی نظربندی غیر قانونی ہے اسے کالعدم قرار دیا جائے ۔

" درخواست گزار نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور وفاق پاکستان کو فریق بنایا ہے "

سوال پیدا ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ نے مزید موقع ملنے کے باوجود ' اصغر خان کی درخواست اور وفاقی حکومت کی اس اپیل کا فیصلہ کیوں نہ کیا جو اس نے بلوچستان ہائی کورٹ کے فیصلہ کے خلاف کی تھی ۔ اگر سپریم کورٹ نے یہ راہ اختیار کی ہوتی ۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ' جج صاحبان اور ملک کو بشمول حکومت ' عبوری آئین کے حکم مجریہ 1981ء اور فرد واحد کے آئین 1985ء کے نفاذ اور نتائج سے محفوظ رکھا جاسکتا تھا ۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بلوچستان ہائی کورٹ کے فیصلہ میں ان اصولوں کی مکمل تائید کی گئی تھی جو بیگم بھٹو کیس میں متعین کئے گئے تھے ۔ سندھ ہائی کورٹ کے پانچ ججوں میں صرف دو ججوں نے بھی 2-3 کی نسبت سے بیگم بھٹو کیس کی مکمل تائید کی تھی ۔ مگر تین ججوں کی اکثریت نے اپنا فیصلہ حکومت کے حق میں دیا ۔ جن میں سندھ کے چیف جسٹس شامل تھے جہاں تک لاہور اور پشاور ہائی کورٹ کا تعلق ہے ' دونوں اعلیٰ عدالتوں نے حکومت کی طرف سے آئین میں کی جانے والی ترامیم کو قانون کے مطابق قرار دے دیا تھا ۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ دوبارہ یہ بلوچستان ہائی کورٹ ہی تھا جو صوبہ کی آبادی اور ججوں کی تعداد کی نسبت ایک مختصر ہائی کورٹ ہے (عموماً بلوچستان کو پسماندہ صوبہ قرار دیا جاتا ہے اور بد قسمتی سے سبھی بلوچستان کا استحصال کرتے رہے ہیں ' مگر اسی ہائی کورٹ نے قانون کی حکومت کے اصول کو بڑی پامردی سے قائم رکھا

Marfat.com

حالانکہ اس میں کئی خطرات مضمر تھے مگر بلوچستان ہائی کورٹ نے " ذاتی تحفظ " کے اصول میں بھی پناہ حاصل نہیں کی ۔ اس فیصلہ کے نتیجہ میں بلوچستان ہائی کورٹ کے کل تین میں سے دو ججوں کو پی سی او 1981ء کے نتیجہ میں جبری ریٹائر کر دیا گیا اور تیسرے جج کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا ہے جس نے بعد میں دوسرے ججوں کے ساتھ پی سی او 1981ء کے تحت از سر نو حلف اٹھالیا اور بلوچستان ہائی کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس بنا دیا گیا ۔ اخراج کے فطری اصول کے تحت اس جج کو ایک سال کے لئے سندھ ہائی کورٹ میں تبدیل کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ 1985ء کے آئین کے تحت تا حکم ثانی خدمات انجام دے گا ۔

اسی طرح انہی دنوں سندھ ہائی کورٹ کے ایک جج کو بلوچستان ہائی کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس بنا دیا گیا ۔ اور ایک جج پشاور ہائی کورٹ سے یہاں متعین کیا گیا ' حیرت ہے کہ سب کچھ کیوں کیا گیا۔ کیا یہ عدالت عالیہ کے طریق کار اور تقرری کے اصولوں سے انحراف نہیں تھا ؟ کیا ان اقدامات سے عدلیہ کمزور نہیں ہو گی بلوچستان ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سوا ' جس نے ان تبادلوں کی مذمت کی ' نام نہاد قومی پریس یا حکومت کے اندر اور باہر سیاستدانوں نے ان بنیادی اصولوں سے انحراف کے ضمن میں ایک لفظ بھی بطور احتجاج نہ کہا حالانکہ ببانگ دھل کہا جا رہا تھا کہ ملک میں جمہوریت کا دور دورہ ہے اور ملک سول حکومت کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے

جہاں تک 1973ء کے آئین کے وجود یا عدم وجود یا اس میں ترمیم کے لئے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات کا تعلق ہے ' جو وہ کرتے بھی رہے ہیں ' ہر طرح کی آراء کا اظہار کیا جا رہا ہے اور گویا اس پر ایک مباحثہ جاری ہے جو ابھی کچھ عرصہ جاری رہے گا ۔ بیگم نصرت بھٹو کیس کا فیصلہ کرنے والے جج صاحبان میں سے سابق چیف جسٹس آف پاکستان ایس انوار الحق نے گزشتہ چند ماہ کے دوران اخبارات میں چند بیان دیئے ہیں اگر ان کے یہ بیانات درست ہیں ' کہ صدر مملکت جنرل ضیاء الحق کو آئین میں ہمہ گیر بنیادی تبدیلیاں کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا جیسا کہ انہوں نے کی ہیں اور یہ کہ سپریم کورٹ نے صدر کو ایسی تبدیلیوں کے لئے کوئی

Marfat.com

اختیار نہیں دیا ۔ اس کے برعکس یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ صدر ضیاء الحق نے برملا یہ کہا۔ سپریم کورٹ نے ہی نصرت بھٹو کیس میں انہیں آئین میں ترمیم کرنے کا پورا اختیار دیا ہے اور وہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کی ہی تقلید کر رہے تھے لوگ حیران ہیں کہ اس تضاد یا تنازعہ کا حل کون پیش کر سکتا ہے ؟ اگر حکومت اس معاملہ کو سپریم کورٹ میں پیش کرے تو عدالت عظمیٰ کے موجودہ ججوں کے لئے یہ مسئلہ حل کرنا ممکن نہ ہو گا کیونکہ وہ تو پی سی او 1981ء کے حلف کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں ۔ پھر حکومت نے اس معاملہ کو سپریم کورٹ میں پیش بھی نہیں کیا جہاں تک سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ ججوں بشمول جسٹس انوار الحق کا تعلق ہے ' ان کے بارے میں صدر اور ان کے ایک وزیر راجہ ظفرالحق کہہ چکے ہیں کہ چونکہ یہ جج ریٹائر ہو چکے ہیں لہٰذا ان کی رائے ایک عام شہری کی رائے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ۔

کسی لغت یا کسی دوسرے ملک کے آئین کا حوالہ دیئے بغیر اور موٹے موٹے الفاظ کا استعمال کئے بغیر ' میں جسٹس دراب پٹیل کے اس اعتراف سے پوری طرح متفق ہوں جو ہفت روزہ میگ (کراچی) (جنوری 31 تا 6 فروری 1985ء) کے ایک مضمون میں کیا گیا ہے ۔ جسٹس دراب پٹیل نے لکھا ہے کہ "جب ہم نے بیگم نصرت بھٹو کی رٹ درخواست کی سماعت کی تو عدالت کے سامنے دو متضاد فیصلے تھے ۔ میرے خیال میں عدالت نے درمیانی راہ اختیار کی گو ہمارے کچھ کم ہمدرد نقاد یہی کہیں گے کہ سپریم کورٹ نے فیصلہ سناتے وقت بجائے ایک بنچ یا کرسی پر بیٹھتی ' وہ دو کرسیوں کے درمیان گر گئی ۔

بلاشبہ یہ سپریم کورٹ کے سابق سب سے سینئر جج دراب پٹیل کی جانب سے ایک نوع کا اعتراف حقیقت ہے مگر یہ اعتراف اب صورت حال کی سنگینی کو کم نہیں کرتا کیونکہ اہم قومی معاملات پر صاف اور واضح راہ اختیار کرنے کے بجائے سپریم کورٹ تذبذب کا شکار ہو گئی اور دو کرسیوں کے درمیان گر گئی اور اس کے ساتھ ہی قانون کی حکمرانی جمہوریت ' انفرادی آزادیاں ' انسانی حقوق اور تمام اصول بھی اسی تذبذب کا شکار ہو کر دو کرسیوں کے درمیان گر گئے حالانکہ آزاد اور مہذب قوم اپنی سپریم کورٹ سے صراط مستقیم پر چلنے کی صحیح طور پر توقع رکھتی ہے نہ کہ دو کرسیوں کے

Marfat.com

درمیان گر کر قوم کو متذبذب اور بے یقینی کا شکار بنائے جانے کی۔

"کچھ بھی ہو پی سی او 1981ء اور 1985ء کے آئین کے بعد 1973ء کے آئین کی بنیاد مثلاً آزاد عدلیہ' پارلیمانی طرز حکومت' آزاد اور منصفانہ انتخابات' پریس کی آزادی' سیاسی جماعتوں کا وجود' پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کا اختیار وغیرہ سبھی کچھ بری طرح تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ 1973ء کا آئین ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے' مرچکا ہے اور اب اسے دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا پی سی او 1981ء اور 1985ء کا آئین ہی جو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے نافذ کئے ہیں ایسی دستاویزات ہیں جن کے تحت ملک کو چلایا جارہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ چالیس سال گزر جانے کے باوجود آج بھی ملک میں کوئی ایسا قابل عمل آئین نہیں ہے جس میں تمام صوبوں کے حقوق کی ضمانت ہو۔ نہ ایسا آئین موجود ہے جس پر تمام صوبوں میں اتفاق رائے ہے دوسرے الفاظ میں آئینی طور پر ملک چالیس سال پیچھے کی طرف چلا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر نئے آئینی تجزیوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ اگر افہام و تفہیم سے کام نہ لیا گیا۔

Marfat.com

باب دوم

ایک بروقت انتباہ

ایک بلوچ اور دسمبر 1976ء سے مارچ 1981ء تک بلوچستان کے پہلے چیف جسٹس کی حیثیت سے میں چیف جسٹس سندھ ' چیف جسٹس سرحد اور پنجاب کے ساتھ لاکمیشن ' سندھ طاس کے پانی کی تقسیم کے کمیشن اور سپریم جوڈیشل کونسل کا رکن تھا ان تینوں اداروں کے سربراہ پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس ایس انوارالحق تھے ۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح بہت سی کانفرنسوں ' کمیشنوں اور کمیٹیوں کے اجلاسوں کے دوران میں بھی شہریوں کے جمہوری حقوق میں کمی اور عدلیہ کے اختیارات میں تخفیف کو بری طرح محسوس کر رہا تھا ۔ مختلف کانفرنسوں میں جب ممکن ہوتا میں آئینی تبدیلیوں ' اعلیٰ عدلیہ کے لباس اور لبادوں کی شکل و صورت میں تبدیلی اور دوسری قانونی تبدیلیوں کی سختی کے ساتھ مخالفت کرتا رہا جو بلوچستان ہائی کورٹ کے ریکارڈ سے واضح ہے ۔

بدقسمتی سے مجھے اس کام میں دوسرے ہم عصروں کی ضروری حمایت حاصل نہ ہو سکی ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر شخص وقت کے تقاضوں کو ہی ملحوظ رکھے ہوئے ہے ۔ کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ عبوری آئینی حکم نمبر ایک مجریہ 1981ء کی صورت میں ' سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار گری ۔ اس آئینی ترمیم کے پس منظر اور اس کے اثرات پر اسی کتاب میں کسی اور جگہ بحث کی گئی ہے بہر حال میں نے بروقت انتباہ کے طور پر ' خطرات مول لیتے ہوئے ایک مضمون سپرد قلم کیا جو پاکستان پی۔ایل۔ڈی 1980ء کی جلد ایک ' سپریم کورٹ اور جرنل میں صفحہ 111 تا 114 پر شائع ہوا ۔ اس مضمون کا مقصد اعلیٰ حکام ' عام لوگوں ' سیاسی تنظیموں اور عدلیہ کی توجہ مبذول کرانا اور یہ بتانا تھا کہ آنے والے دنوں میں عدلیہ کی آزادی خطرے کی زد میں ہے ۔ یاد رہے کہ یہ مضمون کبھی اشاعت پذیر نہ ہوتا اگر اس کا مصنف ہائی کورٹ کا چیف

Marfat.com

جسٹس نہ ہوتا۔ جونہی یہ مضمون شائع ہوا' مصنف کو چند حضرات جن میں دو ایک جج بھی شامل تھے کی معرفت اعلیٰ حکام کی شدید ناراضگی کا علم ہوا جنہوں نے ایک بار بھی انتخابات کا منہ تک نہیں دیکھا تھا یا شاذو نادر کبھی کامیاب ہوئے مگر اب وہ وزارتوں پر قابض تھے یا دوسرے اعلیٰ مناصب پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ یہ لوگ خود کو جمہوریت کا چیمپئن اور عدلیہ کی آزادی کے محافظ کے طور پر پیش کرنے کے عادی ہو چکے تھے' مگر جب بھی ان کو موقع ملتا ہے وہ آمریت کے دفاع سے کبھی نہیں جھجکتے۔

میرا مضمون یہ ہے۔:

عدلیہ کو ریاست کے دوسرے شعبوں سے آزاد رکھنا۔

10 ویں صدی عیسوی میں خلافت عباسیہ کے دوران ایک فاضل قاضی نے جو یہ کہا تھا کہ " حکومت اور عوام دونوں کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ عدلیہ کو ریاست کے دوسرے شعبوں کے اثر و نفوذ سے آزاد رکھا جائے " آج بھی یہ اصول پاکستان میں بھی بالکل اسی طرح درست ہے' جیسا کہ اس دور میں تھا

از میر خدا بخش بجرانی مری

چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ

ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا " جو شخص قاضی مقرر ہوا ' وہ الٹی چھری سے ذبح ہو گیا " حضور اکرمؐ کے کئی صحابہؓ نے قاضی کا منصب قبول کرنے سے انکار کیا۔ امام ابو حنیفہؒ نے بھی بغداد کے قاضی القضاۃ کا منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ وقت نے زور دیا مگر امام انکار کرتے رہے تو خلیفہ نے ناراض ہوکر امام کو زدو کوب کرنے کا حکم دے دیا تاکہ تشدد کے ذریعے امام کو یہ منصب قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ امام نے شاہی تشدد بڑے ہی صبر و تحمل سے برداشت کیا مگر قاضی کا منصب قبول کرنا پسند نہ فرمایا۔ اگلے وقتوں میں کئی اور اصحاب نے بھی قاضی کا منصب قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ درحقیقت قاضی کا منصب اس عزم کے ساتھ قبول کرنا کہ انصاف قائم کیا جائے ایک پسندیدہ اقدام ہے اگرچہ اس سے انکار اس سے بھی زیادہ قابل تعریف ہے۔ کیونکہ یہ ایک عظیم ذمہ

Marfat.com

داری ہے ۔ باوجود کہ کوئی شخص یہ سوچ کر قاضی کا منصب قبول کرتا ہے کہ وہ انصاف کا بول بالا کرنے میں کامیاب رہے گا لیکن وہ غلطی بھی تو کر سکتا ہے ۔ بعد میں جب اسے غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے مگر اسے امداد میسر نہیں آتی ۔ چنانچہ قاضی کا منصب قبول کرنے سے انکار سب سے زیادہ قابل تحریم ہے ۔ تا آنکہ کوئی ایسی ہستی موجود نہ ہو جو یہ عظیم ذمہ داری ادا کر سکے ۔ اس صورت میں یہ منصب قبول کرنا انسان کے حقوق کا تحفظ اور دنیا کو نا انصافی سے پاک کرنا ہوتا ہے ۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ قاضی کے منصب کی دل میں خواہش کریں نہ زبان سے اس کا اظہار کریں کیونکہ رسول اللہ نے فرمایا ہے "جو شخص قاضی کے منصب پر تقرر کوشش کے ساتھ حاصل کرتا ہے ' اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا ' لیکن جس نے کسی جبر کے تحت ' مجبور ہو کر یہ منصب سنبھالا آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہو گا جو قاضی کے فرائض کی ادائیگی میں اس کی رہنمائی کرے گا ۔ کیونکہ جو شخص اس منصب کی خواہش کرتا ہے ' خود پر اعتماد کا اظہار کرتا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے ۔ مگر اس کے برعکس جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے ۔ اسے اللہ تعالیٰ خاموشی کے ساتھ ایسا علم عطا فرمائے گا ' جو قضاء کے منصب کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے "

یہ کہنا کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہو گی کہ فقہ میں دور اولیں سے ہی عدلیہ کے تقدس ' آزادی اور انتظامیہ سے اس کی علیحدگی کو تسلیم کیا گیا ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں کوئی تحریری آئین موجود نہ تھا جس میں ریاست کے تینوں بڑے شعبوں ---- مقننہ ' انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات اور فرائض کا تعین کیا گیا ہو جیسا کہ ہمارے دور میں دنیا کے تمام مہذب ممالک میں کیا گیا ہے ۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لئے میں ایک کتاب سے اقتباس پیش کرتا ہوں جو ایک ہزار سال سے زائد عرصہ قبل عباسی خلافت کے دور میں ایک نامور قانون دان اور مشہور قاضی نے لکھی تھی جن کا خاندان کئی نسلوں سے علم و فضل اور قضا کا سزاوار تھا ۔ یہ بغداد کے قاضی المحسن بن علی ' بن محمد بن داؤد تھے انکا تعلق تنوخ قبیلہ سے تھا ۔ وہ بغداد کے قاضی علی کے فرزند تھے وہ 940ء میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور 994ء میں

Marfat.com

بغداد میں وفات پائی ۔ قاضی المحسن بن علی کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے یہ کتاب 971ء میں لکھنی شروع کی اور انہیں اس کی تکمیل میں 20 سال صرف کرنا پڑے یہ کتاب ڈی ۔ ایس فارگولیوتھ نے عربی سے انگریزی میں ترجمہ کی اور اسے رائل ایشیاء ٹک سوسائٹی لندن نے 1922ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا عنوان "میسوپوٹیمیا کے ایک جج کی باتیں" ہے ۔ کتاب میں مذکورہ متعدد واقعات کا عینی شاہد ہونے کے علاوہ فاضل مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کا بیشتر مواد اس دور میں بغداد کے دانشوروں کی مجالس سے حاصل کیا ہے جن میں مصنف کے والد اور نامور قاضی علی بن محمد بھی شریک ہوا کرتے تھے ۔ مصنف کے مطابق وہ ان مجالس کی بات چیت کے نوٹس ایک کتاب میں درج کر لیا کرتے تھے ۔ کتاب کی تصنیف کی وجوہ بیان کرتے ہوئے قاضی المحسن بن علی نے لکھا ہے " سالہا سال گزر گئے اور وہ دانشور جنہوں نے مجھے کئی موضوع فراہم کئے تھے ایک ایک کر کے آخرت کو سدھار گئے ۔ ان کی طرح کے خال خال لوگ باقی رہ گئے ان کی موت سے تو وہ سب کچھ ضائع ہو جاتا جو انہوں نے دانشوروں کی مجالس میں بیان کیا تھا یا پھر کوئی حکمت و علم کی ان باتوں کو زبانی یاد کر لیتا " (میسوپوٹیمیا کے ایک جج کی باتیں صفحہ 5)

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کتاب کے صفحہ 123 پر فاضل مصنف نے لکھا ہے " اصول کلیہ ۔ : کسی ریاست میں عدلیہ کی تباہی کا مطلب ہے اس ریاست کی تباہی"

فاضل مصنف مزید لکھتا ہے " مجھے ابو ابن العیاش نے بتایا ' ہمارے دور میں خلافت عباسیہ کا جو عنصر سب سے پہلے تباہی سے دوچار ہوا وہ عدلیہ تھی ۔ کیونکہ ابن الفرات نے عدلیہ کو پستی سے ہمکنار کر دیا تھا ۔ اس نے عدلیہ میں مختلف مناصب پر ایسے لوگوں کو فائز کر دیا جو نہ تو علم سے بہرہ ور تھے اور نہ ہی کسی خاندانی روایت کے حامل تھے البتہ انہوں نے ابن الفرات کو کچھ رقوم فراہم کرنے کی ضمانت دے دی تھی ۔ اس کے چند ہی سال بعد وزارت بھی اس حشر سے دوچار ہوئی کیونکہ وزارتوں کے منصب پر بھی نا اہل لوگ براجمان ہو گئے تھے یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری کی چوتھی دہائی میں متقی کی وزارت ابو العباس اصفہانی نامی ایک کلرک کو سونپ دی گئی ۔

Marfat.com

یہ شخص عقل و خرد سے عاری اور عزت و وقار سے بالکل بے بہرہ تھا ایک مرتبہ میں اس سے ملنے گیا۔ دربان اندر اس کے پاس گیا اور اسے بتایا " ابن عیاش دروازے پر کھڑا ہے " میں نے اسے پردے کے پیچھے جواب دیتے سنا " اسے اندر آنے دو " یہ سن کر میں نے دل میں کہا یا اللہ اب وزارت اتنی گر چکی ہے کہ ایسے لوگ اس پر فائز ہیں۔

جی ! وہ اس وقت تک سواری پر نہ نکلتا جب تک اس کے آگے رئیس شہر ابن حدوبنا نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ میں نے ابن خلد سٹریٹ میں دیکھا کہ ایک بندر والا تماشہ دکھا رہا ہے۔ اس کے ارد گرد لوگ حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ بندر والے نے بندر سے پوچھا۔ "کیا تم بساطی بننا پسند کرو گے ؟" بندر نے سرہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ بندر والے نے پھر پوچھا۔ "کیا تم عطار بننا پسند کرو گے؟" بندر نے پھر اثبات میں سر ہلایا بندر والا اسی طرح مختلف پیشوں کے نام لیتا رہا اور بندر اثبات میں سرہلاتا رہا۔ آخر میں بندر والے نے پوچھا۔ کیا تم وزیر بننا پسند کرو گے ؟ بندر نے فوراً نفی سرہلایا اور ساتھ ہی اس نے چیخنا اور مالک سے دور بھاگنا شروع کر دیا اور لوگ بندر کی اس حرکت پر زور زور سے ہنسنے لگے۔

فاضل مصنف کتاب کے صفحہ 124 پر لکھتا ہے " وزارت کے زوال کے بعد خلافت کا زوال شروع ہوا اور اب وہ اس حال کو پہنچ چکی ہے جس میں ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ خلاف عباسیہ کو زوال ہی اس لئے آیا کہ اس کی عدلیہ تباہ ہو چکی تھی۔ ابن الفرات نے عدلیہ کے زوال کی ابتداء کی جب اس نے ابو امیہ الخواص کو بصرہ کا قاضی مقرر کردیا یہ ایک غیر معروف شخص تھا۔ یہ ایک بساطی تھا۔ ابن الفرات وزیر مقرر ہونے سے قبل اس کے گھر میں خلیفہ کے خوف سے چھپا رہا۔ قاضی کی دیانت اور استقامت کے بارے میں جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہونی چاہئے۔ فاضل مصنف نے کتاب کے صفحہ 128 پر ایک مثال پیش کی ہے۔ "مجھے قاضی عبدل ابن عیاش نے بتایا کہ اسے کسی اور نے بتایا ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ قاضی القضاۃ قاضی ابو ہیزم کے ہم رکاب تھا ایک شخص قاضی بو ہیزم کے پاس آیا اور اپنے شہر میں کسی شخص کو قاضی مقرر کئے جانے کی تعریف کی کیونکہ اس کے بقول وہ ایک دیانتدار

Marfat.com

شخص تھا ۔ ابو ہیزم نے چلا کر اس شخص سے کہا " خاموش ہو جاؤ کیا کہہ رہے ہو تم ۔ کیا تم ایک قاضی کے بارے میں کہہ رہے ہو کہ وہ دیانت دار شخص ہے ۔ یہ کسی پولیس افسر کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک دیانت دار شخص ہے لیکن ایک قاضی ایسی تعریف و توصیف سے بالاتر ہوتا ہے " ہم آگے بڑھتے رہے مگر اس شخص نے سلسلہ کلام جاری رکھا

قاضی ابوہیزم سخت پریشان ہو گئے میں نے ان سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے ۔ انہوں نے جواب دیا ۔ : میں نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ میں ایسی بات سننے کے لئے زندہ رہوں گا ۔ کتنا غلط وقت آگیا ہے اور ہمارا پیشہ (قضا) تو غارت ہو گیا اس پیشے میں ایسے لوگ شامل ہو گئے کہ ان کی موجودگی میں ایک دیانتدار قاضی کی دیانت و استقامت کی تعریف کرنا ضروری ہو گیا ہے ۔ قبل ازیں لوگوں کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ فلاں قاضی دیانت دار ہے ۔ لیکن ایساتو ۔۔۔۔ فلاں کے قاضی کا منصب سنبھالنے سے پہلے تھا ' قاضی ہیزم نے کسی کا نام نہ لیتے ہوئے محض اشارہ کیا ۔ میں نے یہ کہانی سنانے والے سے پوچھا قاضی ہیزم کس کا نام لینا نہیں چاہتے تھے تو اس نے انکار کر دیا لیکن جب میں نے اصرار کیا تو اس نے بتایا کہ یہ قاضی ابو عمر تھا" ۔

قانون بازیچہ اطفال نہیں اس کی سربلندی ' اور یہ کہ ہر کسی کو خدا کے حکم کو اس کے بندوں کے حکم پر ترجیح دینی چاہئے ' اس کے متعلق فاضل مصنف نے صفحہ 129 پر ایک واقعہ بیان کیا ہے ۔ " مجھے یہ واقعہ ابوالحسین علی بن قاضی ابو طالب محمد بن قاضی ابو جعفر ابن البہلول نے سنایا ۔ مادر ملکہ (خلیفہ المتقدر کی والدہ) نے میرے دادا کو ایک وقف جائیداد کی دستاویز لانے کا حکم دیا جو ملکہ نے خریدی تھی ۔ یہ دستاویز قاضی کے دفتر میں محفوظ تھی ۔ ملکہ اس دستاویز کو لے کر پھاڑ دینا چاہتی تھی تاکہ وقف ہی کالعدم ہو جائے ۔ میرے دادا جو معاملہ سے بے خبر تھے یہ دستاویز لے کر محل میں آ گئے اور ملکہ کی کنیز کو بتایا کہ وہ ملکہ کے حکم کے مطابق دستاویز لے آئے ہیں ۔ اب ان کے لئے کیا حکم ہے ؟ انہیں بتایا گیا کہ مادر ملکہ یہ دستاویز حاصل کرنا اور اپنے پاس رکھنا چاہتی ہیں ۔ اس پر سارا معاملہ میرے دادا کی سمجھ میں آگیا انہوں

Marfat.com

نے مادر ملکہ کی کنیز خاص سے کہا۔ "ام موسیٰ میری طرف سے ملکہ معظمہ کو بتا دو ان کا حکم ناقابل عمل ہے۔ میں مسلمانوں کے شعبہ عدل کا نگران اور محافظ ہوں۔ یا تو وہ مجھے یہ اختیار دیں کہ میں مسلمانوں کی اس امانت کا پوری طرح تحفظ کر سکوں یا پھر مجھے اس منصب سے بر طرف کر کے وہ خود اس پر قابض ہو جائیں۔ پھر وہ جو چاہیں کریں۔ وہ جو چیز چاہیں اپنے پاس رکھیں اور جو چاہیں قاضی کے دفتر میں پڑا رہنے دیں یقیناً موجودہ صورت میں کسی دستاویز کو میرے ذریعے چوری نہیں کیا جا سکے گا خواہ مجھے ننگی تلوار دکھا کر ہی ایسا کرنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے پھر قاضی صاحب اٹھے دستاویز اپنے ساتھ لی اور گھر چلے گئے۔ انہیں یہ شبہ تک نہ تھا کہ انہیں بر طرف کر دیا جائے گا۔ پھر وہ ابن الفرات کے گھر گئے جو اس وقت وزیر سلطنت تھے۔ انہوں نے سارا واقعہ وزیر سلطنت کو سنایا۔ وزیر نے کہا کہ بہتر تھا کہ تم ملکہ کو کوئی جواب نہ دیتے اور معاملہ میرے علم میں لاتے تاکہ میں یہ معاملہ سنبھال لیتا۔ اب تم یقیناً برطرف کردیئے جاؤ گے۔ ادھر کنیز نے مادر ملکہ کو قاضی کا پیغام دیا۔ مادر ملکہ نے اپنے بیٹے خلیفہ المقتدر سے شکایت کی ایک دن دربار عام کے روز المقتدر نے قاضی سے ذاتی طور پر بات کی۔ قاضی نے خلیفہ کو سارا معاملہ بتایا اور پہلے کی طرح مستعفی ہونے کی پیشکش کی۔ تاہم مقتدر نے کہا۔: تم قاضی کے منصب کے صحیح حقدار ہو۔ اللہ کے فضل و کرم کے ساتھ اپنے منصب پر قائم رہو۔ یہ اندیشہ نہ کرو کہ اس واقعہ کی بدولت ہمارے نزدیک تمہاری نیک نامی کو کوئی گزند پہنچے گا۔ ہمیں بتایا گیا کہ جب مادر ملکہ نے دوبارہ خلیفہ سے یہی بات کہی تو خلیفہ نے اپنی والدہ سے کہا۔: قانون کو بازیچہ اطفال نہیں بنایا جا سکتا۔ ابن البہلول ہمارا خیرخواہ اور ہمارے خاندان کا بہی خواہ ہے۔ وہ ایک نیک شخص ہے جس کی دعائیں خدا منظور کرتا ہے۔ اگر آپ کا مطالبہ قابل پذیرائی ہوتا تو وہ یقیناً اسے پورا کردیتا۔ مادر ملکہ نے اپنے سیکرٹری ابن عبدالحمید سے اس معاملہ کی چھان بین کے لئے کہا۔ جب سیکرٹری نے یہ سنا کہ میرے دادا نے کیا کہا تھا تو وہ رونے لگا۔ وہ ایک نیک ' دیانتدار پرانا حاجب تھا۔ اس نے کہا " اب میں سمجھ گیا ہوں کہ مادر ملکہ کا خاندان اور مسلمانوں کا خلیفہ ہمیشہ حکمران رہیں گے کیونکہ ان کا قاضی ایک نیک اور خداترس بزرگ ہے جس نے مادر ملکہ کے

Marfat.com

مقابلے میں قانون کو اہمیت اور فوقیت دی ' اور جہاں اللہ کامعاملہ آیا اس نے کسی سرزنش یا سزا کی پرواہ نہیں کی ۔ آپ جو جائداد خرید رہی ہیں اس کی قیمت بھلا کیاہو گی ؟ فرض کیجئے آپ کو وہ دستاویز ہاتھ لگ جاتی اور آپ اسے پرزے پرزے کر کے پھینک دیتیں تو کیا ہوتا ۔ شہر کا ہر فرد اس بارے میں جانتا ہے اور یوں اللہ تعالیٰ جو اوپر ہے ' سب کچھ دیکھنے اور جاننے والا ہے اس پر مادر ملکہ نے کہا ۔ : "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ غیر قانونی تھا " تو ابن عبدالحمید نے جواب دیا " یہ اللہ کی ملکیت کے امانتداروں کے پاس سند ہے " اس نے ملکہ کو مزید بتایا کہ وقف کی دستاویز کو ضائع کر دینے سے بھی اس زمین کی خرید قانون کے مطابق جائز نہ ہو پاتی ' پھر وقف کی دستاویز کو پھاڑنا بھی تو ایک جرم ہے ۔ مادر ملکہ نے اپنی رقم واپس لے لی اور زمین کا سودا منسوخ کر دیا ۔ مادر ملکہ نے یہی نہیں کیا بلکہ اس نے میرے دادا سے معذرت بھی کی اور اس کی وجہ سے یہ معاملہ دربار میں بھی پیش ہوا ۔ میرے دادا نے یہ کہانی سنا کر مزید کہا "اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے احکامات کو اس کے بندوں کے احکامات پر فائق رکھے ' ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اسے بندوں کی طرف سے کی جانے والی کسی بھی برائی سے محفوظ رکھتا ہے "۔

مگر پاکستان میں چند سچے قلمکاروں کے سوا ' جنہوں نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے وضع کردہ اصولوں کے بارے میں ثابت قدمی سے کام لیا ۔ سیاسی موقع پرستوں ' مصنوعی ماہرین قانون اور نام نہاد دانشوروں نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ان اصولوں کو مسخ کر کے بہت کچھ لکھا ہے اور اپنی تحریروں سے عام لوگوں کے ذہنوں میں شدید انتشار پیدا کیا ہے ۔ اس کے برے نتائج اور بد اثرات سبھی محسوس کر رہے ہیں روایتی تعریف و توصیف اور بظاہر خوشنما اصولوں سے قطع نظر جن پر کم ہی عمل کیا جاتا ہے ' میں موقع کی مناسبت سے قائداعظم محمد علی جناحؒ اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان کی بعض تقریروں کا حوالہ دوں گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے ۔

26 مارچ 1940ء کو چٹاگانگ میں ایک عوامی استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا ۔ : آپ نے یہ کہہ کر میرے اور لاکھوں دوسرے مسلمانوں کے

Marfat.com

جذبات کی ترجمانی کی ہے کہ پاکستان کی بنیاد سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم پر رکھی جانی چاہئے جو انسانی اخوت اور مساوات پر زور دیتا ہے ۔ اسی طرح آپ نے سب کے لئے مساوی مواقع کا ذکر کر کے میرے خیالات کی ترجمانی کی ہے ۔ ترقی کے یہ اہداف پاکستان میں وجہ تنازعہ نہیں ہیں ۔ کیونکہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا' اس کے لئے جدوجہد کی اور پاکستان حاصل کیا تاکہ ہم اپنے معاملات اپنی فہم و فراست اور روایات کے مطابق چلانے میں جسمانی اور روحانی طور پر آزاد ہوں ۔ اخوت ' مساوات اور انسانی بھائی چارہ ہمارے مذہب ' ثقافت اور تہذیب کی بنیاد ہیں ۔ ہم نے پاکستان کی جنگ ہی اس لئے لڑی ہے کہ ہمیں برصغیر میں بنیادی حقوق سے محرومی کا خطرہ درپیش تھا ۔"

(قائداعظم محمد علی جناح" کی بطور گورنر جنرل تقریر میں 1947 تا 1948ء
پاکستان پبلیکیشنز کراچی صفحہ 103)

پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان نے 8 مئی 1950ء کو نیویارک کے ٹاؤن ہال میں تقریر کرتے ہوئے نظریہ پاکستان کی وضاحت کی ۔ مجھ سے اکثر ایک سوال پوچھا جاتا ہے کہ نظریہ پاکستان کیا ہے ؟ میں آپ کو چند ایک مگر واضح الفاظ میں بتانے کی کوشش کروں گا کہ نظریہ پاکستان کیا ہے ۔ ہم مسلمان اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ وہی احکم الحاکمین ہے ۔ پاکستان کے ایک بڑے شہر میں ایک تعلیمی ادارہ ہے جو آپ کے خدا ترس ہم وطنوں نے تعمیر کیا ہے اس کی ڈیوڑھی پر سنگ مرمر کی ایک تختی نصب ہے جس پر یہ الفاظ درج ہیں " اس عمارت کی تعمیر میں اگر خدائی مشیت شامل نہ ہوتی تو اسے تعمیر کرنے والوں کی محنت رائیگاں جاتی " ہم انسانوں کے بنیادی حقوق کے قائل ہیں اور نجی ملکیت کا حق تسلیم کرتے ہیں ۔ ہم اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ عوام پر ان کے آزادانہ طور پر منتخب نمائندوں کی حکومت ہونی چاہئے ۔ ہم تمام شہریوں کی مساوات پر یقین رکھتے ہیں ۔ اس میں مسلم یا غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ۔ سب کے لئے مساوی مواقع اور سب کے لئے قانون کے سامنے مساوات بھی ہمارے بنیادی عقیدہ میں سے ہے ۔ ہم اس بات پر بھی پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ہر فرد کو' خواہ وہ مرد ہو یا عورت ' اپنی محنت کا پھل ملنا چاہئے ۔

Marfat.com

ایک آخری بات ہم اس بات پر بھی پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ہم میں سے جس کو اللہ تعالٰی نے دولت ، تعلیم اور اچھی صحت سے نوازا ہے اس پر ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو اس معاملہ میں اس سے کم تر ہیں ان اصولوں کو ہم اسلامی طرز حیات کا نام دیتے ہیں ۔ آپ ان کو جو نام چاہیں دے سکتے ہیں ۔ (" پاکستان ایشیا کا دل " وزیراعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کی تقریریں --- دورہ امریکہ و کینیڈا مئی جون 1950ء شائع شدہ نیشنل بک فاؤنڈیشن صفحات 32-33)

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں عظیم فلسفی اور شاعر ڈاکٹر محمد اقبال ؒ کی ، جو کسی سے کم بانی پاکستان نہیں ہیں ، ایک رباعی پیش کرتا ہوں۔ یہ رباعی ان کی کتاب " پیام مشرق " سے لی گئی ہے ۔ جس کا ترجمہ فیض احمد فیض نے کیا ہے۔

سکندر کا علم باقی نہیں ہے
سپہ ، دولت ، حشم باقی نہیں ہے
ہیں قومیں بادشاہوں سے قوی تر
کہ ایراں ہے ، پر جم نہیں ہے

Marfat.com

باب سوم

قانون کی حکمرانی کی موت
(غیروں کا نقطۂ نظر)

1947ء میں قیام پاکستان کے بعد ضرورت تو اس امر کی تھی کہ برطانوی دور میں مستحکم ہونے والے اداروں ' قانون کی حکمرانی ' پارلیمانی ' وفاقی یا نیم وفاقی نظام جیسا کہ قرارداد پاکستان 1940ء میں اشارہ دیا گیا تھا ' جمہوریت اور اس کے ناگزیر لوازمات مثلاً عدلیہ ' ایک فرد ایک ووٹ ' آزادانہ انتخابات ' پریس کی آزادی بنیادی انسانی حقوق کا احترام اور چھوٹے صوبوں کے اقتصادی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کو مزید مضبوط اور یقینی بنایا جاتا اور نیا آئین ممکن حد تک کم از کم عرصہ میں تیار کیا جاتا جیسا کہ ہمارے ہمسایہ بھارت نے کیا ۔ اس کے بجائے ملک کو نہ ختم ہونے والی قانونی اور آئینی کشمکش کے سپرد کر دیا گیا ۔ مسٹر محمد علی جناح کی موت کے فوراً بعد بیوروکریسی فوج اور بڑے تاجروں کے درمیان ایک " ناپاک معاہدہ " وجود میں آگیا جس کے سربراہ ایک مالیاتی ماہر تھے ۔ یہ معاہدہ پاکستان کے عوام پر مسلط کر دیا گیا ۔ یہ مالیاتی ماہر' یادش بخیر' ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان تھے

ملک کے حکمرانوں نے اخبارات کے ذریعے ایک مہم چلا کر سیاستدانوں اور سیاسی تنظیموں کو قابل نفرت قرار دیا اور ان کی اہمیت کم کی گئی۔ مسٹر جناح کی موت کے بعد آنے والی حکومت نے مسلم لیگ کو عوام پر ٹھونس دیا حالانکہ اس جماعت کی نہ تو قیادت باقی رہی تھی نہ ہی اس کے سامنے کوئی واضح پالیسی' کوئی پروگرام یا کوئی ہدف تھا۔

جلد ہی مسلم لیگ کی دوسرے اور تیسرے درجہ کی قیادت کو جن میں سے بیشتر موقع پرست' تنگ نظر اور تنگ ذہن تھے ۔ وزارتوں کی کھلے عام تقسیم اور دوسرے

Marfat.com

مالی فوائد کے چکر میں ڈال دیا گیا۔ اس بات کا کوئی خیال نہ رکھا گیا کہ اس رویہ کی ملک کو کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی ۔ چنانچہ تیس سال سے بھی کم عرصہ میں ملک کا اکثریتی صوبہ علیحدہ ہو گیا جو اب بنگلہ دیش ہے ۔ اس کے علاوہ ملک کو چھ مارشل لاء حکومتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کی تفصیل یہ ہے ۔

1۔ 1953ء مرکزی حکومت نے مارشل لاء نافذ کر دیا ۔

2۔ 1958 تا 1962ء صدر اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان کا مارشل لاء ۔

3۔ 1969 جنرل ایم یحیٰ خان نے جنرل ایوب خان کو معزول کر کے مارشل لاء لگا دیا

4۔ 1971 ' 1969 کی مارشل لاء انتظامیہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے تحت قائم رہی

5۔ اپریل 1977ء وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے آئین 1973 کی دفعہ 245 کے تحت متعدد بڑے شہروں میں " مقامی مارشل لاء " نافذ کیا ۔

5۔ جولائی 1977ء چیف آف آرمی سٹاف جرنل ضیاء الحق نے پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا ۔

حکمران گروہوں کو چونکہ عوام کے مفاد سے کوئی سروکار نہ تھا لہٰذا انہوں نے پہلے تو چار صوبوں مشرقی بنگال ' بلوچستان ' سندھ اور سرحد کا تشخص ختم کیا ۔ گویا اسی طرح عوام راتوں رات متحد ہو جائیں گے ۔ اور ان کے تمام مسائل از خود حل ہو جائیں گے اسی طرح قومی اسمبلی میں اسلامی اخوت کے نام پر مشرقی بنگال کی 56 فیصد اکثریت کو قانون کے ذریعے " برابری " میں تبدیل کر دیا گیا ۔ جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی ۔ اس غنڈہ گردی پر مسلم لیگ کے سوا جو غلام محمد کے بعد آج تک ہر حکومت کے ایک محکمہ کے طور پر چلائی جاتی رہی ہے چاروں صوبوں کی سیاسی جماعتوں نے بڑا شور مچایا اس پر سینکڑوں سیاستدانوں کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور ملک کے دونوں حصوں میں سیاسی ہنگاموں کے دوران بیسیوں طلباء کی جانیں ضائع ہوئیں ۔

چونکہ بیوروکریسی ' فوج اور بڑے تاجر آج کی طرح اس وقت بھی بیلٹ باکس ' آزادانہ انتخابات اور نمائندہ حکومت کے ذریعے عوام کی حکمرانی سے خوفزدہ تھے ۔ لہٰذا

Marfat.com

انہوں نے ایک نیا گمراہ کن نعرہ اور نام نہاد اصطلاح " نظریہ پاکستان " گھڑی حکمرانوں نے اس نام نہاد اصطلاح کو عام کیا اور پھر اس پر "عمل درآمد" کرایا جس کے بعد ملک میں وحدانی طرز کی حکومت قائم کر دی گئی ۔ تمام اختیارات مرکزی حکومت میں مرتکز کر دیئے گئے ۔ چھوٹے صوبوں کے حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا ۔ اقلیتوں اور خواتین کے حقوق کو پامال کیا گیا ۔ وحدانی طرز حکومت کے یہ کرتا دھرتا وہی لوگ تھے ۔ جنہوں نے پاکستان میں ہندو کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں ' وزارتی عہدوں ' لائسنسوں ' پرمٹوں سے ہاتھ رنگے تھے ۔ انہوں نے نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کے لئے بھی وزارت خارجہ ' اقوام متحدہ کے اداروں بنکوں ' سول سروس ' مسلح افواج اور صنعتوں میں اعلیٰ مناسب پر ملازمتیں پکی کر لی تھیں ۔ اس طرح انہوں نے یونیورسٹی سے نکلنے والے نوجوانوں کے لئے کلرکی کی معمولی ملازمتوں کے سوا کچھ نہ چھوڑا ۔ اس سے نوجوانوں میں مایوسی پھیلی جس کے باعث ان میں سے بہت سے ملک ہی چھوڑ گئے ۔ اور بیرونی ممالک میں روزگار حاصل کیا ۔ ہم وطنوں کی ان صعوبتوں کا ذکر ہی تکلیف دہ ہے ۔ بد قسمتی سے ہماری اکثر دینی تنظیمیں بھی اس لوٹ کھسوٹ میں شامل ہو گئیں اور روز مرہ زندگی کو دین کے مطابق گزارنے میں عوام کی رہنمائی کی بجائے یہ دینی تنظیمیں سیاسی جماعتوں کی شکل اختیار کر گئیں ۔

اخبارات حکومت کے کاسہ لیس بن گئے اس کے لئے ان کی اپنی مجبوریاں تھیں جو بنیادی طور پر مالی نوعیت کی تھیں صرف نوجوان صحافیوں کا ایک گروپ ایسا تھا جو ان خامیوں سے مبرا تھا لیکن انہیں نہایت ذلت آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑا ۔ فوجی عدالتوں کے حکم پر ان میں سے کئی ایک کو سر عام کوڑے مارے گئے ۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے حقائق رپورٹ کئے اور اپنی دیانتدارانہ رائے کا اظہار کیا ۔ اخبارات کے کسی مالک کو اسی نوع کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ ان میں سے بہت سوں نے تو زندگی کے سفر کا آغاز چھیتھڑوں میں کیا تھا پھر وہ دولت میں کھیلنے لگے جو انہوں نے ملک کے عوام سے حاصل کی تھی ۔ اتنی جلدی اتنی دولت حاصل کرنا معجزہ سے کم نہیں اور ایسے معجزے صرف پاکستان میں رونما ہو سکتے ہیں ۔ البتہ اب دولت و حشمت کے حصول کے نئے نئے اور تیز تر طریقے دریافت ہو گئے ہیں جو اسلحہ

Marfat.com

کی اندرون ملک اور بیرونی ممالک کو حشیش چرس کی سمگلنگ ہے ۔ ان کاموں میں فوجی ' وکلاء ' اداکار ' اداکارائیں اورحال ہی میں لاہور کا ایک جج ملوث پائے گئے ہیں اور انہیں سزائیں بھی بھگتنا پڑی ہیں ۔ یہ جج صاحب انگلستان میں رنگے ہاتھوں گرفتار کئے گئے تھے ۔

مسٹر الطاف حسین بنگالی تھے اور انگریزی اخبار " ڈان " کے ایڈیٹر تھے ان کے سوا روزنامہ ڈان کراچی جس کی بنیاد قائداعظم نے رکھی تھی ' کی کارکردگی بھی دوسرے اخبارات سے کچھ زیادہ بہتر نہیں رہی ۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ آخر کار مسٹر الطاف حسین بھی ایوب خان دور میں وزارت کی کشش سے جان نہیں بچا سکے اور اخبار " ڈان " کی ادارت چھوڑ دی ۔ حالانکہ اخبار پاکستان کے عوام کے حقوق کے تحفظ کے لئے نکالا گیا تھا ۔ تاہم بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے تحت شاید یہ اخبار مجبور ہوگیا کہ اپنے اداراتی کالموں میں کبھی کبھار بعض سلگتے ہوئے سوالات اٹھائے ۔ 10 مارچ 1987ء کو " ڈان " میں ایک اداریہ " اتحاد اور تنوع کے متضاد مطالبات " کے عنوان سے شائع ہوا ۔ میں اس کا اقتباس پیش کرتا ہوں ۔

"ہمیں چھوٹے صوبوں میں پھیلی ہوئی بے چینی کے اسباب کا سراغ لگانے کی جرات مندانہ کوشش کرنی چاہئے ۔ فیصلے کرنے اور ان پر عمل درآمد میں ضرورت سے زیادہ مرکزیت جو تمام آمرانہ اور فوجی حکومتوں کا خاصہ ہوتی ہے چھوٹے صوبوں میں یہ احساس پیدا کرنے کا سبب بنی ہے کہ وہ وفاق کے معاملات میں برابر کے حصہ دار نہیں ہیں ۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ہمارے ہاں نہ صرف فوج اور سول بیورو کریسی میں ' بلکہ بڑے صنعتکاروں دائیں بازو کے بعض حلقوں اور دینی تنظیموں میں بھی مرکزیت پسندوں کی بڑی تعداد موجود ہے ۔ ضرورت سے زیادہ مرکزیت اور آمرانہ نظام حکومت نے ہرطرح کے خیالات اور نظریات کے فروغ کے لئے سازگار ماحول فراہم کیا ہے ۔ نیم وفاق ' سندھو دیش اور قومیتوں کے نعرے اسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ ایک " کثرتی معاشرہ " میں توازن قائم رکھنے اور اتحاد و تنوع کے متضاد دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لئے جس نظام کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف وفاق ہی فراہم کر سکتا ہے اور اس نظام کی کامیابی کے لئے آزاد ' آئینی اور جمہوری سیاسی

Marfat.com

ماحول کی ضرورت ہوتی ہے ۔ سماجی اور معاشی مسائل کے حل کے لئے علیحدگی کوئی علاج نہیں بنگلہ دیش کی مثال ہمارے سامنے ہے بلکہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے تمام صوبوں کی طرف سے یکساں نوعیت کی شعوری کوششوں کی ضرورت ہے یہ وقت ہے کہ مسائل پر ' قومی سطح پر بحث مباحثہ کیا جائے ۔ تمام سطحوں پر شکایات کا تعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ شکایات کہاں کہاں پیدا ہوئی ہیں ۔ مرکزیت میں جو مفاد پرست عناصر ہیں ان کا سدباب کیا جائے اور قومی سطح پر اتفاق رائے پیدا کیا جی تا کہ اتحاد و تنوع میں قومی مفادات کے مطابق توازن پیدا کیا جاسکے ۔ اس کے ساتھ ہمیں ان نعروں اور نظریات سے بھی احتراز کرنا ہو گا جو فی الوقت تو بڑے پر کشش اور مفید نظر آتے ہیں لیکن بالاخر سخت فساد کا موجب ہوتے ہیں۔"

عام قارئین کو یہ موقع فراہم کرنے کے لئے کہ وہ خود یہ اندازہ لگا سکیں کہ 1947ء سے 1977 تک 30 سال کے دوران پاکستان کے عوام کو کس طرح رفتہ رفتہ مگر تسلسل کے ساتھ ' ان کے بنیادی جمہوری حقوق سے محروم کیا گیا ہے جو پاکستان کے آزاد شہریوں کے طور پر ان کو حاصل تھے ۔ چنانچہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ برائے پاکستان 1981ء کا خلاصہ جو ایک غیر جانبدارانہ دستاویز ہے پیش کرتا ہوں۔

Marfat.com

سیاسی اور آئینی ارتقاء 1947-1977

1947ء میں جب قیام پاکستان عمل میں آیا تو برصغیر میں مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت مسلم لیگ ہی تھی (گو یہ جماعت 1906 میں قائم ہوئی تھی) اس کا سب سے بڑا مطالبہ ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام تھا۔ 1947ء میں یہ مطالبہ پورا ہو جانے کے بعد مسلم لیگ کی پالیسیوں کی مخالفت کو آسانی سے مملکت کی مخالفت قرار دیا جاسکتا تھا۔ خاص طور پر اگر کوئی ایسا گروپ مسلم لیگ کی پالیسیوں پر تنقید کرتا جس نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی، تو اسے "ملک دشمن سرگرمی" قرار دے دیا جاتا چنانچہ یکے بعد دیگرے کئی حکومتوں نے یہی وتیرہ اپنایا۔ نو آزاد مملکت میں جمہوری سیاسی ڈھانچہ کا ارتقاء نہایت ست رفتاری سے ہوا۔ 1973ء میں پاکستان کو پہلا جمہوری آئین ملا جسے ایک براہ راست منتخب اسمبلی نے مدون کیا تھا۔ ملک میں سیاسی جماعتوں اور سیاسی ڈھانچہ کے ارتقاء میں بار بار اور لمبے عرصے کے لئے نافذ ہونے والے مارشل لاء سے خلل پڑتا رہا۔ قیام پاکستان کے بعد اب تک ملک میں چھ بار مارشل لاء کا نفاذ ہو چکا ہے۔ مارشل لاء کے تحت سیاسی جماعتوں کو اکثر کالعدم قرار دیدیا گیا اور اخبارات پر سخت سنسر عائد کیا گیا۔ جب مارشل لاء اٹھایا جاتا تو عموماً سیاسی جماعتوں کو بعض پابندیوں کے ساتھ کام کرنے کی اجازت دے دی جاتی۔ لیکن سیاسی رہنماؤں کو اکثر و بیشتر قید و بند اور خوف و ہراس کا سامنا کرنا پڑتا۔ انہیں عموماً مقدمہ چلائے بغیر نظر بند کر دیا جاتا یا پھر فوجی عدالتوں اور ٹریبونلوں سے سزائیں سنائی جاتیں۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ برسراقتدار گروہوں کی پالیسیوں سے اختلاف رائے کا اظہار کرتے تھے۔ پاکستان کے پہلے آئین میں جو 1956ء میں تیار کیا گیا۔ متعدد اسلامی دفعات شامل تھیں۔ اور اس کے تحت ملک میں پارلیمانی نظام حکومت نافذ کیا گیا، لیکن یہ آئین مختصر عرصہ کے لئے نافذ رہا۔ 27 اکتوبر 1958ء کو مارشل لاء لگا دیا گیا اور جنرل محمد ایوب خان نے (جو بعد میں فیلڈ مارشل اور صدر مملکت بنے) آئین منسوخ کر دیا، کابینہ توڑ دی گئی، تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی اور ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ مارشل لاء 8 جون 1962ء تک نافذ رہا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل مارچ

Marfat.com

1962ء میں دوسرا آئین نافذ کیا گیا جس میں "بنیادی جمہوریت" کے نظام کے تحت صدارتی طرز حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اگرچہ سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کو کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن ان کی سرگرمیوں کو بری طرح محدود کر دیا گیا۔ صدر ایوب خان کی دس سالہ حکومت کے آخری ایام میں طلباء اور علماء نے زبردست مظاہرے کئے ملک میں شدید ہنگامے ہوئے جن کے بعد 25 مارچ 1969ء کو ایوب خان نے حکومت جنرل اے۔ ایم۔ یحی خان کے سپرد کر دی ایک بار پھر ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ لیکن حکومت نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی ملک میں عام انتخابات کرائے گی مشرقی پاکستان میں دسمبر 1971ء میں پاکستان کی مسلح افواج کی شکست اور بنگلہ دیش کے قیام کے نتیجے میں یحی خان کی فوجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ذوالفقار علی بھٹو 20 دسمبر 1971ء کو پاکستان کے صدر (بعد میں وزیراعظم) مقرر ہوئے۔

آئین 1973ء

ذوالفقار علی بھٹو کی سول حکومت کے دوران' جو پیپلز پارٹی کی حکومت تھی' پاکستان کو پہلا جمہوری آئین ملا جو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب اسمبلی نے تیار کیا تھا۔ سابقہ آئینوں کی طرح اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین 1973ء میں بھی اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ (آرٹیکل 2) آئین کے تحت ایک اسلامی کونسل کا قیام ضروری قرار دیا گیا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو اپنی زندگیاں اسلام کے نظریات اور اصولوں کے مطابق ڈھالنے میں ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنا ہے (پارٹ 9 آرٹیکل 227۔ 231)اس آئین کے تحت ملک میں وفاقی پارلیمانی نظام حکومت قائم کیا گیا۔ اور پارلیمنٹ کے دو ایوان قرار پائے (پارٹ 3 آرٹیکل 41۔159) آئین میں آزاد عدلیہ کی ضمانت دی گئی (پارٹ 3 آرٹیکل 175۔212) اور عوام کے بنیادی حقوق لازمی قرار پائے (پارٹ 2 آرٹیکل 8۔ 28) ان حقوق میں آزادی تحریر و تقریر شامل ہیں ان کے علاوہ غیر قانونی گرفتاری نظر بندی اور تشدد کی ممانعت بھی کی گئی ہے۔

نومبر 1981ء میں اس آئین کی منظوری سے قبل بنگلہ دیش کی جنگ کے آغاز

Marfat.com

پر ملک میں "ہنگامی حالت" نافذ کی گئی تھی۔ جب نیا آئین (1973) نافذ ہوا تو ملک میں ہنگامی حالت موجود تھی اور یہ صورت حال پیپلز پارٹی کے پورے دور میں جاری رہی۔ چنانچہ ہنگامی صورت حال کے باعث عوام کے بنیادی حقوق پر شدید پابندیاں بھی جاری رہیں۔

اس آئین کے آرٹیکل 232 کے تحت "ہنگامی حالت" کے نفاذ کی صورت میں بنیادی حقوق معطل کئے جاسکتے ہیں اور اسی دوران ہائی کورٹ کے اختیارات بھی محدود ہو سکتے ہیں۔ ڈیفنس آف پاکستان رولز جو ڈیفنس آف پاکستان آرڈی نینس مجریہ 1971ء کے تحت تیار کئے گئے تھے۔ اس دوران ملک میں نافذ رہے۔ ان رولز کے تحت کسی بھی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر نظر بند رکھا جا سکتا ہے یا نظر بندوں کے خلاف خصوصی عدالتوں یا خصوصی ٹریبونلوں میں سرسری سماعت کے مقدمات چلائے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ بھٹو دور میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ اور ان کے تحت حکومت کے سیاسی مخالفین کے خلاف کارروائی کی گئی۔

اینسٹی انٹر نیشنل نے 1977 میں جو رپورٹ جاری کی پاکستان میں بنیادی حقوق پر عائد پابندیوں کا اس میں ذکر موجود ہے۔ آئین 1973ء میں یکے بعد دیگرے ترامیم کے ذریعے (خصوصاً 1975 میں چوتھی اور 1976 میں پانچویں ترمیم) عوام کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات بڑی حد تک محدود کر دیئے گئے یہ اختیارات 1973ء کے آئین میں عوام کو دیئے گئے تھے۔ ان ترامیم کے ذریعے عدلیہ کی آزادی میں مداخلت سے جو تحفظ دیا گیا تھا وہ بھی تقریباً ختم ہو کر رہ گیا۔ اینسٹی انٹرنیشنل نے اس بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا "ہنگامی حالت کے جاری رہنے سے پاکستان میں عوام کے بنیادی حقوق میں زبردست کمی ہوئی ہے۔ اس سے عدلیہ اور بار کو قانون کی حکمرانی قائم رکھنے میں بھی شدید رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا نیشنل عوامی پارٹی (این۔ اے۔ پی) کی طرف سے کرنا پڑا۔ جس کے حامیوں کی تعداد پاکستان کے دو مغربی صوبوں۔ سرحد اور بلوچستان۔۔۔ میں زیادہ ہے۔ نیپ کے سیاسی پروگرام میں

Marfat.com

صوبوں کے لئے زیادہ سے زیادہ خود مختاری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ 1973ء میں بلوچستان میں نیپ کی صوبائی حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ اس پر دونوں مغربی صوبوں میں "مسلح بغاوت" ہو گئی چنانچہ 1975ء میں وفاقی حکومت نے نیپ پر پابندی عائد کر دی۔ ایمنسٹی انٹر نیشنل کے ایک نمائندہ نے سنٹرل جیل حیدر آباد میں نیپ کے 55 رہنماؤں کے خلاف مقدمہ کی سماعت کو ملاحظہ کیا جو ایک خصوصی عدالت میں جیل کے اندر چلایا جا رہا تھا۔ ایمنسٹی انٹر نیشنل نے اپنی 1977ء کی رپورٹ میں اس مقدمہ کے بارے میں نہایت سخت ریمارک دیئے ہیں۔ 1975ء میں نیشنل ڈیمو کریٹک پارٹی (این۔ ڈی۔ پی) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ جماعت نیپ کے لیڈروں کی سیاسی روپ تھی اور دراصل نیپ کا ہی دوسرا روپ تھی۔

مارچ 1977ء میں ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے جن میں پی پی پی نے اکثریت حاصل کر لی۔ لیکن بڑے زور و شور کے ساتھ یہ الزام لگایا گیا کہ انتخابات میں شدید دھاندلی ہوئی ہے۔ پاکستان قومی اتحاد نے جو 9 مخالف سیاسی جماعتوں کا اتحاد تھا اور عام انتخابات میں پی پی پی کا مد مقابل تھا' مطالبہ کیا کہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مستعفی ہو جائیں اور عام انتخابات دوبارہ کرائے جائیں۔ اتحاد کے مطالبات کے ساتھ ہی ملک میں سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ سیاسی گرفتاریاں بھی شروع ہو گئیں اور بہت سے سیاسی لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اپریل 1977ء ایک بار پھر مارشل لاء کا سہارا لیا گیا۔ ملک کے متعدد بڑے شہروں میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا جو جون 1977ء میں ختم کر دیا گیا۔

5 جولائی 1977ء کو وزیراعظم بھٹو کو معزول کر دیا گیا۔ اور فوجی انقلاب کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت میں اقتدار سنبھال لیا۔

جولائی 1977ء کے بعد

فوجی انتظامیہ نے کابینہ کو برطرف کر دیا' قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ کو توڑ دیا۔ تمام سیاسی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ اور پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ 1973ء کے آئین کو "معرض التواء" میں ڈال دیا گیا ہے۔ قوانین (نفاذ میں تسلسل) کے حکم کے تحت آئین کو

Marfat.com

مارشل لاء کے آرڈرز اور ریگولیشنز کے ماتحت کر دیا گیا۔ جو فوجی حکام وقتاً فوقتاً جاری کر رہے تھے۔ بنیادی حقوق جو آئین نے عوام کو تفویض کئے تھے، معطل کر دیئے گئے۔ عدالتوں کو بنیادی حقوق کے ضمن میں کسی مقدمے کی سماعت کے اختیارات سے محروم کر دیا گیا۔

5 جولائی 1977ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے جنرل محمد ضیاء الحق نے کہا۔

"میرا سب سے بڑا مقصد ملک میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد ہے جو اسی سال (1977) اکتوبر میں ہوں گے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں انتخابات کے اس شیڈول سے پہلو تہی نہیں کروں گا۔۔۔ میں ملک کی عدلیہ کا بے حد احترام کرتا ہوں تاہم جو بھی مارشل لاء آرڈرز یا مارشل لاء ریگولیشنز جاری کئے جائیں گے ان کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔۔۔"

نئی انتظامیہ نے نیپ کے رہنماؤں سمیت ان ہزاروں سیاسی نظربندوں کو رہا کر دیا جو سابق حکومت کے دور میں گرفتار کئے گئے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے وہ رہنما اور کارکن بھی رہا کر دیئے گئے جن کی نظربندی مارشل لاء کے نفاذ کے بعد عمل میں آئی تھی۔ نئی انتظامیہ نے محدود سیاسی سرگرمیوں کی اجازت بھی دے دی۔ ہنگامی حالات جو 1971ء سے نافذ العمل تھی، ختم کر دی گئی۔ 27 ستمبر 1977ء کو اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب آغا شاہی نے اقوام متحدہ کو مطلع کیا کہ پاکستان کی نئی حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کو انتقال اقتدار کا پختہ عزم رکھتی ہے۔ جو اکتوبر 77ء کے انتخابات میں منتخب کئے جائیں گے۔ لیکن بعد میں حکومت نے انتخابات ملتوی کر دیئے۔ اس نے کہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے نمائندوں کا، جو اقتدار میں رہے ہیں پہلے احتساب کیا جائے گا اور پھر انتخاب ہو گا۔ چنانچہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سمیت پیپلز پارٹی کے متعدد رہنماؤں کے خلاف الزامات عائد کئے گئے۔ بھٹو پر قتل کی سازش کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے ایک انتہائی متنازعہ مقدمہ کی سماعت کے بعد جس کے دوران عالمی سطح پر بھی اظہار تشویش کیا جاتا رہا مسٹر بھٹو کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ سپریم کورٹ میں 3 کے مقابلہ میں چار ججوں نے ہائی کورٹ کی طرف سے دی گئی سزا کی توثیق کر دی اور اپریل 1979ء میں بھٹو کو پھانسی

Marfat.com

پر لٹکا دیا گیا۔ اس موقع پر پاکستان پیپلز پارٹی کے کئی ارکان اور حامیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

جنرل ضیاء الحق نے صدر فضل الٰہی چوہدری کے استعفٰی کے بعد ستمبر 1978ء میں صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ 10 فروری 1979ء کو صدر ضیاء الحق نے ملک میں "اسلامی نظام" کے نفاذ کا اعلان کیا۔ اس میں زکواۃ اور عشر کے نفاذ کے علاوہ زنا کے لئے سنگساری کی سزا کا قانون بھی شامل تھا۔ چوری اور ڈکیتی کے لئے ہاتھ اور پاؤں کاٹنے اور شراب نوشی پر کوڑے لگانے کی سزاؤں (حدود) کا بھی نفاذ کر دیا گیا۔ وفاقی اور صوبائی سطح پر شرعی عدالتیں قائم کی گئیں۔ یوں ملک میں تین نظام ہائے قانون جاری و ساری ہو گئے۔ شرعی عدالتیں فوجی اور روایتی سول عدالتوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی تھیں۔

صدر ضیاء الحق نے 1962ء کے سیاسی جماعتوں کے قانون میں دور رس نتائج کی حامل تبدیلیاں کیں۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے ان تبدیلیوں کی بیک آواز مخالفت کی الیکشن کمیشن کو اختیار دیا گیا کہ وہ کسی ایسی سیاسی جماعت کی رجسٹریشن سے انکار کر دے جسے وہ فوج کی مخالف یا عدلیہ کی نکتہ چیں تصور کرے اور جس کی بنیاد نظریہ پاکستان پر نہ رکھی گئی ہو چنانچہ سیاسی جماعتوں میں سے بیشتر نے خود کو الیکشن کمیشن کے پاس رجسٹر کرانے سے انکار کر دیا۔

26 اکتوبر 1979ء کو صدر ضیاء الحق نے انتخابات کے غیر معینہ مدت کے لئے التواء کا اعلان کر دیا۔ تمام سیاسی جماعتیں کالعدم قرار دے دی گئیں۔ اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ سیاسی جماعتوں کے دفاتر سربمہر کر دیئے گئے اور بنکوں میں ان کے حسابات منجمد کر دیئے گئے۔

اخبارات پر مکمل سنسر عائد کر دیا گیا۔ متعدد اخبارات جن کے بارے میں حکومت نے کہا کہ "وہ ملکی مفادات کے خلاف کام کر رہے تھے اور عوام کے ذہنوں کو مسموم کر رہے تھے" بند کر دیئے گئے۔ مارشل لاء کے مزید ضوابط نافذ کئے گئے۔ فوجی عدالتوں کے اختیارات میں جن کے تحت وہ سیاسی' معاشی اور فوجداری مقدمات کی سماعت کر رہی تھیں' مزید اضافہ کر دیا گیا۔ آئین میں مزید ترامیم کی گئیں جن کے

Marfat.com

تحت عدلیہ کو فوجی عدالتوں میں مقدمات کی سماعت کو روکنے' ان کے فیصلوں پر نظرثانی کرنے یا ان فیصلوں کو کالعدم قرار دینے یا کسی بھی اور طریقہ سے فوجی عدالتوں کے کام میں مداخلت سے روک دیا گیا۔ یہ فوجی عدالتیں اس وقت حکومت کے بہت سے مخالفوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کر رہی تھیں اور انہیں قید و بند کے علاوہ سر عام کوڑے لگانے کی سزائیں سنا رہی تھیں۔ ان آئینی اور قانونی تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی گرفتاریوں کی ایک نئی لہر آئی۔ 1981ء کے آغاز کے بعد تو سیاسی طور پر گرفتار ہونے والوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

بنیادی حقوق میں مزید تخفیف

5 جولائی 1977ء کو جب فوجی انتظامیہ نے اقتدار سنبھالا اور مارشل لاء نافذ کیا تو قوانین (نفاذ میں تسلسل) کے حکم کے تحت یہ اعلان کیا گیا کہ آئین "معرض التواء" میں رہے گا۔ تمام بنیادی حقوق معطل کر دیئے گئے جو 1973ء کے آئین میں دیئے گئے تھے۔ جو بنیادی انسانی حقوق معطل کئے گئے ان میں جینے کا حق' تشدد سے آزادی' آزادی فکر' آزادی مذہب' آزادی ضمیر اور نافذ بہ ماضی قوانین کے تحت کارروائی سے آزادی کا حق شامل تھے۔ ان تمام حقوق کی پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 9'14'20 اور 12 کے تحت ضمانت دی گئی ہے۔ یہ ایسے حقوق ہیں جنہیں بین الاقوامی کنونشن برائے سول اور سیاسی حقوق میں "بنیادی آزادی کے حقوق" قرار دیا گیا ہے جن سے کوئی مملکت انحراف نہیں کر سکتی خواہ "ملک میں ایسی ہنگامی حالت ہی کیوں نہ ہو جو قوم کے وجود کے لئے ہی باعث خطرہ ہو"۔ (آرٹیکل 4)

مارشل لاء کا قانونی جواز

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی بیگم نصرت بھٹو نے سپریم کورٹ میں مارشل لاء کے نفاذ کے قانونی جواز کو چیلنج کیا۔ پاکستان کی سپریم کورٹ نے 10 نومبر 1977ء کو بیگم نصرت بھٹو کی درخواست کا فیصلہ سناتے ہوئے مارشل لاء کے نفاذ کو قانون کے مطابق قرار دے دیا اور اس کے لئے یہ دلیل دی کہ۔:

"یہ ایک غیر معمولی آئینی اقدام ہے جس کی ضرورت مسٹر زیڈ۔ اے۔ بھٹو کی حکومت کی قانونی اور اخلاقی اتھارٹی (ملک پر) ختم ہو جانے کی وجہ سے پیش آئی۔ تاہم

Marfat.com

سپریم کورٹ نے فوجی حکومت کے قانونی جواز کو بعض شرائط کے ساتھ تسلیم کیا۔ جولائی 1977ء کے پرامن انقلاب پر "نظریہ ضرورت" کا اطلاق کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے مارشل لاء حکام کے اقدامات پر' جو وہ قانونی طور پر عمل میں لا سکتے تھے' سخت حدود و قیودنافذ کیں۔ مارشل لاء کے تحت کارروائی اور قانونی اقدامات کے لئے بعض پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ ---

"مارشل لاء حکام صرف ایسے اقدامات کر سکتے ہیں جو مارشل لاء کے نفاذ کے اعلان کردہ مقاصد مثلاً ملک میں قانون اور نظم و نسق کی بحالی' حالات کو معمول پر لانا اور ملک میں 1973ء کے آئین کے مطابق جمہوری اداروں کے قیام کے لئے ممکن حد تک جلد آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد' کے عین مطابق ہوں"

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں زور دیا کہ۔

"نیا قانونی نظام صرف عبوری عرصہ کے لئے اور ایک مخصوص مقصد کے لئے ہے---عدالت کے لئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے غیر معمولی آئینی اقدام کو قانون کے مطابق قرار دینا صرف اس لئے ممکن ہوا کہ انہوں نے یہ پختہ وعدہ کیا ہے کہ آئین سے انحراف کا عرصہ ممکن حد تک مختصر ہو گا اور یہ کہ اس عرصہ کے دوران ان کی تمام تر توانائیاں ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے وقف ہوں گی جن میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ممکن ہو سکیں---"

سپریم کورٹ کے فیصلہ میں مارشل لاء کی حکومت کے قانونی جواز پر مزید شرائط عائد کی گئیں۔ عدالت عظمیٰ نے واضح کیا کہ ملک کا اعلیٰ قانون آئین ہی ہے اور ہائی کورٹوں کے نظر ثانی کے اختیارات اور حبس بے جا کے خلاف رٹ جاری کرنے کے اختیارات سلب نہیں کئے جاسکتے۔ اعلیٰ عدالتوں کو یہ مکمل اختیار حاصل رہے گا کہ وہ مارشل لاء حکام کے احکامات و اقدامات اور فوجی عدالتوں کے احکامات پر نظرثانی کر سکیں۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں لکھا۔

"اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیارات بدستور حاصل ہیں کہ وہ مارشل لاء حکام کے کسی بھی اقدام یا کارروائی کا عدالتی نقطہ نظر سے جائزہ لے سکیں اگر ان کو "نظریہ ضرورت" کے اصولوں کے مطابق' جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے' عدالت میں چیلنج کیا

Marfat.com

جائے۔ آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت عدالتوں کے اختیارات مکمل طور پر موجود ہیں اور عدالتیں، کسی مارشل لاء ریگولیشن یا مارشل لاء آرڈر، صدارتی حکم یا کوئی آرڈی نینس، اس کے برعکس ہونے کے باوجود، اپنے یہ اختیارات پوری طرح استعمال کر سکتی ہیں"۔

(پاکستان کے قانونی فیصلے۔۔ 1977 ایس سی ۔ 705)

چنانچہ فیصلہ کے مطابق اپنے اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے ہائی کورٹوں نے سیاسی نظربندوں کی نظربندی کے احکام یا سزاؤں کو کئی بار کالعدم قرار دیا اعلیٰ عدالتوں نے کوڑوں کی سزاؤں، پھانسی کے احکامات اور فوجی عدالتوں سے دی جانے والی دیگر سزاؤں کے خلاف حکم امتناعی جاری کئے اور فیصلہ سنایا کہ ان لوگوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کے دوران قانون کی حکمرانی کے اصولوں کا خیال نہیں رکھا گیا اور ان بنیادی حقوق سے صرف نظر کیا گیا ہے جو آئین نے لوگوں کو تفویض کئے ہیں۔

سپریم کورٹ کے نومبر 1877ء کے فیصلے کے تحت فوجی انتظامیہ کے قانونی جواز کی توجیہ کی گئی اور اس کے اختیارات کو محدود کیا گیا تھا مگر حکومت اس فیصلہ کو مسلسل نظر انداز کرتی رہی۔ مارشل لاء کے نفاذ کے چار سال بعد کئی بار انتخابات کا انعقاد ملتوی کیا گیا اور بالاخر انتخابات غیر معینہ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیئے گئے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے میں جو ہدایات دی گئی تھیں آئین میں یکے بعد دیگرے ترامیم کے ذریعے ان کو بے اثر بنا دیا گیا۔ مارشل لاء کے پہلے چار سالوں کے دوران مارشل لاء کے تحت بنائے جانے والے قوانین اور بالاخر 24 مارچ 1981ء کو جاری ہونے والے "عبوری آئین کا حکم" قانون کی حکمرانی سے مکمل انحراف کے مترادف تھا۔

مارچ 1981ء میں جاری ہونے والی آئینی ترمیم کے بعد کوئی سول عدالت نہ تو کسی فوجی عدالت کے کسی فیصلے پر نظرثانی کر سکتی تھی اور نہ ہی مارشل لاء انتظامیہ کے کسی اقدام یا خود انتظامیہ کے قانونی جواز پر غور کر سکتی تھی۔ اس آئینی حکم کا اطلاق ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ پر بھی ہوتا تھا۔ اب عدالتیں بنیادی انسانی حقوق، پاکستان میں نافذ نہیں کر سکتی تھیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ 1973ء کا جمہوری آئین اب منسوخ ہو چکا تھا صدر نے اپنی مرضی کے مطابق آئین میں ترمیم کے اختیارات

Marfat.com

از خود سنبھال لئے تھے۔ عدلیہ کی آزادی ختم ہو چکی تھی وہ عدلیہ جس کے جج صاحبان بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ اور انسانی حقوق کے غلط استعمال کی روک تھام کے شاندار ریکارڈ کے حامل تھے۔

جولائی 1977ء کے بعد آئینی ترامیم

جولائی 1977ء کے بعد سے مندرجہ ذیل آئینی ترامیم کی گئی ہیں جن کے تحت پاکستان کی عدلیہ کے انسانی حقوق کے تحفظ اور نفاذ کے اختیارات بری طرح محدود کر دیئے گئے ہیں۔

16 اکتوبر 1979ء کو صدر نے آئینی (دوسری ترمیم) حکم مجریہ 1979ء نافذ کیا جس کے تحت تمام سیاسی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اور متعدد سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اسی ترمیم کے ذریعے (1973 کے) آئین میں آرٹیکل 212 الف کا اضافہ کیا گیا۔ آرٹیکل 212 کے تحت حکومت کو ایسے انتظامی ٹریبونل قائم کرنے کا اختیار ہے جو سول قوانین کے دائرے کے اندر محدود طور پر عدالتی نظرثانی سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ مگر نئے آرٹیکل 212 الف کے تحت آرٹیکل 212 کے دائرہ کار کو بڑی حد تک وسیع کر دیا گیا اور حکومت کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ مارشل لاء کے تحت کسی جرم "یا کسی اور قانون کے تحت جس میں خاص قانون بھی شامل ہے" مقدمات کی سماعت کے لئے فوجی ٹریبونل قائم کر سکتی ہے۔ نئے قانون کے تحت حکومت کو یہ اختیار بھی مل گیا کہ وہ کسی بھی عام عدالت میں زیر سماعت مقدمہ کو فوجی ٹریبونل میں منتقل کر سکتی ہے۔ سول عدالتیں جن میں اپیل کی سماعت کرنے والی عدالتیں بھی شامل ہیں' فوجی عدالت کے فیصلہ کے خلاف اپیل کی سماعت کی مجاز نہیں رہیں۔ اس حکم کے تحت فوجی عدالتوں کے فیصلے کو قطعی قرار دے دیا گیا۔ اس ترمیم کے تحت ہائی کورٹوں کے اختیارات پر کاری ضرب لگی۔ آئینی ترمیم کے تحت مارشل لاء کا جو حکم (مارشل لاء آرڈر 72) نافذ کیا گیا اس سے سول عدالتوں کی قیمت پر' فوجی عدالتوں کے دائرہ کار میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔ فوجی عدالتوں کو وسیع پیمانے پر سول اور فوجداری مقدمات کی سماعت کا اختیار دے دیا گیا جن میں تعزیرات پاکستان کی ذیل میں آنے والے مقدمات بھی شامل تھے۔ آئینی ترمیم مجریہ 1979ء کے بعد

Marfat.com

آنے والے مہینوں میں ' ملک کے طول و عرض میں' ایک سو فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان فوجی عدالتوں نے عام شہریوں اور سیاسی نظر بندوں کے مقدمات کی سماعت بھی شروع کر دی۔ یہ عدالتیں سرسری سماعت کے بعد سزا سنا دیتی تھیں۔ چنانچہ سینکڑوں افراد کو عام سیاسی سرگرمیوں میں' جو مارشل لاء کے تحت ممنوع تھیں' حصہ لینے پر قید اور کوڑوں کی سزائیں سنائی گئیں۔

صدارتی حکم نمبر ایک مجریہ 1980ء کا نفاذ 27 مئی 1980ء کو عمل میں آیا جس کے تحت آئین کے آرٹیکل 199 میں ترمیم کر دی گئی۔ اس حکم کے تحت ہائی کورٹ کا رٹ جاری کرنے کا اختیار سلب کر لیا گیا۔ عدالتوں کو کسی مارشل لاء آرڈر یا مارشل لاء ریگولیشن کے قانونی جواز یا اس کے اثرات پر کسی نوع کا حکم جاری کرنے سے روک دیا گیا۔ عدالتوں کو کسی مارشل لاء حکم یا ریگولیشن کے تحت کسی کارروائی یا اقدام جو کیا جا چکا ہو یا کسی کارروائی یا اقدام' جس کے کرنے کا مارشل لاء حکام کا ارادہ ہو' کے بارے میں بھی کسی نوع کا حکم جاری کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس حکم کے تحت ہائی کورٹوں کو کسی فوجی عدالت یا ٹریبونل کے فیصلے یا سزا پر نظرثانی کرنے یا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی اتھارٹی کے تحت کوئی کارروائی کرنے والے کے خلاف کسی نوع کی کارروائی سے بھی روک دیا گیا۔ اس حکم میں وضاحت کی گئی کہ ہائی کورٹوں کے اختیارات کو ختم کرنے کے حکم پر عمل موثر بہ ماضی ہو گا یوں اس حکم کے تحت نہ صرف 1977 میں ملک میں اقتدار سنبھالنے کے فوجی اقدام کو درست قرار دے دیا گیا بلکہ اس کے بعد فوجی حکام نے جو بھی احکام جاری کئے تھے وہ سب بھی "قانون کے عین مطابق" قرار پائے ۔ ان احکام میں صدارتی احکام اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے احکام اور ریگولیشنز بھی شامل تھے۔ یہ آئینی ترمیم عین اس وقت نافذ کی گئی جب پنجاب کی ہائی کورٹ تحریک استقلال کے قائد ایر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان کی ایک درخواست پر فیصلہ سنانے والی تھی۔ جس میں انہوں نے مارشل لاء انتظامیہ کے قانونی جواز اور 1979ء کی آئینی ترمیم کو چیلنج کر رکھا تھا۔ اس درخواست میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ فوجی حکومت 90 دن کے اندر عام انتخابات کرانے کی پابند ہے اور اس نے بنیادی انسانی حقوق کو محدود کرنے اور شہری

Marfat.com

آزادیوں کو سلب کرنے کے جو اقدامات کئے ہیں وہ سب غیر قانونی اور بلا جواز ہیں۔

مئی 1980ء میں کی جانے والی آئینی ترمیم کا مقصد اعلیٰ عدلیہ کو اختیارات سے محروم کرنا تھا تاکہ وہ فوجی عدالتوں کے فیصلوں مارشل لاء کے قانونی جواز یا' مارشل لاء حکام کی طرف سے جاری کئے جانے والے قوانین پر نظرثانی نہ کر سکیں۔ اب ہائی کورٹ سیاسی نظربندوں کی ضمانت منظور کر کے یا کسی سیاسی نظربند یا فوجی عدالت سے بلا جواز سزا پانے والوں کی اپیل کی سماعت کر کے شہریوں کو قانونی امداد فراہم نہیں کر سکتی تھی۔ مگر بعض ہائی کورٹوں۔۔۔ خصوصا پنجاب اور بلوچستان کی ہائی کورٹوں نے ایسی اپیلوں اور ضمانت کی درخواستوں کی سماعت آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت جاری رکھی چنانچہ مارشل لاء آرڈر 77 جاری کیا گیا جس کے تحت سول عدالتوں کی قیمت پر' فوجی عدالتوں کے دائرہ اختیار کو مزید وسیع کر دیا گیا۔ فوجی عدالتوں کو "بغاوت' تخریب کاری' سبوتاژ' مملکت کے خلاف کارروائیوں اور فوج کے ارکان کو اکسانے" کے الزامات کے تحت مقدمات کی سماعت کا اختیار بھی دے دیا گیا۔ انہیں "مارشل کے کسی بھی حکم یا ریگولیشن" کی خلاف ورزی کے ملزموں پر مقدمہ چلانے کا اختیار بھی مل گیا۔ اس کے علاوہ فوجی عدالتیں تعزیرات پاکستان کی تمام دفعات کے تحت مقدمات کی سماعت کی مجاز قرار دے دی گئیں۔

عبوری آئین کا حکم مجریہ 1981ء

24 مارچ 1981ء کو صدر ضیاء الحق نے "عبوری آئین کا حکم" مجریہ 1981ء (پی سی او) جاری کیا جس کے تحت 1977ء کے بعد سے فوجی حکومت کے تمام اقدامات' احکامات اور کارروائیوں کو قانون کے مطابق قرار دے دیا گیا۔ (آرٹیکل 15(1) اور (2)) اس حکم کے تحت ایک صدارتی فرمان کے ذریعے 1973ء کے آئین کی بنیادی دفعات کو منسوخ کر دیا گیا۔ آئین کی صرف وہ دفعات باقی رہ گئیں جن کا ذکر پی سی او میں کیا گیا ہے۔ ان میں وفاقی حکومت کے اختیارات کے متعلق دفعات شامل ہیں۔ لیکن انتخابات' صوبائی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے بارے میں دفعات کے علاوہ بنیادی انسانی حقوق کے متعلق دفعات کو پی سی او میں شامل نہیں کیا گیا۔ آرٹیکل 16 کے تحت صدر نے آئین میں اپنی مرضی کی ترامیم کے اختیارات

Marfat.com

سنبھال لئے۔ پی سی او کے تحت عدلیہ کے اختیارات سلب کر لئے گئے اور تمام بڑی سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اس کے تحت مارشل لاء حکومت کے کسی بھی اقدام کو یا کسی فوجی عدالت یا ٹریبونل کی طرف سے دی جانے والی سزا کو عدالت میں چیلنج کرنے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

پی سی او کے تحت سپریم کورٹ کو 10 نومبر کی رولنگ بھی کالعدم قرار دے دی گئی۔ جس کے تحت کورٹ نے مارشل لاء حکومت کو تو قانونی جواز بخش دیا تھا مگر اس کے اختیارات محدود کر دیئے تھے۔ پی سی او ایسے وقت پر نافذ کیا گیا جب سپریم کورٹ فوجی حکومت کے قانونی جواز کے خلاف ایک درخواست کی سماعت شروع کرنے والی تھی۔۔ اس قانون کے تحت عدالت کے ان تمام فیصلوں کو بھی کالعدم قرار دے دیا گیا جو مارشل لاء حکومت کے قانونی جواز یا فوجی عدالتوں اور ٹریبونلوں کے فیصلوں کے قانونی جواز کے بارے میں صادر کئے گئے تھے۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے احکام یا احکام امتناعی اور فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے بارے میں ان عدالتوں کے فیصلے یا احکام معطل کر دیئے گئے۔ (آرٹیکل 15۔ (6))

بلوچستان ہائی کورٹ کے جج

ان فیصلوں میں جو، معطل کئے گئے، بلوچستان ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ قابل ذکر ہے جس کے مطابق اس ہائی کورٹ نے ایک خصوصی فوجی عدالتوں کی طرف سے دی جانے والی موت کی کئی سزاؤں کو معطل کر دیا تھا 2 جولائی 1980ء کو بلوچستان ہائی کورٹ نے رولنگ دی کہ ہائی کورٹ اب بھی فوجی عدالتوں کے خلاف اپیلوں کا فیصلہ سنا سکتی ہے۔ "چنانچہ ہم قرار دیتے ہیں کہ اس عدالت کو ہمیشہ یہ اختیار حاصل رہا ہے کہ وہ اس سوال کا جائزہ لے کہ آیا صدارتی حکم نمبر 21 مجریہ 1979ء اور صدارتی حکم نمبر ایک مجریہ 1980ء کے نفاذ کے بعد یہ عدالت اپنے اختیارات سے محروم ہو گئی ہے اور وہ ان دستاویزات کا جائزہ بھی نہیں لے سکتی۔ جن کے ذریعے آئینی ترامیم کی گئی ہیں"۔ پھر عدالت نے حکم دیا کہ "آئین کے آرٹیکل 212 اور 199 میں کی گئی ترامیم (جو علی الترتیب اکتوبر 16 1979ء اور 27 مئی 1980ء کو نافذ کی گئی تھیں) غیر قانونی اور بلا جواز ہیں"۔ عدالت نے ان دونوں ترامیم کو "ہمہ گیر

Marfat.com

اور بنیادی نوعیت" کی قرار دیا اور رولنگ دی کہ اس طرح کی ترامیم کرنا فوجی حکومت کے اختیار میں نہیں تھا اور یہ ترامیم سپریم کورٹ کے فیصلہ 1977ء میں دیئے گئے اصولوں پر پوری نہیں اترتیں۔ عدالت عالیہ نے قرار دیا کہ ہائی کورٹ کو آئین کے تحت تفویض کردہ نظرثانی کے اختیارات حکومت کی نافذ کردہ آئینی ترامیم کے باوجود حاصل ہیں۔ چنانچہ عدالت فوجی عدالتوں سے دی جانے والی موت کی سزاؤں کے خلاف حکم امتناعی جاری کرتی رہی۔

بالاخر پی سی او کے ذریعے یہ تمام اختیارات سلب کر لئے گئے اب عدالتیں مارشل لاء کے حکم 78 کے تحت سیاسی نظربندوں کو دی جانے والی سزاؤں کو غیر قانونی قرار دے کر کالعدم نہیں کر سکتی تھیں نہ ہی وہ سیاسی قیدیوں کو فوجی عدالتوں سے دی جانے والی سزاؤں کو ختم کرسکتی تھیں۔ نہ ہی وہ یہ کہہ کر کہ فوجی عدالتوں میں منصفانہ سماعت کے لئے ضروری تحفظات موجود نہیں' ان عدالتوں سے دی گئی کوڑوں کی سزاؤں اور پھانسی کے حکم کے خلاف حکم امتناعی جاری کر سکتی تھیں۔ جیسا کہ وہ اب تک کرتی چلی آ رہی تھیں۔

پی سی او کے نفاذ کے بعد ایمنسٹی انٹرنیشنل کو متعدد سابق سیاسی نظربندوں نے جو کسی طرح ملک سے فرار ہوگئے تھے۔ یا نظربندوں کے رشتہ داروں نے بتایا کہ انہیں نظربندوں کی جان کا خطرہ ہے کیونکہ اب انہیں وکلاء سے مدد ملنے کی کوئی امید نہیں۔ یہ وکلاء پاکستان میں سیاسی نظربندوں کے بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ میں کافی سرگرم رہتے تھے مگر اب انہوں نے سیاسی نظربندوں کے اعزا کو بتایا تھا کہ اب عدالتوں میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ایمنسٹی انٹرنیشنل کو جون 1981ء میں ایک خط ملا جو ذیل میں دیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے لاتعداد خطوط اس تنظیم کو مل رہے تھے۔

"میرے بھائی نے ہائی کورٹ میں رٹ درخواست پیش کرنے کے متعلق متعدد وکلاء سے مشورہ کیا ہے لیکن وکلاء نے اسے بتایا ہے کہ حالیہ آئینی ترامیم اس طرح کی قانونی امداد کی ممانعت کرتی ہیں"۔

پی سی او کے نتائج فوراً ظاہر ہوئے اور اس کے نفاذ کے بعد دو سیاسی نظربندوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

Marfat.com

بلوچستان کے 21 سالہ طالب عالم رہنما عبدالحمید بلوچ کو ایک خصوصی فوجی عدالت نے ایک ریکروٹنگ ایجنٹ کو قتل کرنے کے الزام میں موت کی سزا سنائی تھی۔ بلوچستان ہائی کورٹ نے 8 دسمبر 1980ء کو اس کی سزائے موت کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا کیونکہ اس کے مقدمہ کی سماعت اور سزا کے اعلان میں شدید بے قاعدگیوں کا ارتکاب کیا گیا تھا۔ عبدالحمید پر جس شخص کے مبینہ قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا اس کا نام دوبار تبدیل کیا گیا کیونکہ دونوں بار مبینہ مقتول زندہ ثابت ہو گیا تھا۔ پی سی او کے نتیجہ میں (جس کے تحت بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس میر خدا بخش مری کو سبکدوش کر دیا گیا) عبدالحمید کی سزائے موت کے خلاف حکم امتناعی معطل کر دیا گیا۔ اور عبدالحمید بلوچ کو 11 جون 1981ء کو مچھ جیل میں جو کوئٹہ کے قریب ہے' پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

عدلیہ

1973ء کے آئین میں عدلیہ کی آزادی کا اصول کارفرما ہے پاکستان میں قانون کی حکمرانی اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ میں عدلیہ اور وکلاء دونوں نے اہم اور متحرک کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی حکومتوں کی طرف سے ان کی آزادی کو محدود کرنے اور شہریوں کے انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے ان کے اختیارات پر قدغن لگانے کی کوششوں کی مزاحمت کی ہے۔ دسمبر 1977ء میں ہائی کورٹ کے ایک جج نے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ایک رکن کو "ضمیر کے ایک قیدی" کی رہائی کے بارے میں اطلاع بھیجی اس جج نے اس سیاسی قیدی کی سزائے قید کو جو ایک خصوصی فوجی عدالت نے سنائی تھی' کالعدم اور غیر قانونی قرار دیا تھا۔ اس جج نے لکھا۔

"آپ کو یہ جان کر مسرت ہو گی کہ پاکستان کی اعلیٰ عدالتیں ہمیشہ بنیادی انسانی حقوق کی اہمیت سے شعوری طور پر آگاہ رہی ہیں اور ہم نے ہمیشہ قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ان حقوق اور شہری آزادیوں کے تحفظ کے لئے اپنی سی کوشش کی ہے"۔

اپنے خط میں جج صاحب نے "عدلیہ کی آزادی اور انسانی حقوق کے بارے میں

Marfat.com

گہری تشویش" بھی ظاہر کی۔

ایمنسٹی انٹر نیشنل نے اپنی 1977ء کی رپورٹ میں سابق انتظامیہ (بھٹو حکومت) کی طرف سے' خصوصاً آئین کی پانچویں ترمیم مجریہ ستمبر 1976ء کے تحت کی گئی ترمیم کے بعد' عدلیہ کے اختیارات اور آزادی پر بندشوں کا ذکر کیا۔ سابق حکومت کے دور میں کی جانے والی ترامیم کے تحت عدلیہ کے' ہنگامی حالت کے نفاذ کے دوران "انتظامی اقدامات" پر نظرثانی کے اختیارات محدود کر دیئے گئے تھے خواہ انتظامیہ کے یہ اقدامات انسانی حقوق سے متصادم ہی کیوں نہ ہوں۔ جولائی 1977ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد بھی انتظامیہ کا یہ رویہ قائم رہا۔

آئین کی دوسری ترمیم کے حکم مجریہ 1979ء کے تحت ملک میں سول عدالتوں کے نظام کے متوازی فوجی عدالتوں کا نظام قائم کیا گیا ان عدالتوں کو مارشل لاء اور تعزیرات پاکستان دونوں کے تحت مقدمات کی سماعت کا اختیار دے دیا گیا۔ صدارتی حکم نمبر ایک مجریہ 1980ء فوجی عدالتوں کے اختیار میں' سول عدالتوں کی قیمت پر' مزید وسعت پیدا کر دی گئی اور ہائی کورٹوں کو فوجی عدالتوں کے فیصلوں اور فوجی انتظامیہ کے اقدامات پر نظرثانی سے منع کر دیا گیا۔ ہائی کورٹ کے ان ججوں کو جنہوں نے فوجی انتظامیہ یا فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف درخواستوں کی سماعت اور فیصلے کرنے کا کام جاری رکھا انہیں بار بار ہراساں کیا گیا۔ مثال کے طور پر بلوچستان ہائی کورٹ نے جب حکومت کی آئینی ترامیم کو خلاف قانون اور بلا جواز قرار دینے کا فیصلہ صادر کیا تو اس کے صرف دس دن بعد تمام ججوں کو ایک نوٹس موصول ہوا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ آپ نے انکم ٹیکس کا جو فارم بھرا ہے' اس میں شدید بے قاعدگیاں پائی گئی ہیں۔

(انٹر نیشنل کمیشن آف جورسٹس سی آئی جے ایل بلٹین نمبر 6 اکتوبر 1980)

24 مارچ 1980ء کو جاری ہونے والے پی سی او کے ذریعے انتظامی اقدامات کی عدالتی جانچ پڑتال کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ دراصل پاکستان میں عدلیہ کی آزادی کا نقطہ اختتام تھا۔ ججوں کو حکومت کا مطیع بنانے کے لئے حکومت نے ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کے ججوں کو از سر نو حلف اٹھانے کا حکم دیا۔ جس میں آئین پاکستان کے بجائے پی سی او کے تحفظ کا عہد کیا جانا تھا۔ پی سی او کے آرٹیکل 17 میں لکھا ہے۔

Marfat.com

"کوئی شخص جو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے منصب پر فائز ہے۔۔۔ اس منصب پر فائز نہیں رہ سکے گا اگر وہ اس فارم پر حلف نہیں لیتا' یا اسے حلف دلایا نہیں جاتا' جو پی سی او کے شیڈول میں دیا گیا ہے۔ جس شخص نے اس کے مطابق حلف اٹھا لیا۔۔۔ وہ اس آرڈر کی دفعات کا پابند ہو گا۔ کسی عدالت کے حکم کے باوجود وہ مذکورہ دفعات کے آئینی جواز کو نہ تو خود چیلنج کرے گا اور نہ ہی کسی کو ایسا کرنے کی اجازت دے گا"

25 مارچ 1981ء کو سپریم کوٹ اور ہائی کورٹوں کے تمام ججوں کو جو حلف اٹھانے کو کہاگیا تھا اس حلف نامے میں لکھا ہے۔:

"میں چیف جسٹس آف پاکستان (یا سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج) صوبہ..... کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس یا جج کی حیثیت میں اپنے فرائض عبوری آئین کے حکم کی دفعات اور قانون کے تحت وفاداری دیانت داری اور اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق ادا کرون گا اور یہ کہ میں عبوری آئین کے حکم مجریہ 1981ء کی دفعات کی پابندی کرونگا"

یہ حلف اٹھوانے کے بعد' جس کے تحت ججوں کو فوجی حکام یا فوجی عدالتوں کے اقدامات اور احکامات کی عدالتی جانچ پڑتال سے روک دیا گیا' دراصل حکومت نے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کی "وفاداری" کی ضمانت حاصل کی تھی۔

پاکستان کے چیف جسٹس ایس۔ انوار الحق اور سپریم کورٹ کے دوسرے ججوں مسٹر جسٹس دراب پٹیل اور مسٹر جسٹس فخرالدین ابراہیم نے پی سی او کی قانونی حیثیت سے انکار کرتے ہوئے اپنے منصب سے استعفے دے دیے۔ انہوں نے صدر کے نام الگ الگ مراسلوں میں لکھا کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کے پابند ہیں۔ چیف جسٹس نے اپنے مراسلے میں لکھا۔ "کوئی بھی جج جو اس فرمان (پی سی او) کا پابند ہو گا مختلف ہائی کورٹوں کے 16 ججوں نے بھی پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ان میں پانچ جج تو وہ تھے جن کو حلف اٹھانے کی دعوت ہی نہیں دی گئی تھی۔ ان میں سے بعض نے فوجی حکومت کے اقدامات کے خلاف رٹ درخواستیں منظور کی تھیں۔ ان میں بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس میر خدا بخش مری بھی شامل تھے۔ جو خصوصی

Marfat.com

فوجی عدالتوں کی طرف سے دی گئی سزاؤں پر عمل درآمد کرنے کے ذمہ دار تھے۔

ان پانچ ججوں کو حلف اٹھانے کا موقع نہ دے کر حکومت نے ان کو ان کے منصب سے گویا برطرف کر دیا تھا۔ اسی طرح حکومت نے سپریم جوڈیشل کونسل کو بھی نظرانداز کر دیا تھا جو ایک آزاد آئینی ادارہ ہے۔ یہ کونسل چیف جسٹس آف پاکستان' سپریم کورٹ کے سب سے سینئر دو ججوں اور چاروں ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس صاحبان پر مشتمل ہوتی ہے۔ سپریم جوڈیشل کونسل ججوں کو ان کے منصب پر تقرر کی میعاد کی ضمانت دیتی ہے اور صرف یہی کونسل ہی کسی جج کو بدعنوانی کی بنیاد پر اس کے منصب سے برطرف کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس برطرفی کی کارروائی کا طریق کار بھی آئین کے آرٹیکل 209 (7) میں دیا گیا ہے۔ اس آرٹیکل میں کہا گیا ہے کہ "سپریم کورٹ کا یا ہائی کورٹ کا کوئی جج' اس آرٹیکل میں دیئے گئے طریق کار کے سوا' اپنے منصب سے ہٹایا نہیں جائے گا۔" چونکہ اب حکومت نے ججوں کو برطرف کرنے کا اختیار پی سی او کے تحت خود حاصل کر لیا تھا۔ لہٰذا پاکستان میں عدلیہ کی آزادی بالکل ختم ہو گئی۔

پی سی او کا نفاذ کرتے ہوئے صدر نے کہا تھا:

"عدلیہ کا منصب یہ ہے کہ وہ قانون کی تعبیر و تشریح کرے اور انصاف فراہم کرے نہ کہ حکومت کو چیلنج کرتی پھرے" (فار ایسٹرن اکنامک ریویو۔ 13 اپریل 1981ء)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل اقوام متحدہ' یونیسکو اور کونسل آف یورپ کے ساتھ ایک مشاورتی ادارہ ہے۔ امریکہ کے انسانی حقوق کے کمیشن' امریکی ریاستوں کی تنظیم' افریقی اتحاد کی تنظیم کے بیورو برائے افریقی مہاجرین سے اس کا گہرا تعاون ہے۔ یہ تنظیم بیس سال قبل قائم کی گئی تھی۔ اس تنظیم کے دروازے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہیں جو ضمیر کے قیدیوں کی رہائی' سیاسی نظربندوں کے مقدمات کی قانون کے مطابق منصفانہ سماعت اور پھانسیوں اور تشدد کی روک تھام کے لیے کام کرنا چاہتا ہو۔ دنیا کے 150 ممالک میں اس تنظیم کے ارکان یا حامی موجود ہیں۔ یہ تنظیم حکومتوں' گروپوں' مذہبی یا سیاسی تنظیموں گویا ہر قسم کے بندھن سے آزاد ہے۔

Marfat.com

اس کے مقاصد نہایت قابل تکریم ہیں۔ اس کی آزادانہ رپورٹوں تک عوام کی رسائی نہیں اور پاکستان کے اخبارات بھی اس کی رپورٹوں کی اشاعت میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ چنانچہ اسی بناء پر قارئین کی دلچسپی کے لئے میں اس کی بعض رپورٹوں کے مندرجہ بالا کچھ حصے درج کیے ہیں۔

مغربی جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے "ادارہ امور جنوبی ایشیا" کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈائیٹر کونارڈ نے "پاکستان کی عدالتوں کا بحران" کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا جو انہوں نے مئی 1981ء میں ہمبرگ کے "اورینٹ انسٹی ٹیوٹ" میں پیش کیا جو پاکستان کے لا جرنل میں بھی شامل ہوا۔ اس مقالہ میں سپریم کورٹ آف پاکستان اور بلوچستان ہائی کورٹ سمیت مختلف ہائی کورٹوں کے فیصلوں کا تذکرہ ہے جو 1977ء سے 1981ء کے دوران صادر کئے گئے۔ مقالہ میں پاکستان میں دستور سازی کے مختلف مراحل اور ججوں کے حلف کے تقدس اور مارشل لا حکومتوں کی مزاحمت کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو پاکستان اور بعض دوسرے ممالک کے ججوں نے کی ہے۔ میں قاری کے استفادہ کے لیے اس مقالہ کے بعض حصے پیش کر رہا ہوں۔

"کسی ایسی دستاویز کی پیشکش' جو آئین ہونے کی دعویدار ہو' قانون میں حرف آخر نہیں ہوتی۔ پاکستان کے اہم آئینی مقدمات کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں نے مسلسل یہ اختیار سنبھالے رکھا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ قانون کے مطابق ہے یا غیر قانونی ہے وہ آئینی قوانین کے جواز کو قانون کی کسوٹی پر پرکھتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ یوسف پٹیل بنام کراؤن سے شروع ہو کر سرکار بنام ڈوسوکیس' عاصمہ جیلانی کیس میں یحیٰ خاں کے "عبوری آئین کے حکم" کو غیر قانونی قرار دینے' ضیاء الرحمان کیس اور پھر نصرت بھٹو بنام آرمی چیف آف سٹاف کیس میں عبوری آئین کے بعض حصوں کو کالعدم قرار دینے تک محیط ہے۔ اس سے اس عمومی دلیل کی نفی ہوتی ہے کہ عدالتیں جو نافذ العمل آئین کی پیدا وار ہوتی ہیں عدالتی جانچ پڑتال کا دائرہ اپنے بنیادی اختیار سماعت سے آگے نہیں بڑھا سکتیں۔ چنانچہ اس "بنیادی اختیار سماعت" پر ہی یہاں بحث کی جائے گی۔ اس ضمن میں دو امور قابل غور ہیں:-

Marfat.com

(الف) جہاں آئینی تبدیلی عدالتوں کے بنیادی اختیارِ سماعت کو متاثر نہیں کرتی اور اسی اختیار سماعت کے تسلسل کی توثیق کر دی جاتی ہے تو عدالتیں پہلے سے قائم قانونی نظام کی پیداوار ہی رہیں گی اور (نفاذ کے تسلسل کا) کوئی روایتی حکم ان کے اختیار سماعت میں کسی تبدیلی کی وجہ نہیں ہوتا۔ اس امر کا واضح فیصلہ توہین عدالت کے مقدمہ عنایت خاں بنام انور میں ہو چکا ہے جو 1955ء سے 1975ء تک پاکستان کی وفاقی اور سپریم کورٹ کی "شناخت" کے بارے میں تھا۔ بیگم نصرت بھٹو کیس میں چیف جسٹس انوار الحق نے قرار دیا تھا کہ مارشل لا آئینی رائے سے محض انحراف ہے۔ اور پرانا قانونی نظام کلی طور پر بنا نہیں ہوا چنانچہ عدالتوں کو حکومت کے اقدامات کے قانونی جواز پر فیصلہ دینے کا اختیار، بہرحال، حاصل ہے

(ب) لیکن نیا آئین دراصل عدالتوں کو از سر نو قائم کر سکتا ہے اور ان کی ہیئت ترکیبی اور اختیاری سماعت میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ لیکن عدالتیں اپنے وجود کی بنا پر اس اختیار کی حامل ہیں کہ وہ اس قانون کا جائزہ لے سکیں جن کا انہیں اطلاق کرنا ہے اور یوں اپنے اختیاری سماعت کے منبع کی چھان بین کر سکیں۔ کئی اہم مقدمے میں اس چھان بین کا نتیجہ متناقض بھی ہو سکتا ہے کہ عدالت اسی نتیجے پر پہنچے کہ وہ جس آئینی قانون کے تحت اپنے اختیارات استعمال کر رہی ہے وہی ناقص ہے تو اس کا اپنا وجود اور اختیارات بھی متاثر ہونگے۔ اسی صورت حال کو قانون دان "بے مثال" قرار دیتے ہیں جو ایک "قانونی بند گلی" ہے اور اس سے گزرنا محال بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ اس بات کی کوئی قابل تسلیم وجہ نہیں کہ عدالتوں کے اختیارات، انتظامیہ کے ان اختیارات سے کم ہوں جو وہ "ضرورت کے تحت" حاصل کرتی ہے تا کہ قانونی افراتفری پر قابو پایا جا سکے اور عبوری تغیر کو قانونی جواز مل سکے۔ چنانچہ "ضرورت کو عدالتی اختیارات کی آزادانہ بنیاد بھی بنایا جا سکتا ہے"

"کیا یہ صورت، جس کا ذکر کیا گیا ہے، ججوں کے کسی مخصوص حلف کے باعث متاثر ہو سکتی ہے؟ یہ سوال بھی بیگم نصرت بھٹو کیس میں زیر بحث آیا ہے پاکستان میں ججوں سے از سر نو "عبوری حکم" کے تحت حلف لیا گیا ہے اور اس میں آئین کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ حلف میں لفظ "قانون" کو اس سے علیحدہ نہیں کیا جانا

Marfat.com

چاہئے ۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے مراد سردست نافذ آئین ہی ہے ۔ اس صورت میں قانون کی بالا دستی قائم رکھنے کا فرض کسی بھی حلف میں تسلیم کیا جانا چاہئے ۔ جو کسی بھی آئین کے تحت لیا جائے یا دلایا جائے ۔ اس طرح کے آئین کے تحت کسی جج کو حلف اٹھانے پر صرف اسی صورت میں مجبور کیا جا سکتا ہے کہ یہ آئین یا قانون خود بھی قانونی طور پر " جائز " ہو ۔ لہٰذا کوئی " سیاسی حلف " کسی جج کو اپنے قدرتی عدالتی اختیارات کو ' کہ وہ آئین کے قانونی جواز کو پرکھ سکے ' استعمال کرنے سے روک نہیں سکتا خواہ جج کے " عدالتی اختیارات " اسی آئین کی رو سے ہی اسے کیوں نہ تفویض ہوئے ہوں۔"

یہ مقالہ پیش کیا جا چکا تھا (1980ء) جب پاکستان میں 24 مارچ 1981ء کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ایک نیا " عبوری آئین " نافذ کر دیا ۔ یوں وہ " ضرورت " کا دور ختم کر دیا گیا جس کی منظوری نصرت بھٹو کیس میں عدالت نے دی تھی ۔ اس عبوری آئین کے حکم کے تحت مارشل لا کے تحت بنائے گئے تمام قوانین اور دوسرے قوانین کو قانونی قرار دے دیا گیا ہے جو 5 جولائی 1977ء کو یا اس کے بعد بنائے گئے ہیں ۔ اس حکم کے تحت ' خاص طور پر ججوں کو از سرنو حلف اٹھانے پر مجبور کیا گیا۔ جس کے بعد ججوں کی ایک قابل ذکر تعداد نے جن میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شامل ہیں ' نیا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا چنانچہ وہ اپنے منصب سے محروم کر دیئے گئے ۔ کچھ ججوں کو حلف اٹھانے کی دعوت ہی نہ دی گئی اور وہ بھی سبکدوش ہوگئے ۔ اعلیٰ عدالتوں کی ہیت ترکیبی اور عدلیہ کی آزادی میں یہ مداخلت پاکستان کی تاریخ میں بے مثال ہے ۔ تاہم اس طرح حلف نہ اٹھانے اور اپنے منصب سے محروم ہو جانے کے بعد ان جج صاحبان کے وقعت اور وقار میں ہرگز کوئی کمی نہیں ہوئی۔ قانونی پوزیشن تو یہی ہے کہ جو حاکم مجاز جو کسی سے اس طرح کا حلف لینا چاہئے۔ ایسی صورت میں حکومت وقت کی اپنی پوزیشن بھی "قانونی" ہونا لازمی ہے۔

Marfat.com

باب چہارم

فل بنچ کا فیصلہ

" فار ایسٹرن اکنامک ریویو ہانگ کانگ کے مسٹر لارنس لائف شلز نے اپنے غیر جانبدارانہ اور ہمہ پہلو مضمون میں (جو 13 مارچ 1981ء کے شمارہ میں شائع ہوا) ان مشکلات اور دباؤ کا ذکر کیا ہے جو مضمون نگار کے مطابق بلوچستان ہائی کورٹ کو 2 جولائی 1980ء کو اپنے فیصلہ کے اعلان سے قبل برداشت کرنا پڑا ۔ یہ فیصلہ پاکستان کی عدالتی تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے چنانچہ مستقبل کے مورخین اور عام قارئین کے استفادہ کے لیے ضروری ہے کہ انہیں عدالت کے اس فیصلے کی مکمل تفصیلات کا علم ہو جو 17 جون 1978ء سے 2 جولائی 1980ء تک کے سرکاری ریکارڈ کا ایک حصہ ہے ۔ اس سے دوسرے امور کے علاوہ صوبائی اور وفاقی حکومتوں کی وہ کوششیں بھی منظر عام پر آ جائیں گی جو انہوں نے اپنے افسروں خاص کر بلوچستان کی عدالتی تاریخ میں پہلی دفعہ نو متعین شدہ ڈپٹی اٹارنی جنرل بلوچستان اور ایڈوکیٹ جنرل کے ذریعے کی تھیں ۔ ان کوششوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ بلوچستان ہائی کورٹ آئین کی دفعہ 212 الف کے بارے میں جو فیصلہ دینے والی ہے اس سے مختلف فیصلہ حکومت کے حق میں حاصل کیا جائے ۔ ایک واقعہ کے سوا جو ہمارے لئے سخت برہمی کا باعث بنا اور جو توہین عدالت کے مترادف تھا ' میں دوسرے واقعات کا ذکر نہیں کرو نگا کیونکہ اخلاق اس کی اجازت نہیں دیتا ۔ کسی مقدمہ میں دونوں طرف کے وکلا اپنے موقف کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے جو بھی دلائل پیش کریں کسی کو ان پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے ۔ لیکن سرکاری وکلا کو تو زیادہ صداقت اور حق گوئی سے کام لینا چاہئے ۔ اپنی عدالت کا احترام ملحوظ رکھنا چاہئے ' کیونکہ وہ عدالت کے قانونی افسر بھی ہوتے ہیں ۔ ان میں اتنی جرات ہونی چاہئے کہ وہ اپنے آجر یعنی حکومت کے ناروا دباؤ کا مقابلہ کر سکیں ' کیونکہ خود عدالتیں بھی تو حکومت کا اہم ترین حصہ ہوتی ہیں عدالت پر دباؤ ڈالنے کی آخری اور سب سے بری اور ذلیل حرکت

Marfat.com

حکومت بلوچستان نے کی ۔ یہ پولیس کے ذریعے عدالت کو مرعوب کرنے کی کوشش تھی ۔ 2 جولائی 1980ء کو عدالت کا اجلاس کوئٹہ میں جاری تھا ۔ اس روز عدالت اپنا فیصلہ سنانے والی تھی (جو بعد دوپہر اسی تاریخ کو عدالت میں سنایا گیا جس کا متن آگے دیا گیا ہے) کہ مقامی پولیس نے عدالت کے ایک جج کی سرکاری کار کو روکنے کی جسارت کی ۔ اس کار میں جج صاحب کے بچے سکول جا رہے تھے ۔ پولیس نے ڈرائیور کو دھمکایا اور یوں بچے بھی ہراساں ہوئے ۔ پولیس نے ڈرائیور کو انتباہ کیا کہ وہ آئندہ سرکاری کار کو بچوں کو سکول لے جانے کے لئے استعمال نہ کرے ۔ اسی صبح کو پولیس نے جو غالباً اس کام کے لیے مامور تھی' ایک اور جج کی کار کا چالان کیا ۔ پولیس والے کار کو تھانہ سول لائنز میں لے گئے اور وہاں کافی دیر تک کار کو روکے رکھا ۔ جج کے ڈرائیور نے جو چالان کی پرچی کا انتظار کرتا رہا' ہمیں چائے کے وقفے کے دوران اسی واقعہ کی اطلاع دی ۔ میں نے ہائی کورٹ کے رجسٹرار کو ہدایت کی کہ وہ انسپکٹر جنرل پولیس بلوچستان کے پاس اس واقعہ کی شکایت کریں ۔ میں نے گورنر لیفٹننٹ جنرل رحیم الدین کو اسی وقت ایک خط بھی لکھا جو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی تھے ۔ یہ خط تمام ججوں کی طرف سے تھا جس میں گورنر سے کہا گیا کہ وہ صوبائی پولیس کو مستقبل میں اس نوع کے ذلیل حربے استعمال کرنے سے روکیں ۔ اسی روز ہم نے آئین کی ترمیمی دفعہ 212 الف کے بارے میں جو صدر نے جاری کی تھی' اپنا مختصر فیصلہ سنایا جس میں اس دفعہ کو قانون کے منافی قرار دے کر کالعدم کر دیا گیا ۔ اس دفعہ کے تحت مارشل لا کی عدالتوں کو وسیع اختیارات تفویض کئے گئے تھے ۔ مفصل فیصلہ 12 جولائی 1980ء کو دیا گیا ۔

اس سے قبل بھی ایک موقع پر ہائی کورٹ نے ملٹری کورٹ میں زیر سماعت ایک مقدمہ کے ملزم کی ضمانت منظور کر لی ۔ اس فوجی عدالت کے صدارتی افسر نے جو ایک میجر تھا' پہلے تو عدالت عالیہ کے متعلقہ جج کو فون کر کے دھمکانے کی جرات کی اور یوں عدالت کے حکم کی خلاف ورزی کی کوشش کی ۔ اس پر میں نے گورنر رحیم الدین سے ان کے دفتر میں زبانی شکایت کی اور کہا کہ اس میجر کو سزا دی جائے ۔ لیکن گورنر نے کچھ نہ کیا ۔ یوں گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے ذریعے صوبائی حکومت عدالت

Marfat.com

عالیہ پر سخت دباو ڈالتی رہی لیکن عوام سینکڑوں کی تعداد میں عدالت سے انصاف اور امداد حاصل کرنے کے لیئے آتے رہے ۔ ہائی کورٹ کے ججوں نے کسی خوف کو خاطر میں لائے بغیر عوام کو قانون کے مطابق امداد فراہم کی ۔

میں یہاں اس وقت کے وزیر قانون مسٹر شریف الدین پیرزادہ کی طرف سے اپنی دلجوئی کا ذکر نہ کروں تو یہ غیر مناسب ہو گا ۔ وہ سیکرٹری قانون مسٹر جسٹس نصرت کے ساتھ ستمبر 81ء میں کوئٹہ میں میرے غریب خانہ پر تشریف لائے ۔ اس وقت میں جج نہیں تھا ۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اسی وقت چند سطریں لکھ کر رضا مندی کا اظہار کر دوں تو مجھے سپریم کورٹ کا جج مقرر کر دیا جائے گا ۔ میں نے دونوں حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جو حلف کوئٹہ میں اٹھانے سے انکار کیا ہے بھلا میں اسلام آباد میں وہی حلف کیونکر اٹھا سکتا ہوں ۔ پھر چیف جسٹس بلوچستان کی حیثیت میں جب وفاقی حکومت مجھے "اچھا" نہیں سمجھتی تو سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت میں بھلا میں کیسے قابل قبول ہو سکتا ہوں ۔ میں نے اس بات پر اصرار بھی کیا کہ پہلے حکومت میری تعیناتی کا حکم جاری کرے تو میں بعد میں غور کروں گا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ "ممکن ہے آپ اس تعیناتی کو سرکاری حکم کے بعد قبول نہیں کریں گے۔" اور یہ حکومت کے وقار کے منافی ہو گا ۔ چنانچہ میں نے کہا کہ حکومت کا اپنا وقار ہے تو میری بھی عزت نفس ہے ۔ یوں یہ معاملہ ختم ہو گیا ۔

یہ اپیل جس کا فیصلہ بلوچستان ہائی کورٹ نے سنایا 17 جولائی 1978ء کو دو افراد سلیمان اور قاسم کی طرف سے دائر کی گئی تھی جو حقیقی بھائی تھے ۔ ان دونوں کو فوجی عدالت سے موت کی سزا کا حکم سنایا گیا تھا اور وہ مچھ جیل میں پھانسی کی سزا پر عمل درآمد روکنے کا حکم جاری کیا اور درخواست پر مدعا بیان کی رپورٹ طلب کر لی ۔

اس کے بعد عدالت میں درخواست کی سماعت شروع ہو گئی عدالت نے مقدمہ کا ریکارڈ طلب کر لیا ۔ اسی دوران (16 اکتوبر 1979ء) میں آئین میں دوسری ترمیم کا حکم جاری کیا گیا جس کے تحت آئین میں آرٹیکل 212 الف کا اضافہ کر دیا گیا ۔

20 اکتوبر 1979ء کو اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل نے عدالت میں درخواست دی کہ آئین کے آرٹیکل 212 الف کے تحت عدالت اس درخواست کی سماعت کے

Marfat.com

اختیار سے محروم ہو گئی ہے 23 اکتوبر کو اس درخواست پر فیصلہ سناتے ہوئے فاضل عدالت نے اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل کو ہدایت کی کہ وہ اپنی اس درخواست کی نقل درخواست گزاروں کے وکیل محمد اسلم چشتی کو فراہم کریں اور سماعت 28 اکتوبر پر ملتوی کر دی گئی۔

24 اکتوبر 79ء کو اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل نے ایک اور درخواست دائر کی جو 25 اکتوبر کو زیر سماعت آئی۔ اس درخواست میں بھی یہی موقف اختیار کیا گیا کہ آئین کے آرٹیکل 212 الف اور مارشل لا آرڈر 72 (جو اس دوران جاری ہو چکا تھا) کی رو سے عدالت اب اس مقدمہ کی سماعت نہیں کر سکتی۔ اسی روز درخواست گزاروں کے وکیل نے اس درخواست کا جواب داخل کیا تو اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل نے اس جواب کے مطالعہ کے لئے مزید وقت مانگا۔

درخواست گزار کے وکیل نے ایک اور درخواست بھی دائر کی جس میں بتایا گیا کہ عدالت عالیہ نے درخواست گزاروں کی سزائے موت پر عمل درآمد روک دیا ہے مگر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے دونوں درخواست گزاروں کی سزائے موت کی توثیق کر دی ہے اگرچہ فاضل عدالت نے نئی آئینی ترمیم اور نئے مارشل لا آرڈر کی روشنی میں درخواست کی مزید سماعت کے لئے 28 اکتوبر کی تاریخ مقرر کی ہے، لیکن ایک خبر میں جو روزنامہ جنگ کوئٹہ (24 اکتوبر 1979ء) میں شائع ہوئی ہے گورنر بلوچستان اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے کہا ہے کہ جن لوگوں کو قتل یا دوسرے الزامات کے تحت موت کی سزا دی گئی ہے اور صدر نے ان کی سزا کی توثیق کر دی ہے، ان کی سزاؤں پر ہر صورت میں عمل درآمد کر دیا جائے گا۔ فاضل وکیل نے مزید کہا کہ اس سے درخواست گزاروں میں شدید مایوسی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے استدعا کی کہ فاضل عدالت موت کی سزا کے خلاف حکم امتناعی کے بارے میں، جو قبل ازیں عدالت عالیہ جاری کر چکی ہے، کوئی وضاحتی حکم یا مناسب ہدایات جاری کرے۔ یہ مناسب ہو گا کہ عدالت بذریعہ تار سپرنٹنڈنٹ مچھ جیل کو اپنے احکام سے آگاہ کر دے کہ 28 اکتوبر 1979ء کو دائر کی جانے والی درخواست کے فیصلے تک موت کی سزا پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔

Marfat.com

عدالت نے اس روز یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ اس درخواست اور اس جیسی دوسری درخواستوں کی سماعت کے دوران اہم قانونی اور آئینی نکات کی وضاحت اور فیصلہ کیا جانا ہے ۔ لہٰذا فاضل چیف جسٹس میر خدا بخش مری اور مسٹر جسٹس ذکاء اللہ لودھی نے فیصلہ کیا کہ درخواست کی سماعت کے لیے بڑا بنچ تشکیل دیا جائے ۔ انہوں نے مسٹر جسٹس ایم رشید کو نامزد کیا جو آئندہ تاریخ پیشی پر بنچ میں بیٹھیں گے ۔

اگلی پیشی پر جو 28 اکتوبر 79ء کو ہوئی عدالت عالیہ نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو نوٹس جاری کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی قرار دیا کہ فاضل عدالت نے جو حکم امتناعی جاری کر رکھا ہے وہ جاری رہے گا ۔

11 نومبر کو پھر سماعت ہوئی تو ایڈوکیٹ جنرل نے بتایا کہ اس مقدمہ میں وفاق کی نمائندگی ڈپٹی اٹارنی جنرل کریں گے ۔ مگر وہ سپریم کورٹ میں مصروف ہیں لہٰذا دو ہفتے کا التوا دیا جائے چنانچہ یہ درخواست منظور کر لی گی ۔

25 نومبر 1979ء کو فل بنچ میں پھر سماعت ہوئی ۔ عدالت نے ڈپٹی اٹارنی جنرل ارشاد احمد خاں کے دلائل سنے اور ان کی استدعا پر آئندہ سماعت 22 دسمبر 79ء کو مقرر کی۔ تاکہ سپریم کورٹ بھی جو اسی نوع کی متفرق درخواستوں کی سماعت کر رہی ہے کسی نتیجے پر پہنچ سکے ۔

سماعت جاری رہی ۔ فاضل عدالت نے سزائے موت کے ملزموں کی سزا کے خلاف جو حکم امتناعی جاری کر رکھا تھا وہ بھی موثر رہا ۔ اسی دوران عدالت نے مسٹر یحی بختیار ایڈوکیٹ ' حاجی سرفراز خاں ایڈوکیٹ اور مسٹر محمد مقیم انصاری ایڈوکیٹ کو عدالت کی مدد کے لئے طلب کر لیا اور وہ بھی پیش ہونے لگے ۔

8 مارچ ۱۹۸۰ء کو فاضل عدالت کو پھر بتایا گیا کہ ڈپٹی اٹارنی جنرل لاہور اور کراچی ہائی کورٹ میں مصروف ہیں لہٰذا سماعت ملتوی کر دی جائے ۔ عدالت نے اس کا سخت نوٹس لیا اور قرار دیا کہ وہ وفاق کی نمائندگی کا آخری موقع دے رہے ہیں اور مزید سماعت 29 مارچ پر ملتوی کر دی ۔ اسی روز عدالت نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ مقدمہ کی سماعت کے لئے جو بنچ تشکیل دیا گیا ہے اس میں مزید توسیع کی جائے چنانچہ مسٹر جسٹس عبد القدیر چودھری کو بھی بنچ میں شامل ہونے کا حکم دیا گیا ۔ اب یہ بنچ چیف جسٹس

Marfat.com

سمیت چار ججوں پر مشتمل ہو گیا۔

29 مارچ 1980ء کو فل بنچ کے روبرو درخواست دہندگان کا وکیل محمد اسلم چشتی وفاقی حکومت کی طرف سے ارشاد حسن خاں ڈپٹی اٹارنی جنرل' صوبائی حکومت کی طرف سے بشارت اللہ ایڈوکیٹ جنرل اور عدالت کے وکلا کے طور پر یحی بختیار' مقیم انصاری' محمد نواز احمد اور حاجی سرفراز خاں ایڈو کیسٹ پیش ہوئے۔

دوران سماعت ایڈوکیٹ جنرل نے صوبائی حکومت کی ہدایت پر ایک درخواست پیش کی جس میں یحی بختیار کے بطور عدالتی وکیل پیش ہونے پر اعتراض کیا گیا۔ ایڈوکیٹ جنرل نے موقف اختیار کیا کہ اس مقدمہ میں یحی بختیار کا رویہ جانبدارانہ ہو سکتا ہے۔ پھر ان کے خلاف ایک خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ زیر سماعت ہے۔ ان پر انتخابات میں دھاندلی کاالزام ہے لہٰذا وہ عدالت کے معاون وکیل کے طور پر پیش ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ فاضل عدالت نے ایڈوکیٹ جنرل کے دلائل کی سماعت کی مگر ان کے موقف سے اختلاف کرتے ہوئے درخواست مسترد کر دی۔ عدالت نے درخواست مسترد کرنے کے حکم میں متعدد نظائر پیش کئے اور دلائل کا اندراج کیا۔ چاروں ججوں نے یہ فیصلہ متفقہ طور پر دیا۔

سماعت جاری رہی اور متعدد پیشیوں کے بعد 2 جولائی 1980ء کو فاضل فل کورٹ نے درخواست کا مختصر فیصلہ سنایا اور 12 جولائی کو مکمل فیصلہ کا اعلان کیا گیا۔ فیصلہ میں آئینی ترمیم کو خلاف قانون قرار دیا گیاجس کے تحت عدالتوں کے اختیارات میں کمی کی گئی تھی اپنے مختصر فیصلہ میں فاضل عدالت نے قراردیا۔ (خلاصہ)

صدر مملکت نے صدارتی حکم 21 مجریہ 1979ء کے تحت آئین میں دفعہ 212 الف کا اضافہ کیا ہے جس کے مطابق سی ایم ایل اے کو فوجی عدالتیں اور ٹریبونل قائم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور ہائی کورٹ کو ان فوجی عدالتوں یا ٹریبونلوں کے حیطہ اختیار میں آنے والے مقدمات کے بارے میں کوئی حکم امتناعی جاری کرنے یا کسی درخواست کی سماعت سے روک دیا ہے۔ اسی آرٹیکل کے تحت سپریم کورٹ میں زیر سماعت اپیلوں کے سوا' عدالتوں میں زیر سماعت تمام درخواستوں کی سماعت ختم کر دی ہے جو فوجی عدالتوں کے فیصلوں وغیرہ کے بارے میں تھیں۔ عدالت کا ایک بڑا بنچ

Marfat.com

تشکیل دیا گیا اور یہ تنقیحات متعین کی گئیں ۔

1۔ کیا آئین میں ترمیمی نیا آرٹیکل 212 الف خلاف قانون ہے ۔

2۔ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو ۔:

(الف) ۔ آرٹیکل 212 الف اور مارشل لا آرڈر 4 کے جو آرڈر ۲۷ کے ذریعے ترمیم شدہ ہے ' عدالتوں کے نظرثانی کے اختیارات پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں جو آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت عدالتوں کو حاصل ہیں ..... اور

(ب) آرٹیکل 212 الف فوجی عدالتوں اور ٹریبونلوں میں فیصلہ ہونے والے مقدمات اور ان مقدمات پر جو ان کے روبرو زیر سماعت ہیں کیا اثرات ڈالتا ہے ۔

درخواست کی روزانہ سماعت ہوئی جس کے دوران ایڈوکیٹ جنرل اور ڈپٹی اٹارنی جنرل نے دلائل پیش کئے ۔ اسی دوران 26 مئی 1980ء کو صدارتی آرڈر نمبر ایک مجریہ 1980ء جاری کیا گیا جس کے تحت آئین کے حصہ 7 میں باب ۳ الف کا اضافہ کیا گیا اور یوں آئین کے آرٹیکل 199 میں دفعہ 3 الف 31 بی ' اور 3 سی کا اضافہ کر دیا گیا ۔ ان کے تحت فوجی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں آنے والے مقدمات پر عدالت عالیہ کے نظر ثانی کے اختیارات ختم کر دیئے گئے ۔ درخواست دھندگان کے وکیل نے ایک اور درخواست کے ذریعے دفعہ 3 الف ' 3 بی اور 3 سی کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا تاہم عدالت نے مناسب تصور نہ کیا کہ جن سوالات پر پہلے بحث ہو چکی ہے ان کو از سر نو اٹھایا جائے ۔ چنانچہ درخواست دہندہ کے وکیل ' سرکاری وکلاء اور عدالتی وکلاء کو ان تینوں دفعات کی قانونی حیثیت کے بارے میں دلائل پیش کرنے کی اجازت دیدی گئی ۔

عدالت نے تمام وکلاء کے دلائل تفصیل کے ساتھ سماعت کئے ' فاضل ایڈوکیٹ جنرل اور ڈپٹی اٹارنی جنرل نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ فاضل عدالت اس درخواست کی سماعت کا اختیار کھو چکی ہے ۔ تاہم عدالت عالیہ نے فیصلہ دیا کہ ۔:

"ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آئین میں آرٹیکل 212 الف اور آرٹیکل 199 میں دفعات 3 اے ' 3 بی ' اور 3 سی کا اضافہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے ان اختیارات کے منافی ہے جو نصرت بھٹو کیس میں تسلیم کئے گئے ہیں ۔ اس کے نتیجے میں

Marfat.com

مارشل لا آرڈر 77 میں کی گئی تبدیلیاں بھی خلاف قانون ہیں ۔ ان نتائج کے پیش نظر ہم دوسرے سوال کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ۔ ہم اپنے نتائج کی وجوہ الگ سے دائرہ تحریر میں لائیں گے ۔ "

عدالت عالیہ نے اپنے فیصلہ میں حکومت کو سپریم کورٹ میں اپیل کی بھی اجازت دے دی۔ فل بنچ کے تین ججوں چیف جسٹس مسٹر جسٹس میر خدا بخش مری ' مسٹر جسٹس ایم ۔ اے رشید اور مسٹر جسٹس عبد القدیر چودھری نے یہ مختصر فیصلہ متفقہ طور پر سنایا اور اس پر اپنے اپنے دستخط ثابت کئے ۔

باب چہارم

بلوچستان ہائی کورٹ کا مفصل فیصلہ

12 جولائی 1980ء

12 جولائی 1980ء کو فاضل عدالت نے جو مفصل فیصلہ سنایا وہ صرف ان دونوں بھائیوں کی درخواست کا فیصلہ نہ تھا جن کو موت کی سزا ہو چکی تھی ۔ بلکہ دوران سماعت فوجی عدالتوں کی کارروائی اور فیصلوں کے خلاف اسی نوعیت کی مزید چھ درخواستیں عدالت کے روبرو دائر کی جا چکی تھیں۔ ان سب میں بلوچستان کے مقامی مارشل لا حکام اور بیشتر میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو بھی فریق بنایا گیا تھا ۔ یہ سبھی آئینی درخواستیں تھیں جن لوگوں کی طرف سے یہ درخواستیں دائر کی گئی تھیں وہ یا تو موت کی سزا کے حقدار قرار دیئے جا چکے تھے یا بلوچستان کی مختلف جیلوں میں نظر بند تھے اور قید و بند کی سزا بھگت رہے تھے ۔

فل کورٹ کا مکمل فیصلہ مسٹر جسٹس ایم ۔ اے رشید نے لکھا اور فاضل چیف جسٹس مسٹر جسٹس خدا بخش مری اور مسٹر جسٹس عبد القدیر چودھری نے اپنے مختصر نوٹس میں اسی فیصلے سے اتفاق کیا اور اس پر اپنے دستخط ثابت کیے ۔

ذیل میں فیصلے کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے ۔:

تمام درخواست گزاروں کے خلاف صوبہ کے اندر مختلف فوجی عدالتوں میں

Marfat.com

مقدمات چلائے گئے ۔ جنہوں نے ان مقدمات کے قانونی جواز کو چیلنج کیا ہے ۔ عدالت میں یہ درخواستیں زیر سماعت تھیں کہ 16 اکتوبر 79ء کو صدارتی حکم نمبر 2 مجریہ 1979ء جاری کیا گیا جس کے تحت آئین میں آرٹیکل 212 الف کا اضافہ کر دیا گیا ۔ اسی آرٹیکل کے تحت فوجی عدالتوں کے قیام کی اجازت دیدی گئی اور ہائی کورٹ کو ان عدالتوں کے فیصلوں پر نظرثانی کے اختیار سے محروم کر دیا گیا ۔

اسی طرح صدارتی حکم نمبر 21 مجریہ 1979ء کے نفاذ کے بعد ایڈوکیٹ جنرل نے 20 اکتوبر 79ء کو درخواست گزاری جس میں موقف اختیار کیا گیا کہ آرٹیکل 212 الف کی دفعہ 3 کے مطابق یہ درخواستیں (جن کی عدالت میں سماعت جاری تھی) غیر موثر ہو گئی ہیں چنانچہ ان کی جلد سماعت کی جائے ۔ عدالت نے 28 اکتوبر کی تاریخ مقرر کر دی مگر 24 اکتوبر کو ایڈوکیٹ جنرل نے ایک اور درخواست پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ صدارتی حکم نمبر 72 نافذ ہو گیا ہے اور اب آئینی ترمیم (212 الف) کے دائرہ میں توسیع کر دی گئی ہے ۔ ایڈوکیٹ جنرل نے استدعا کی کہ ان درخواستوں کو عدالت کے مقدمات کی فہرست (کازلسٹ) سے خارج کر دیا جائے ۔

اس کے جواب میں درخواست گزاروں کے وکیل نے دو درخواستیں دائر کیں ۔ ان میں سے ایک تو ایڈوکیٹ جنرل کی درخواست کا جواب تھا اور دوسری میں بلوچستان کے چیف ایگزیکٹو کے ایک بیان کا ذکر تھا کہ آرٹیکل 212 الف کے نفاذ کے بعد مختلف فوجی عدالتوں سے دی گئی موت کی سزاؤں پر عمل درآمد کر دیا جائے گا ۔ درخواست گزار نے آئین کے اس آرٹیکل کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا تھا ۔

فاضل عدالت نے 25 اکتوبر کو ان درخواستوں پر غور کیا ۔ فاضل چیف جسٹس نے جو ڈویژن بنچ کے سربراہ تھے ' درخواستوں کی آئینی حیثیت کے پیش نظر ان کی سماعت کے لیے فل بنچ تشکیل دیا اور 28 اکتوبر 79ء کو سماعت کی تاریخ مقرر کر دی ۔

28 اکتوبر 1979ء کو فاضل فل بنچ نے یہ تنقیحات متعین کیں :۔

1۔ کیا آرٹیکل 212 الف خلاف قانون ہے ۔

2۔ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو .....

Marfat.com

(الف) آرٹیکل 212 الف اور مارشل لا آرڈر 4 کے جو آرڈر 72 کے ذریعے ترمیم شدہ ہے ' عدالتوں کے نظرثانی کے اختیارات پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں جو آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت عدالتوں کو حاصل ہیں ..... اور

(ب) آرٹیکل 212 الف فوجی عدالتوں اور ٹریبونلوں میں فیصل ہونے والے مقدمات اور ان مقدمات پر جو ان کے روبرو زیر سماعت ہیں کیا اثرات ڈالتا ہے ۔

یحییٰ بختیار ' حاجی سرفراز خاں ' محمد مقیم انصاری اور محمد نواز احمد کو عدالت کی مدد کرنے کی درخواست کی گئی ۔ وفاق کو اتارنی جنرل کے توسط سے نوٹس بھیج دیا گیا ۔

درخواست گزاروں کے وکیل نے دلائل یکم اپریل 1980ء کو مکمل کر لئے۔ اب ڈپٹی اتارنی اور ایڈوکیٹ جنرل کو دلائل پیش کرنا تھے ۔ کہ اسی دوران صدارتی حکم نمبر ایک مجریہ 1980ء جاری کر دیا گیا ۔ اس کے تحت آئین کے پارٹ 7 میں ایک نئے باب 3 الف کا اضافہ کر دیا گیا اور آرٹیکل 99 میں تین نئی دفعات شامل کر دی گئیں ۔ جن کے تحت فوجی عدالتوں کے اختیارات کے دائرہ میں آنے والے مقدمات پر عدالت عالیہ کے نظرثانی کے اختیارات ختم کر دیئے گئے ۔ درخواست دہندگان کے وکیل نے 9 جون 1980ء کو ایک درخواست کے ذریعے ان دفعات کی قانونی حیثیت کو بھی چیلنج کیا ۔ عدالت نے فریقین کے وکلا کو ان دفعات پر دلائل پیش کرنے کی دعوت دی ۔

ڈپٹی اتارنی جنرل نے اپنے دلائل میں صرف یہ کہا کہ آئین میں نئی دفعات کے اضافہ کے بعد فوجی عدالتوں کے فیصلوں یا ان عدالتوں کے زیر سماعت مقدمات کے بارے میں اعلیٰ عدالتوں میں جو درخواستیں زیر سماعت ہیں وہ از خود غیر موثر ہو گئی ہیں فوجی عدالتوں کے فیصلوں یا زیر سماعت مقدمات پر نظرثانی کے اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات بھی ختم ہو گئے ہیں ۔ ڈپٹی اتارنی جنرل نے مزید کہا کہ حکومت کی ہدایات کے مطابق وہ اس سے زیادہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتے ۔ ایڈوکیٹ جنرل نے بھی اتارنی جنرل کے دلائل کی تائید کی اور مزید کہا کہ اسے جو ہدایات ملی ہیں ان کے مطابق آرٹیکل 199 میں ترمیم (دفعات کے اضافہ) کے بعد عدالت عالیہ کے روبرو اس نوع کی کوئی درخواست ہی زیر سماعت نہیں ہے ۔

Marfat.com

عدالت نے ان دونوں لاء آفیسرز کے اس سطح تک نیچے آ جانے پر دکھ کا اظہار کیا انہوں نے کہا کہ وہ تو انہیں ملنے والی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں ۔ لیکن انہوں نے اس عدالت میں اپنے فرائض سے انصاف نہیں کیا ۔ انہوں نے آئین سے متعلق پیچیدہ امور کے بارے میں فیصلہ کرنے میں عدالت کی کوئی مدد نہیں کی ۔

اٹارنی جنرل اور ایڈوکیٹ جنرل کے دلائل کا لب لباب یہ تھا کہ چونکہ قانون دینے والوں نے سب کچھ کہہ دیا ہے لہٰذا اب عدالتوں سمیت کسی کو بات کرنے کی ضرورت نہیں ۔ یہ ایک ایسا موقف تھا جو قانون کی حکمرانی والے معاشروں میں کبھی نہیں سنا گیا ۔ امریکی سپریم کورٹ کے ایک چیف جسٹس مسٹر ہوگ نے کہا ہے " ہم ایک آئین کے ماتحت ہیں لیکن آئین وہ کچھ ہے جو جج کہیں " (ہوگ ۔ کینیڈا کا آئینی قانون صفحہ 46)

یوں عدالت کے معاون وکیل مسٹر یحییٰ بختیار نے بھی کہا کہ عدالتی نظرثانی کا اختیار دراصل عدالت کے اختیارات سے ہی نمو پاتا ہے جو اس کے دائرہ اختیار سے صاف طور پر جداگانہ ہوتے ہیں ۔ عدالت کا دائرہ اختیار آئین اور قانون ہی متعین کرتا ہے اور یہ دائرہ اختیار کسی وقت بھی سلب ہو سکتا ہے ۔ یہ عدالت تو خود آئین کی پیداوار ہے ۔ چنانچہ یہ آئین کے تحت تفویض شدہ "بنیادی اختیارات" کو بروئے کار لاتی ہے ۔ لیکن عدالت کا یہ حق ' یہ اختیار اور یہ متعین کرنے کا اختیار کہ آیا اس کے " بنیادی اختیارات " واپس لے لئے گئے ہیں ۔ " عوامی اختیار " تصور کیا جاتا ہے چنانچہ جج خود اپنے معاملے میں جج کا کردار اختیار کر لیتا ہے اور یہ متعین کرتا ہے کہ آیا اس کا کوئی عدالتی اختیار واپس لے لیا گیا ہے ۔ ؟

اسی نکتہ کو مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے "یوسف علی بنام مغربی پاکستان بار کونسل ٹریبونل " (پی ایل ڈی 1972ء اور 404) میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

ہمارے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جانا چاہئے کہ ہم ایسے " حالات " میں ہتھیار ڈال دیں گے جن میں انتظامیہ کے لئے یہ ممکن ہو کہ وہ عدلیہ کے " بنیادی اختیارات " کو سلب کر لے جو عدلیہ کو ملک میں نافذ کسی قانون کی تعبیر و تشریح کے ضمن میں

Marfat.com

حاصل ہیں ' اعلیٰ عدلیہ کو یہ اختیارات ہمیشہ حاصل رہتے ہیں جو اسے مقتدر اعلیٰ کی طرف سے تفویض ہوتے ہیں ۔ پاکستان میں "مقتدراعلیٰ" اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قانون سازی قوانین کا نفاذ اور قوانین کی تعبیرو تشریح تین الگ الگ "عمل" ہیں جو "مقتدر اعلیٰ" کے تین مختلف نمائندے جو اپنے اپنے شعبہ میں "آزاد" ہوتے ہیں' انجام دیتے ہیں۔ قانون ساز "مقتدر اعلیٰ" کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت قانون بناتے ہیں۔ انتظامیہ ان قوانین پر عمل درآمد کراتی ہے اورعدلیہ ان قوانین کی تعبیرو تشریح کا فریضہ انجام دیتی ہے چنانچہ قوانین کی تعبیرو تشریح کا حق اعلیٰ عدالتوں کا ناقابل انتقال اختیار ہے جو انہیں "مقتدر اعلیٰ" کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے اس پر کوئی پابندی لگائی جا سکتی ہے نہ اسے چھینا جاسکتا ہے۔"

..... یحی خاں کے دورمیں بھی فوجی عدالتوں میں بعض لوگوں کے خلاف مقدمات جب اعلیٰ عدلیہ نے خلاف قانون قرار دیا تو حکومت نے صدارتی حکم 3 مجریہ 1969ء جاری کیا ۔ یحی خاں کا یہ صدارتی حکم بھی اب آئین میں آرٹیکل 212 الف کے اضافہ اور آرٹیکل 199 میں تین دفعات کے اضافہ کی مانند ہی تھا بلکہ ان سے بھی کچھ بڑھ کر ہی تھا ۔ یحییٰ خاں کے صدارتی حکم کے تحت ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ سمیت تمام عدالتوں کو فوجی عدالتوں ' فوجی حکام یا مارشل لاء کے تحت کام کرنے والی کسی اتھارٹی کے کسی اقدام ' سماعت یا فیصلہ کے خلاف کسی نوع کی اپیل یا درخواست کی سماعت سے روک دیا گیا اس حکم کے پیراگراف 3 کے تحت فوجی عدالتوں کسی مارشل لاء اتھارٹی یا مارشل لاء اتھارٹی کے مطابق کام کرنے والے کسی شخص کے احکامات ' سزا ' کارروائی یا تحقیقات وغیرہ کے جواز کو کسی بھی عدالت میں چیلنج کرنے سے روک دیا گیا اعلیٰ عدالتوں کو رٹ جاری کرنے سے منع کر دیا گیا اور قرار دیا گیا کہ اگر کوئی عدالت اس نوع کا کوئی حکم جاری بھی کرے گی تو وہ غیر قانونی ہو گا۔

اس نوع کی سخت زبان کے باوجود سپریم کورٹ نے عاصمہ جیلانی کیس (پی ایل ڈی 1972 ایس سی 139) میں یحییٰ خاں کے اس صدارتی حکم کی عدالتی جانچ کی ۔

Marfat.com

اس وقت کی فوجی حکومت کی طرف سے عدالتوں کے "اختیارات" سلب کرنے کی اس کوشش کو اس دور کے اتارنی جنرل مسٹر اے کی بروہی (مرحوم) نے "بے ہودگی" قرار دیا۔ سپریم کورٹ نے اس مقدمہ میں قرار دیا کہ "..... عدالت کو بلا شبہ یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی مقدمہ کی سماعت کرے، کسی بھی معاملہ یا نزاع کا فیصلہ کرے جو اس کے سامنے پیش ہو..... خواہ یہ فیصلہ بھی کرنا ہی ہو کہ عدالت کو ایسے معاملہ میں سماعت اور فیصلہ کا اختیار بھی حاصل ہے یا نہیں ..... عدالتوں کو ہمیشہ ایسے اختیارات حاصل رہے ہیں اور یہی وہ اختیار تھا جس کے تحت اس عدالت (سپریم کورٹ) نے ڈوسو کیس میں مارشل لاء کے جواز کے سوال پر یہ بحث کی تھی۔ ..... اگر چیف جسٹس محمد منیر 1958ء میں یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ "اگر عدالت میں مناسب طور پر مقدمہ پیش کیا جائے تو اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ جو کچھ ہوا ہے 'قانون کے مطابق ہے یا نہیں" تو اس کے بعد سے عدالتوں کے اختیارات چھین لینے کے لئے کونسی نئی بات وقوع پذیر ہوئی ہے۔ جو کچھ 1985ء میں ہوا تھا آج بھی کیا جا سکتا ہے گو اس کے نتائج مختلف ہو سکتے ہیں ....."

..... جہاں تک موجودہ قانونی صورت حال کا تعلق ہے ' فاضل عدالت نے قرار دیا کہ موجودہ "قانونی نظام" محض عارضی ہے اور آئین اب بھی ملک کا "اعلیٰ ترین قانون" (سپریم لا) ہے تاہم عدالت نے قرار دیا کہ یہ آئینی انحراف کی ایک صورت ہے۔ اسی بنیاد پر ہی 5 جولائی 1977ء کے فرمان اور قانون (نفاذ میں تسلسل) کا آرڈر دونوں کو قانونی قرار دیا گیا ..... چنانچہ بیگم نصرت بھٹو کیس نئے قانونی نظام کا لازمہ ہے۔ جب تک آئین سے انحراف کی یہ صورت جاری رہتی ہے ' جیسا کہ "قانون ضرورت کے تحت" اجازت دی گئی ہے۔ نصرت بھٹو کیس موجودہ حکومت کی طرف سے کئے جانے والے آئینی اور قانونی اقدامات کی بنیاد اور جواز فراہم کرتا رہے گا .....

..... تاہم فاضل سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ آئین سے انحراف کا یہ مرحلہ ایک عارضی مرحلہ ہے اور یہ کم از کم عرصہ تک ' اس وقت تک ' جاری رہے گا جب

Marfat.com

تک " ضرورت " ہو !

..... چیف آف آرمی سٹاف کی طرف سے اقتدار کی باگ دوڑ سنبھالنے کو " قانون کے مطابق " قرار دیتے ہوئے سپریم کورٹ نے اس سوال کا جائزہ لیا ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات کیا ہوں گے اور ان کی حدود کیا ہونگی جو وہ عبوری عرصہ کے دوران استعمال کریں گے ۔ فاضل عدالت نے ان اختیارات کی توضیح اس طرح کی ہے :

" آئین سے بالا اقدامات کے ذریعے ' عوام اور ریاست کے مفاد کے تحت ' اقتدار سنبھالنے کے بعد چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر " قانون ضرورت " کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اقدامات کر سکتا ہے جو نظریہ ضرورت کے تحت عدالتی طور پر مسلمہ ہیں مثلاً

" (الف) تمام اقدامات یا قانون سازی کے اقدامات جو 1973ء کے آئین کے مطابق ہوں یا اس کے تحت کئے جا سکتے ہوں جن میں آئین میں ترمیم بھی شامل ہے ۔

" (ب) ایسے تمام اقدامات جو عوام کی بھلائی کے لئے مقصود ہوں ۔

" (ج) تمام اقدامات جو ریاست کے معاملات کو چلانے کے لئے عام طور پر ضروری ہوتے ہیں ..... اور

" (د) ایسے تمام اقدامات مارشل لا کے نفاذ کے اعلان کردہ مقاصد کو پورا کرنے والے ہونے چاہئیں یعنی امن و امان کا قیام ' ملک میں حالات کو معمول پر لانا ' جتنی جلد ممکن ہو آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد تا کہ 1973ء کے آئین کے مطابق (ملک میں) جمہوری اداروں کا قیام عمل میں لایا جا سکے ۔ "

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سپریم کورٹ نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو آئین میں ترمیم کا اختیار حاصل ہے ' واضح طور پر قرار دیا ہے کہ وہ آئین میں ترمیم صرف " قانون ضرورت " کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ہی کر سکتے ہیں .... گویا آئینی ترمیم کے ضمن میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جو کچھ بھی کریں گے اسے " قانون ضرورت " کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا ۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے بطور

Marfat.com

صدر مملکت " نظریہ ضرورت " کے تحت آئین میں آرٹیکل 212 الف کا اور آرٹیکل 199 میں تین دفعات 3 اے ' 3 بی ' اور 3 سی کا اضافہ کیا ہے ..... آرٹیکل 212 الف کے تحت چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو فوجی عدالتیں اور ٹریبونل قائم کرنے کا اختیار مل گیا ہے اور آرٹیکل 199 میں تین دفعات کے اضافہ سے کسی فوجی عدالت یا ٹریبونل کے فیصلے یا اس کی کسی کارروائی کو کسی اعلیٰ عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی عدالتیں ایسی کوئی اپیل سننے کی مجاز ہیں ۔ چنانچہ اس سوال کا جائزہ لیتے ہوئے کہ کیا اس طرح کے ہمہ گیر اقدامات کی ضرورت تھی فاضل سپریم کورٹ کے فیصلہ میں لکھا گیا ۔

.....بیگم نصرت بھٹو کیس میں " بالائے آئین " اقدامات کی اجازت اس لئے دی گئی تھی کہ " ریاست کے دو شعبے ..... مقننہ اور انتظامیہ 7 مارچ 1977ء کے بعد پیدا ہونے والے حالات میں آئینی اور اخلاقی اتھارٹی کھو چکے تھے۔" مگر جہاں تک عدلیہ کا تعلق ہے ' اسے ایسی کوئی صورت حال درپیش نہ تھی ۔

5 جولائی 1977ء کو یہی صورت حال تھی جیسا کہ قوانین (نفاذ کے تسلسل) کے آرڈر مجریہ 1977ء میں اعلان کیا گیا تھا " کہ تمام عدالتیں جو اس حکم کے نفاذ سے قبل موجود تھیں کام کرتی رہیں گی اور اپنے اپنے اختیارات اور دائرہ اختیار میں کام کرتی رہیں گی " عدالتوں کے متعلق ان حقائق کو نصرت بھٹو کیس کے فیصلے میں بھی تسلیم کیا گیا ہے ۔ گویا " انتظامیہ اور مقننہ " کی طرح ریاست کے اس شعبہ میں "عدلیہ " پر حالات کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا ۔

سپریم کورٹ نے نصرت بھٹو کیس کے فیصلہ میں لکھا تھا ..... عدالتوں کے اختیارات آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت مکمل طور پر موجود تھے ۔ اور عدالتیں یہ اختیارات ' مارشل لا ریگولیشنز اور مارشل لاء آرڈرز' صدارتی حکم میں اس کے برعکس کسی چیز کی موجودگی کے باوجود اسی طرح استعمال کرتی رہیں گی جس طرح وہ اب تک کرتی رہی ہیں ۔

چنانچہ آئین میں آرٹیکل 212 الف کے اضافہ اور آرٹیکل 199 میں تین دفعات کا اضافہ عدالتوں کے نظرثانی کے اختیارات کو سلب کرتا ہے ۔ بیگم نصرت بھٹو

Marfat.com

کیس میں سپریم کورٹ نے اعلان کیا تھا کہ عدالتوں کے اختیارات نئے قانونی نظام کا حصہ ہیں جو 5 جولائی 1977ء کے بعد معرض وجود میں آیا ہے لہٰذا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں جس کے تحت وہ عدالتوں کے اس اختیار کو ختم کر سکے چنانچہ آرٹیکل 199 میں دفعات کا اضافہ بیگم نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کی صریح خلاف ورزی کے مترادف ہے اور اس سے تجاوز کی کوشش ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر یہ تمام آئینی ترمیمات بیگم نصرت بھٹو کیس میں وضع کردہ کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں لہٰذا وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات کے منافی ہیں خواہ انہوں نے یہ ترامیم نافذ کرتے وقت بحیثیت صدر مملکت ہی اقدام کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مارشل لاء آرڈر نمبر 4 میں مارشل لاء آرڈر 72 اور 77 کے ذریعے کی جانے والی تبدیلیاں بھی غیر موثر ہیں۔ اس عدالت کو آرٹیکل 199 کے تحت وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو آئینی ترامیم سے قبل حاصل تھے۔

یہ ہیں وہ تفصیلی آئینی جواز جن کی بنیاد پر عدالت نے 2 جولائی 1980ء کو مختصر فیصلہ دیا تھا ---

"اب یہ رٹ درخواستیں زیر سماعت تصور کرتے ہوئے حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کو آخری فیصلے کے لئے عدالت کے سامنے پیش کیا جائے"

نوٹ :۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ 2 جولائی 1980ء کو جب عدالت نے ان درخواستوں پر مختصر مگر حتمی فیصلہ دیا تو اس وقت قانونی اور آئینی پیچیدگیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے خلاف از خود سپریم کورٹ میں اپیل پیش کرنے کے لئے سرٹیفکیٹ کا اجراء بھی کیا تھا۔

Marfat.com

سندھ و بلوچستان ہائی کورٹ
کے جج کی حیثیت سے مصنف اپنی
تقرری کا کراچی میں حلف اُٹھا رہے
ہیں۔ سندھ و بلوچستان ہائی کورٹ کے
چیف جسٹس جناب جسٹس
قدیر الدین احمد حلف لے رہے
ہیں۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء

کراچی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن
کے صدر جناب ایس این نصرت
مصنف کی سندھ و بلوچستان
ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت
سے تقرری پر منعقدہ تقریب میں
سپاسنامہ پیش کر رہے ہیں۔
۱۹۷۰ء

بلوچستان ہائی کورٹ
بار ایسوسی ایشن کے صدر جناب
قاضی محمد عیسیٰ مصنف کی سندھ
و بلوچستان ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت
سے تقرری کے موقع پر منعقدہ
تقریب کے حاضرین سے
مخاطب ہیں۔ ۱۹۷۰ء

Marfat.com

گورنر ہاؤس کوئٹہ میں بحیثیت گورنر بلوچستان سرکاری
فرائض ادا کرتے ہوئے مصنف کی ایک یادگار تصویر۔
۱۹۷۷ء

Marfat.com

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کے ہمراہ
کوئٹہ ایئرپورٹ پر۔ ۱۹۷۷ء

Marfat.com

امن و امان کی بحالی کے لیے ڈیرہ بگٹی میں منعقدہ بگٹی قبائل کے نمائندہ جرگہ سے بحیثیت گورنر بلوچستان خطاب کرتے ہوئے۔
جولائی ۱۹۷۷ء

گورنر بلوچستان کی حیثیت سے بحالیٔ امن و امان کے سلسلے میں گورنر ہاؤس کوئٹہ میں منعقدہ مری قبائل کے جرگہ سے خطاب کرتے ہوئے۔ ۱۹۷۷ء

Marfat.com

ماوند کے مقام پر مری قبائل کے معززین سے ملاقات کرتے ہوئے۔ جولائی ۱۹۷۷ء

یوم آزادی کے موقع پر ایوب سٹیڈیم کوئٹہ میں بحیثیت گورنر بلوچستان سلامی لیتے ہوئے۔ ۱۴ اگست ۱۹۷۷ء

Marfat.com

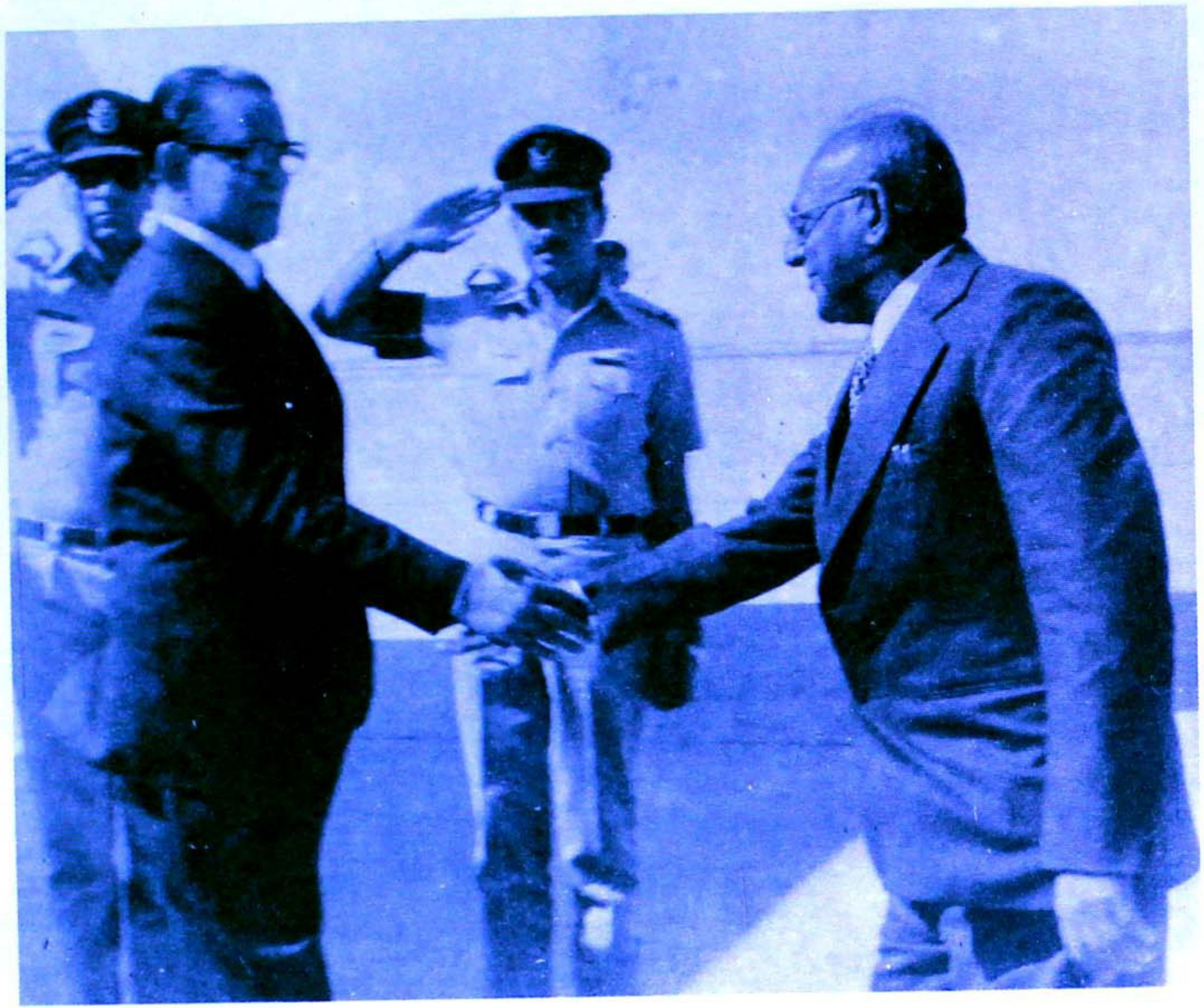

گورنر بلوچستان کی حیثیت سے کوئٹہ ایئرپورٹ پر
صدرِ مملکت جناب فضل الٰہی چودھری کا استقبال کرتے
ہوئے۔ ۱۹۷۸ء

Marfat.com

صوبہ بلوچستان کے نگران وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے کراچی میں حلف اٹھانے کے بعد کوئٹہ آمد پر بلوچستان کے گورنر جنرل (ریٹائرڈ) محمد موسیٰ خان و دیگر عمائدین نے مصنف کا استقبال کیا۔ دسمبر ۱۹۸۸ء

Marfat.com

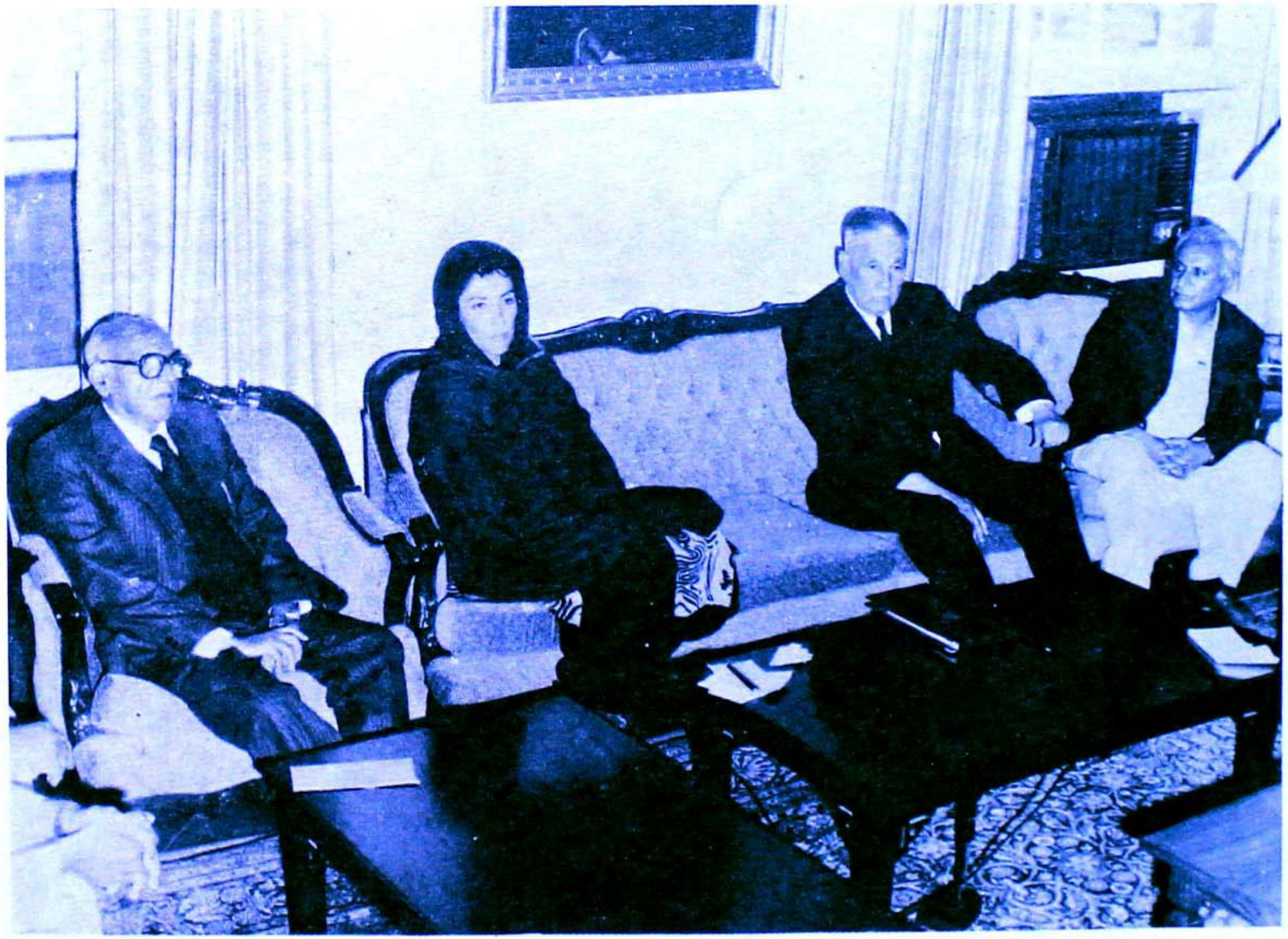

صوبہ بلوچستان کے نگران وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے
گورنر ہاؤس، کوئٹہ میں وزیر اعظم پاکستان مسز
بے نظیر بھٹو اور گورنر بلوچستان جنرل (ر) ٹیائرڈ)
محمد موسیٰ خان کے ہمراہ۔

۲۲۔ جنوری ۱۹۸۹ء

Marfat.com

باب پنجم

متعصّب اور اجارہ دار پریس

ماسوائے دو ایک کے پاکستان کے اردو اور انگریزی اخبارات ' جن میں سرکاری مقبوضہ اخبارات اور نام نہاد آزاد اخبارات بھی شامل ہیں ' کا مسلسل یہ وطیرہ بن چکا ہے کہ وہ الا ماشاء اللہ ' نہ صرف حقائق کو نظر انداز کرتے ہیں بلکہ قومی اہمیت کی خبروں اور واقعات کی غلط رپورٹنگ بھی کرتے ہیں ۔ یہ سب کچھ حکمرانوں اور وزارت اطلاعات کے بڑوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے تاکہ اخبارات کے مالکان کو ' جن کے ہاں دولت کی پہلے ہی ریل پیل ہے' سرکاری اشتہارات دلائے جائیں' لائسنس حاصل کئے جائیں' سستا نیوز پرنٹ فراہم کیا جائے اور ملکی خزانہ سے بیرونی ممالک سے دوروں کا اہتمام کیا جائے ۔

دوسرے سرکاری اداروں کی طرح پاکستان کے پریس پر سے بھی عوام کا اعتماد ختم ہو گیا ہے ۔ سرکاری ذرائع ابلاغ ٹی وی اور ریڈیو سے سنائی جانے والی خبروں کا بھی یہی حال ہے ۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ملکی واقعات کی قابل اعتماد اطلاعات کے حصول کے لئے بیشتر لوگ انگلستان کے ریڈیو بی بی سی ' وائس آف امریکہ اور ہندوستان کے آکاش وانی کی خبریں سنتے ہیں ۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان غیر ملکی نشریاتی اداروں کے اپنے مقاصد ہیں اور وہ ہر بات کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتے اور رپورٹ کرتے ہیں ۔ لیکن لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ۔ کیا یہ مناسب وقت نہیں کہ ذرائع ابلاغ کے اداروں کی اس طرح از سر نو تنظیم و تشکیل کی جائے کہ خبروں کی صحیح رپورٹنگ ہو تاکہ ان اداروں پر عوام کا اعتماد بحال ہو سکے ۔ سچ کا ہی بول بالا ہوتا ہے ۔ جھوٹ ' حیلہ سازی اور بیوروکریسی کے گھڑے گھڑائے جملے غیر موثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مسٹر جناح کے بد ترین مخالف بھی ان پر اہم قومی امور کے بارے میں غلط بیانی یا دھوکہ دہی کا الزام عائد نہیں کر سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے ان کو اپنا رہبر بنا لیا ۔ اخبارات کے لئے پابندیوں ' سنسرشپ

Marfat.com

' پریس ایڈوائس وغیرہ کا بھی اب کوئی بہانہ نہیں ۔ گزشتہ بارہ سال کے دوران چند اخبارات نے ایسی پابندیوں پر ' ماسوائے جگہ خالی چھوڑنے یا سیاح حاشیہ لگانے کے اور کچھ نہیں کیا یہ " احتجاج " بھی مختصر وقفہ کے لئے کیا جاتا رہا ہے ۔ کسی اخبار کو پابندیوں کی خلاف ورزی پر جرمانہ ہوا نہ کسی کا پریس ضبط کیا گیا اور نہ ہی کسی کے خلاف کوئی مقدمہ چلایا گیا جیسا کہ تقسیم ہند سے قبل اکثر ہوا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور آغا شورش کاشمیری کے ساتھ کیا نہیں ہوا ۔ اب اخبارات نے عوامی رائے کو پیش کرنا بند کر دیا ہے نہ ہی وہ عوام کے آلام و مشکلات کے آئینہ دار ہیں۔ بلکہ اب تو اخبارات نے خود کو ایک "کلاس" میں ڈھال لیا ہے ۔ اب وہ مشن نہیں صنعت بن چکے ہیں۔ اخبارات وزراء کے وعظ شائع کرتے ہیں ۔ سرکاری حکام کے فرمودات کو اچھالتے ہیں ۔ یا پھر اپنے شہری دوستوں یا برادری کے نام نہاد دانشوروں کے "شحات قلم" کو اپنے صفحات کی زینت بناتے ہیں۔ یہ نام نہاد دانشور ہر وقت ہر نوع کی مطلوبہ تحریر پیش کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ عموما ایک ہی مضمون کچھ وقت کے بعد یا سالانہ شائع کیا جاتا ہے اور اسے "رائے عامہ" کا خوبصورت نام دے دیا جاتا ہے ۔

دوسری طرف مالی طور پر کمزور اخبارات اور میگزین جو پڑھے لکھے نوجوان صحافی نکالتے ہیں سماجی اور معاشی ناانصافیوں کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ وہ چھوٹے صوبوں ' اقلیتوں اور خواتین کے حقوق غصب کئے جانے پر احتجاج کرتے ہیں اور ملک کی ناقص خارجہ پالیسی پر شدید تنقید کرتے ہوئے ان تمام برائیوں کو ختم کرنے کے لئے انقلابی اصلاحات کے نفاذ اور کرپشن کے خاتمہ کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ مگر اس کے جواب میں انہیں اپنے اخبارات کی بندش ' جرمانوں اور قید و بند کی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ ان چھوٹے چھوٹے اخبارات اور جریدوں کو ہی " قومی ضمیر " کا فرض انجام دینے کا کریڈٹ ملنا چاہئے ۔ وہ تحسین کے مستحق ہیں ۔ جیسا کہ (1987-88) کے حالات ہیں ۔ مجھے یقین نہیں کہ میری یہ کتاب زیور طباعت سے آشنا بھی ہوسکے گی یا نہیں ۔ کیونکہ کچھ عرصہ قبل میں نے اپنی تاریخ کی کتاب " بلوچ اور بلوچستان " کی از سر نو اشاعت کے لئے کراچی کے سات آٹھ پبلشروں سے رابطہ پیدا کیا ۔ یہ کتاب

Marfat.com

1974ء میں کراچی میں انگریزی میں شائع ہوئی تھی اس کا دوسرا ایڈیشن کوئٹہ سے شائع کیا گیا اور پھر اس کے دو اردو ایڈیشن بھی کوئٹہ سے ہی شائع ہوئے ۔ ملک کے اندر اور باہر اس کتاب کی مانگ تھی ۔ میرے رابطہ کرنے پر بعض ناشروں نے تو یہ کہہ کر جان چھڑا لی کہ ان کے پاس پہلے ہی بہت سا کام ہے اور وہ بعض وزراء وغیرہ کی کتابیں چھاپ رہے ہیں جو کافی نفع بخش اور مہنگی ہیں ۔ انہوں نے مجھے بعض کتابیں دکھائیں بھی ۔ بعض نے وعدہ کیا کہ وہ کتاب کی اشاعت کے اخراجات کا تخمینہ بنائیں گے مگر مجھے کوئی تخمینہ پیش نہیں کیا گیا ۔ لیکن بعض ناشرین نے تو مجھے کھرکھرا جواب دیا ۔ ایک یا دو نے جرات سے یہ کہا "یہ کتاب اچھی ہے ' بکے گی بھی خوب کیونکہ کراچی میں کتابیں پڑھنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے لیکن ان کے لئے اس وقت " بلوچوں اور بلوچستان " پر کوئی کتاب شائع کرنا دانشمندی سے بعید ہو گا ۔ ظاہر ہے اس میں میری بھی کتاب بھی شامل تھی ۔ اور موجودہ کتاب کی اشاعت میں جو دشواریاں پیش آئیں' دو ایک کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں ' کراچی میں دو ایک ناشروں کے جھوٹے وعدوں سے تنگ آ کر کوئٹہ میں کوشش کی ' ایک شریف آدمی جس کی مالی حالت کچھ اچھی نہیں تھی ' نے حامی بھر لی ' مگر کتاب کا مسودہ پڑھنے کے بعد گھبرا گیا ۔ مارشل لاء حکومت کی ناراضگی سے ۔ یہ 1988ء کی بات ہے پھر کسی کی سفارش پر لاہور کے ایک بڑے ناشر کو میں نے فون پر بات کر کے اس کے حامی بھرنے پر کتاب کا مسودہ لاہور بھیج دیا ۔ تقریباً چار مہینے تک مسودہ پر اس نے قبضہ جمائے رکھا ۔ جب بھی فون پر بات کرتا وہ ایک بہانہ یا دوسرا بناتا ۔ آخر کار تنگ آ کر مسودہ واپس ہی مانگا مگر وہ پھر بھی حیلے بہانے بناتا رہا ۔ آخر اس نے کہا کہ اس کی زبان سخت ہے ۔ اس کو تبدیل کریں ' میں نے کہا کہ میں نے ناول تو لکھی نہیں ' اہم قومی اور قانونی معاملات پر بحث کی ہے ۔ لہٰذا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی ۔ اس کے بعد اس کو کئی تار بھیجے وہ سمجھ گیا کہ کہیں عدالت میں نہ جانا پڑے ۔ پھر کہیں جا کر اس نے مسودہ واپس بھیجا ۔ پھر ایک سال تک مسودہ میرے پاس پڑا رہا ۔ ایک دن یوں ہی خیال آیا کہ چلئے ایک کوشش اور کریں ۔ لہٰذا میں نے فیروز سنز کے کراچی آفس میں فون کیا ۔ اور کتاب کے بارے میں ذکر کیا ۔ آفس مینجر ' " جو کہ ایک

Marfat.com

محترمہ تھیں " کے کہنے پر مسودہ ان کے دفتر لے گیا ۔ بعد میں انہوں نے مسودہ فیروز سنز مرکزی دفتر لاہور بھیج دیا ۔ اور کچھ دنوں بعد مجھے بتایا کہ ناشر صاحب نے مسودہ میں بغیر کسی ردد و بدل یا شرائط کے' کتاب چھاپنے پر رضا مندی ظاہر کر دی ہے ۔ لہٰذا اس طرح آج کتاب آپ کے سامنے ہے ۔

اب حیرت ہے کہ ناشرین کے ذہنوں پر یہ خوف کیوں سوار ہے ؟ ممکن ہے اس کی وجہ معاشرہ ہو جو برادریوں کی بنیاد پر بہت بری طرح تقسیم ہو چکا ہے اور اس معاشرہ میں ارفع قومی مفادات ' وسیع النظری ' حوصلہ اور اپنے نظریہ پر یقین اب کوئی خوبی نہیں رہے ۔ بلکہ اولین ترجیح تو اب لالچ' ہوس اور کسی بھی ذریعہ سے دولت کا حصول بن گئی ہے ۔ راتوں رات امیر ہونے کے لئے حشیش ' اسلحہ کی سمگلنگ اور رشوت کا سہارا لیا جاتا ہے ۔ پوری قوم ہی دولت کے چکر میں مبتلا ہے ۔ یوں ایک زندہ اور فعال قوم کی خوبیوں کی جگہ فرسودہ تصورات ' نام نہاد دین پسندی ' مکرو ریا اور سفید جھوٹ نے لے لی ہے ۔ وائے ناکامی ۔۔۔

کراچی اور لاہور کے متعصب اردو اخبارات اور تاجرانہ انگریزی پریس کا جن کے مالکان تقریباً ایک ہی ہیں ۔ یہ رویہ رہا ہے کہ وہ بوقت ضرورت یعنی حکومت وقت کے اشاروں پر اور اس کے بعد ذاتی پسند اور ناپسند پر سیاسی لیڈروں وغیرہ کو متعصب اور غیر محب وطن قرار دیتے رہتے ہیں گویا حب الوطنی ان کی جاگیر ہے ۔ چھوٹے صوبوں کی قیادت جو پہلے ہی قلیل تعداد میں ہے' خصوصاً ان کی نفرت کا نشانہ رہی ہے ان میں خان عبدالغفار خان' عبدالولی خان سرحد سے' میر غوث بخش بزنجو (اب مرحوم) سردار عطاء اللہ خان مینگل سردار شیر بخش مری میر گل خان نصیر' شہزادہ عبدالکریم بلوچ خان عبدالصمد خان اچکزئی مرحوم ' بلوچستان سے ' مسٹر جی ۔ ایم سید ' مسٹر ممتاز علی بھٹو سندھ سے اور سیاست میں آنے والے بعض نئے رہنما مثلاً مسٹر پلیجو' جام ساقی' مسٹر حسین بخش ناریجو اور اس سے قبل مولانا بھاشانی سید حسین شہید سہروردی' شیخ مجیب الرحمان مرحوم اور کئی دوسرے بھی شامل ہیں۔ ہمارے اخبارات جو غداری کے الزام کا کورس گاتے رہے ہیں' اس کا انجام تو ہم نے دیکھ لیا ' مشرقی پاکستان اب پاکستان کا حصہ نہیں رہا ۔ بلاشبہ اس کورس کے شور میں پریس کے ان

Marfat.com

"پہلوانوں" نے اپنے عزیز و اقربا اور برادری کو تو خوب فائدے پہنچائے لیکن چھوٹے صوبوں کے عوام کو اپنا مخالف بنا لیا اور اب ہمیں ایک نئے نعرے " مہاجرستان " یا پانچویں قومیت کا سامنا ہے ۔ ہمارے اس سفر کا انجام کہاں اور کیا ہو گا ؟ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ حالات ایسے ابتر ہو گئے ہیں کہ ہم نے بحیثیت ایک قوم تو سوچنا ہی ترک کر دیا ہے۔ اس سے بڑا المیہ شاید ہی کسی قوم کو پیش آیا ہو ۔اگر یہ سلسلہ مزید چلتا رہا تو بھیانک نتائج کے انتظار میں غالبًا زیادہ وقت کی ضرورت کم ہی ہو گی ۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے ۔

ایک دفعہ میرے ایک بااثر دوست جو نہ صرف وکالت میں میرے ہم پیشہ تھے بلکہ سیاسی ساتھی بھی تھے ' دوستی کا بھرم بھی بھرتے تھے کسی سیاسی یا شاید ذاتی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ میں بلوچستان کا چیف جسٹس بنوں حالانکہ میں اس عہدہ کے لئے موزوں تھا ۔ میں نے ہائی کورٹ میں بطور بیرسٹر دس سال پریکٹس کی تھی ۔ 6 سال تک (1976-1970) سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کا کراچی میں جج رہا تھا۔ اور میرا تعلق بھی صوبہ بلوچستان سے تھا ۔ ممکن ہے وہ کسی ایسے شخص کو چیف جسٹس بنانا چاہتے ہوں جو ان کے لئے زیادہ مناسب اور تابعدار قسم کا ہو ' میرے خلاف کوئی معقول وجہ نہ پا کر انہوں نے وزیراعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو لکھا کہ مجھے (جسٹس مری) چیف جسٹس مقرر نہ کیا جائے کیونکہ میں متعصب صوبہ پرست ہوں اور صوبائی انتظامیہ کے لئے مشکلات پیدا کرتا رہوں گا ۔ لیکن میرے دوست کی یہ گل افشانی رنگ نہ لا سکی اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے جو مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے' ان کے "ارشادات" کو سرے سے ہی نظر انداز کر دیا مجھے اس دوست کے خط کا بعد میں مارشل لا حکومت کے ذریعے علم ہوا جس نے یہ خط ایک وائٹ پیپر میں شائع کر دیا تھا ۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ میں اس وقت چیف جسٹس بلوچستان تھا ' اور وہائٹ پیپر ایک دوسرے ممتاز وکیل صاحب نے لا کر دکھایا ۔ ایسے حالات میں یہ پتہ بھی نہیں چل سکتا کہ انصاف اور بلا و رعایت سلوک کے لئے کوئی کہاں جائے ؟ میں بڑے دکھ کے ساتھ یہ بتا رہا ہوں کہ وہ دوست ' دوسرے بہت سے باخبر اصحاب کی طرح ' اچھی طرح جانتے تھے کہ میں پہلے سیاست میں یا پھر جج مقرر ہونے کے بعد ' عوام کے

Marfat.com

جمہوری حقوق اور قانون کی حکمرانی کے لئے لڑتا رہا ہوں ۔ میری یہ جمہوری جدوجہد ایوب خان سے لے کر مسٹر بھٹو کے دور تک بلکہ اس وقت تک جاری رہی جب تک میں مارچ 1981ء میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں عدلیہ سے علیحدہ نہیں ہو گیا۔ میرے بارے میں اس دوست کے منفی اور بے جا کلمات کے باوجود ' اوپر والوں کی ناراضگی کے باوصف میں نے کئی فیصلوں میں قانون کے اندر رہتے ہوئے اس کی امداد کی ۔ جہاں حکومت میرے خیال کے مطابق ان کے ساتھ زیادتی اور انتقامی کارروائی کر رہی تھی ۔ یہ سب کچھ کھلی عدالت میں ہوا ۔ اور ریکارڈ کا حصہ ہے ۔ ابن الوقتی کا یہ رویہ صرف ان صاحب پر ختم نہیں ہوتا ' اس میں بہت سے نام ہوتے ہیں۔ بہرحال ایک صاحب کا ذکر اس ضمن میں کر دینا دلچسپی کا باعث ہو گا ۔ یہ حضرت قتل کیس میں ملوث ہوئے ۔ ایوبی مارشل لا میں مجھ سے کئی دوستوں نے استدعا کی کہ ایسے حالات میں کوئی وکیل دمیش نہیں ہونا چاہتا میں نے اور چند ایک دوستوں نے اس کا بھرپور دفاع کیا ۔ اس کو سزا تو ملی ۔ مگر بعد میں مجھے مارشل لاء عدالت نے اس کے دفاع کی پاداش میں میرے خلاف فرضی کیس بنا دیا۔ اور یہ سب کچھ ریکارڈ پر موجود ہے ۔ قدرتی طور پر ان فیصلوں سے میری مشکلات میں اضافہ ہوا۔ مجھے علم تھا کہ ایسا ہو گا اس کے باوجود میں نے سچائی کا دامن نہیں چھوڑا ۔ ان کا مقصد خواہ کچھ بھی رہا ہو ۔ ایک دوست کی طرف سے اس قسم کے رویہ سے دل کو بہت تکلیف تو ہوتی ہی ہے ۔

صوبہ پرستی اور عصبیت کے ضمن میں ' مجھے بلوچستان کی چند ایک مثالیں پیش کرنے کی اجازت دیجئے ' میری جگہ اردو بولنے والے صاحب کو چیف جسٹس متعین کیا گیا ۔ انہیں سرکاری خزانہ سے قانون سے متجاوز مراعات اور مالی مفادات سے نوازا گیا ۔ یہ سب کچھ اس وقت کے گورنر اور ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر رحیم الدین نے کیا ۔ گورنر نے ان صاحب کے خاندان سے خصوصی رعایت کی اور ان کو سرکاری گھر بھی فراہم کر دیا گیا ۔ ساتھ ہی بلوچستان جیسے چھوٹے صوبے میں دو اور مہاجر حضرات کو ہائی کورٹ کا اور تین کو سیشن جج مقرر کیا۔ اب کوئی یہ پوچھے کہ بلوچستان کے تعلیم یافتہ اصل باشندے بلوچ اور پٹھانوں کے لئے کیا موقع رہ جاتا ہے ۔ یہ صرف دو ایک

Marfat.com

مثالیں ہیں ۔ مگر ہمارے اس انصاف کے چیمپئین یا کسی اور سیاسی تنظیم یا سوجھ بوجھ والے نے چپ سادہ لی اور ناانصافی برداشت کی ۔ اور آنے والے سب برداشت کرتے جا رہے ہیں ۔ مرکزی حکومت کا یہ رویہ ظاہر ہے صوبوں اور لوگوں کے دلوں کو قریب نہیں لا سکتا صرف زبانی جمع خرچ اور تقریر بازی سے کام نہیں سدھر سکتا جبکہ جب موقع ملے تو ایک دوسرے کی پگڑی بھی اپنے گروہ' ہو یہ یا زبان بولنے والوں کے سر باندھ لے ۔ اب اس میں متعصب کون ہے۔

میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کیونکہ وہ صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن یہ سب باتیں حکومت کے ریکارڈ میں موجود ہیں ۔ پھر ایک اردو بولنے والے سیشن جج کو سندھ ' بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے بعض الزامات کی بناء پر ملازمت سے برطرف کر دیا ۔ وہ چھ سات سال سے بلوچستان ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے تھے ۔ ہائی کورٹ کے ایماء کے خلاف ان صاحب کو ملازمت میں واپس لایا گیا ۔ پہلے تو انہیں سیشن جج مقرر کیا گیا اور معمولی عرصہ کے بعد عدلیہ کے تمام قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہیں ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا ۔ اردو بولنے والے ایک اور وکیل کو ' بلوچستان کی عدلیہ کی تاریخ میں پہلی اور آخری بار ' ڈپٹی اٹارنی جنرل مقرر کیا گیا اور جلد ہی اسے بلوچستان ہائی کورٹ کا جج بنا دیا گیا ۔ جہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد اب وہ ایک اور سرکاری ملازمت بھگتا رہے ہیں ۔ اس طرح کی کئی اور بھی مثالیں دوسرے محکموں میں بھی موجود ہیں اس طرح پنجابی اور صوبہ سرحد کے لوگ جو کہ اقتدار میں ہوتے ہیں تو اقربا پروری کے لئے چھوٹے صوبوں کے حقوق غصب کرتے رہتے ہیں۔ لیکن نہ تو انہیں ضمیر کی چبھن کا احساس ہوتا ہے اور نہ انہیں عوامی محاسبہ کا کوئی خوف ہے ۔ یہ سب کچھ اس وقت کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور گورنر لیفٹننٹ جنرل رحیم الدین نے کیا تھا ۔ اس سے پہلے بھی بلوچستان کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے کیا کسی اردو اخبار ' مقامی یا دوسرے نے اس بارے میں ایک لفظ احتجاج لکھا ؟ اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ یہ "برادری" کا معاملہ تھا ۔ بھلا اس کے سوا ' جو کچھ ہوا ' اس کا اور کیا سبب تھا ؟

موضوع سے ہٹ جانے پر میری معذرت قبول کیجئے ۔ میں تو اپنے پریس کی

Marfat.com

معروضی رپورٹنگ اور غیر ملکی پریس کی " مقصدی " رپورٹنگ کی بات کر رہا تھا۔ جب بلوچستان ہائی کورٹ نے 1973ء کے دستور کے آرٹیکل 212 میں ترمیم (212 الف) کو جو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر کی جاری کردہ تھی کالعدم قرار دیا۔ یہ فیصلہ دور رس نتائج کا حامل تھا اور اس کی گونج ملک کی عدالتی تاریخ میں تادیر سنائی دیتی رہے گی۔ اسلام آباد کے روزنامہ " مسلم " نے 3 جولائی 1980ء کو چھٹے صفحہ پر " صوبائی خبروں " کے کالموں میں اس کی خبر عام معمولی خبروں کے ساتھ شائع کی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس اہم فیصلہ کا تعلق کسی ایک یا دوسرے صوبہ کے ساتھ نہ تھا بلکہ یہ فیصلہ تو بنیادی ملکی قانون سے متعلق تھا۔ خبر کچھ اس طرح تھی۔

" بلوچستان ہائی کورٹ کہتی ہے۔

ترمیم آئین کے منافی ہے۔

از مقصود آصف کوئٹہ 2 جولائی

" اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی دفعہ 195 اور 212 میں ترمیم کو بلوچستان ہائی کورٹ کے فل بنچ نے خلاف آئین (کالعدم) قرار دے دیا ہے۔

عدالت کا مختصر فیصلہ حسب ذیل ہے۔

" ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں آرٹیکل 212 الف اور آرٹیکل 199 میں دفعات الف ' ب اور ج کا اضافہ خلاف آئین ہے۔ یہ ترامیم چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ان اختیارات سے تجاوز ہیں جو بیگم نصرت بھٹو کیس میں تسلیم کئے گئے ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس مقدمہ میں پیچیدہ آئینی تشریح و توضیح موضوع و مباحث ہیں ' ہم اجازت دیتے ہیں کہ اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی جا سکتی ہے "۔

" اس فیصلہ کا اعلان فل بنچ نے متفقہ طور پر کیا جس کے متعلق مختصر حکم آج جاری کیا گیا۔ یہ فیصلہ اسلم چشتی ایڈووکیٹ احسان الحق اور طاہر محمود خان کی رٹ درخواستوں کی دو روزہ سماعت کے بعد دیا گیا۔ رٹ درخواستوں میں درخواست دہندگان نے ان آئینی ترامیم کے بارے میں ہائی کورٹ سے فیصلہ کی استدعا کی تھی۔

" ہائی کورٹ اپنا تفصیلی فیصلہ بعد میں لکھے گی۔ فل بنچ چیف جسٹس خدا بخش

Marfat.com

مری ' جسٹس محمد عبدالرشید اور جسٹس عبدالقدیر چوہدری پر مشتمل تھا۔

"کوئٹہ کے تین سینئر وکلاء مقیم انصاری ' حاجی سرفراز خان اور بیرسٹر یحی بختیار نے اس معاملہ میں عدالتی وکیل کی حیثیت میں اپنے دلائل پیش کئے ۔ ڈپٹی اٹارنی جنرل مفتخرالدین اور بلوچستان کے ایڈووکیٹ جنرل بشارت اللہ حکومت کی طرف سے پیش ہوئے ۔"

اس کے برعکس اس فیصلہ کے بارے میں "فار ایسٹرن اکنامک ریویو" ہانگ کانگ کے لارنس لائف شلز کی غیر جانبدارانہ اور تجزیاتی رپورٹ ملاحظہ کیجئے جس میں حکمرانوں کی طرف سے ممکنہ انتقامی کارروائی کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ رپورٹ اس جریدہ کے شمارہ 13 مارچ 1981 صفحہ 21 اور 22 پر شائع ہوئی یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس رپورٹ کی اشاعت کے دو ہفتے بعد ہی "عبوری آئین کا حکم (پی سی او) جاری کیا گیا جس کے تحت تمام اختیارات عملی طور پر ایک شخص کے ہاتھ میں دیدئے گئے ۔ لارنس لائف شلز کی رپورٹ درج ذیل ہے ۔

"ایک بنیادی مباحث"

بلوچستان ہائی کورٹ نے پھانسی کی سزاؤں پر عمل اس وقت تک روک دیا جب تک وسیع تر آئینی اور قانونی امور پر بحث مکمل نہ ہو جائے ۔ از لارنس لائف شلز

"کوئٹہ :۔ بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ سے 50 میل شمال میں قلعہ نما اور زبردست حفاظتی انتظامات کے لئے بدنام جیل خانہ "مچھ سنٹرل جیل" ہے ۔ یہ جیل خانہ سے زیادہ ایک فوجی کیمپ معلوم ہوتی ہے ۔ اس کی بلند دیواروں کے پیچھے نو افراد بند ہیں جنہیں موت کی سزا کا حکم سنایا جا چکا ہے ۔ ان نو افراد کی جانیں ایک آئینی ' متنازعہ بحث کا مرکزی کردار بن چکی ہیں جو پاکستان میں ' جہاں مارشل لاء نافذ ہے ' ایک الگ نوعیت اختیار کر چکی ہے ۔

"صوبہ کی سب سے بڑی عدالت کے ججوں اور مقامی مارشل لاء حکام کے رو در رو ' عدالت کے ججوں نے 8 دسمبر 1980ء کو ان نو سزا یافتگان میں سے ایک 21 سالہ طالب علم اور بلوچستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ۔ ایس ۔ او) کے مبینہ رکن عبدالحمید بلوچ کی سزائے موت پر عمل درآمد روک دیا ہے ۔

Marfat.com

" حمید بلوچ کا مقدمہ ان متعدد مقدمات میں سے ایک ہے جن میں بلوچستان ہائی کورٹ نے سزائے موت اور دوسری سزاؤں پر عمل درآمد روک دیا ہے جو اس دور افتادہ صوبہ میں قائم فوجی عدالتوں اور ٹریبونلوں نے سنائی ہیں ۔ بلوچستان ہائی کورٹ کے فیصلوں نے پاکستان کی عدلیہ کو ملک کے ججوں کے حقوق اور اختیارت کے متعلق نہایت سنجیدہ بحث میں الجھا دیا ہے کہ ملک کی سپریم کورٹ کے 1977ء کے فیصلہ کی رو سے موجودہ مارشل لاء اور آئین کے درمیان کیا " رشتہ " ہے ۔ اس وقت سپریم کورٹ نے مارشل لاء حکومت کو ایک غیر معمولی قانونی اصول " نظریہ ضرورت " کے تحت قانونی جواز بخش دیا تھا ۔ تاہم سپریم کورٹ نے جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت کو ایک واضح دائرہ کے اندر رہتے ہوئے " قانونی " قرار دیا تھا ۔ سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ مارشل لا ایک عارضی مگر ناگزیر قانونی انحراف ہے اور مارشل لاء حکام پر واجب قرار دیا کہ وہ جلد از جلد منصفانہ اور آزادانہ انتخابات منعقد کرائیں گے ۔ عدالت عظمیٰ نے اپنے فیصلہ میں قرار دیا کہ مارشل لا سردست عارضی طور پر جاری رکھا جا سکتا ہے لیکن اس دوران اعلیٰ عدالتیں مارشل لا حکام کے کسی حکم یا اقدام کے قانونی جواز کا جائزہ لے سکیں گی ۔ جسے ان کے روبرو چیلنج کیا جائے گا ۔ آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت اعلیٰ عدالتوں کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ قائم اور پوری طرح نافذ العمل رہیں گے ۔

" پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 199 میں کہا گیا ہے کہ صوبائی عدالت عالیہ حکومت کے انتظامی افسروں یا حکام کو " ایسے کاموں سے باز رہنے کا حکم صادر کر سکیں گی جو قانون کے تحت وہ نہیں کر سکتے " عدالت کسی ایسے کام یا اقدام کا حکم بھی دے سکتی ہے جو قانون کے تحت حکام پر کرنا واجب ہو ۔ یہ وہ آرٹیکل اور بعض دوسرے آئینی امور ہیں جو بلوچستان کی ہائی کورٹ میں زیر بحث ہیں ۔ ان امور کا پورے ملک کے قانونی نظام سے گہرا تعلق ہے ۔

" تنازعہ کا موجودہ مرحلہ اکتوبر 79ء کے اواخر میں شروع ہوا جب صوبہ بلوچستان کے فوجی گورنر لیفٹیننٹ جنرل رحیم الدین خان نے اعلان کیا کہ فوجی ٹریبونلوں نے قتل عمد کے مجرموں کو موت کی جو سزائیں دی ہیں اور جن کی توثیق صدر پاکستان نے

Marfat.com

بھی کر دی ہے ۔ ان پر جلد ہی عمل درآمد کیا جائے گا ۔ موت کی ان سزاؤں کے خلاف پہلے ہی ہائی کورٹ میں اپیلیں دائر کی جا چکی تھیں ۔ ان اپیلوں میں دوسری وجوہ کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ٹریبونلوں کی کارروائی کے دوران مناسب اور کافی تحفظات (ملزموں کو) فراہم نہیں کئے گئے چنانچہ ان ٹریبونلوں میں منصفانہ سماعت ممکن نہیں اور فوجی عدالتوں کو قانون کے تحت ان مقدمات کی سماعت کا بھی اختیار نہیں ابھی ان اپیلوں کے قانونی جواز پر غور و فکر جاری تھا کہ بلوچستان ہائی کورٹ نے موت کی تمام سزاؤں پر عمل درآمد روک دیا ۔

" 25 اکتوبر 1979ء کو گورنر کے بیان کے دوسرے روز ' مچھ جیل میں مقید افراد کے وکلاء کوئٹہ میں عدالت عالیہ میں پیش ہوئے ۔ انہوں نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ ہائی کورٹ کے حکم امتناعی کے باوجود ان کے موکلوں کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر خدا بخش مری نے خوابی طور پر ایک نیا حکم امتناعی جاری کر دیا ۔ انہوں نے جیل حکام کو حکم دیا کہ وہ ان افراد کو سزائے موت دینے سے گریز کریں ۔ اور عدالت عالیہ کے تمام احکامات پر' جو قبل ازیں جاری ہو چکے ہیں ' سختی سے عمل کریں ۔

" کوئٹہ کے قانونی حلقوں کے مطابق صوبہ کے فوجی حکام نے جیل کے کارپردازوں کو حکم دیا کہ وہ موت کی سزاؤں پر عمل درآمد کریں لیکن بلوچستان ہائی کورٹ کے اہل کاروں نے مچھ جیل کے حکام کو دوبارہ یاد دلایا کہ موت کی سزاؤں پر عمل درآمد نہ صرف غیر قانونی ہو گا بلکہ یہ توہین عدالت کے مترادف بھی ہو گا ۔ اس پر جیل حکام نے صوبہ کے مارشل لاء حکام کو مطلع کیا کہ اگر فوجی حکام کسی شخص کو موت کی سزا دینا چاہتے ہیں تو وہ خود جیل میں آئیں اور یہ فریضہ خود ہی انجام دیں ۔ جیل کے حکام ' خود کو توہین عدالت کا مرتکب نہیں بنانا چاہتے نہ ہی وہ اس کے نتیجہ میں گرفتاری کا خطرہ مول لینا چاہتے ہیں کیونکہ کسی شخص کو قانونی اختیار کے بغیر پھانسی دینے پر ان کے خلاف قتل عمد کا مقدمہ درج ہو سکتا ہے ۔

" صوبہ کے فوجی حکام کو بھی یہ بتا دیا گیا کہ اگر کسی فوجی افسر یا سپاہی نے عدالت عالیہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی " مجرم " کو پھانسی دی تو سزا پر عمل

Marfat.com

درآمد کا حکم دینے والے اور عمل درآمد کرنے والے دونوں کو توہین عدالت کا مجرم قرار دیا جائے گا اور مستقبل میں کسی روز انہیں قتل عمد کے الزام میں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے ۔ بلوچستان ہائی کورٹ کے جج اپنے موقف پر ڈٹ گئے ۔ اور فتح ان کی ہوئی ۔ فوجی حکام نے سزائے موت پر عمل درآمد کے لئے کوئی مزید اقدام نہ کیا ۔

" عبدالحمید بلوچ کے مقدمہ سے ' جو ان دنوں بلوچستان ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے ' پاکستان کے مختلف فوجی ٹریبونلوں کے جواز اور کارروائی کے متعلق کئی قانونی اور آئینی تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حمید بلوچ کو 9 دسمبر 1979ء کو گرفتار کیا گیا تھا ۔ اس پر عمان کے سلطان کی فوج کے ایک بھرتی آفیسر کرنل خلفان ناصر پر قاتلانہ حملہ کا الزام ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ تربت " مکران " میں پیش آیا جو جنوبی بلوچستان میں واقع ہے ۔ عمانی فوج میں بہت سے سپاہی " کرائے کے سپاہی " ہیں جو مکرانی بلوچوں میں سے بھرتی کئے گئے ہیں ۔ استغاثہ کے مطابق کرنل خلفان ناصر پر تین فائر کئے گئے مگر خوش قسمتی سے کرنل کو گولی نہیں لگی بلکہ ایک اور شخص جس کا نام حکام نے پہلے غلام رسول بتایا تھا گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا ۔ اس شور و غل کے دوران جو وہاں بھرتی کے ہزاروں امیدواروں میں فائرنگ کے باعث پھوٹ پڑا تھا حمید بلوچ کو گرفتار کر لیا گیا ۔ اگرچہ اس " جرم " کے لئے پاکستان کی سول عدالتوں میں مقدمہ چلانے کا قانون موجود ہے ۔ مگر حمید بلوچ کا مقدمہ فوجی عدالت نمبر چار میں پیش کر دیا گیا یہ عدالت تربت میں قائم تھی اور اس کے سربراہ لیفٹیننٹ کرنل اکرام نبی تھے ۔

پولیس کے مطابق اس جرم کا مقصد یہ تھا کہ " ملزم کا تعلق بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (B.S.O) سے ہے جو جمہوریت پر یقین رکھتی ہے ۔ عدالت کے سرکاری ریکارڈ کے مطابق مدعی نے عدالت کو بتایا کہ " بی ۔ ایس ۔ او کو یقین ہے کہ مسقط (عمان) کی فوج کے لئے جو جوان بلوچ بھرتی کئے جاتے ہیں انہیں سلطان قابوس ظفاریوں کے خلاف جنگ میں استعمال کریں گے جو مسقط میں جمہوریت کے نفاذ کے لئے سلطان کے خلاف گوریلا جنگ میں مصروف ہیں ۔ چنانچہ ملزم نے بھرتی روکنے کے لئے کرنل خلفان ناصر پر فائرنگ کی اس کا ارادہ عمانی فوج کے اس افسر کو ہلاک کرنے

Marfat.com

کا تھا"۔

"استغاثہ کے برعکس وکیل صفائی نے یہ موقف اختیار کیا کہ حمید بلوچ بے گناہ ہے۔ وہ خود عمانی فوج میں بھرتی کا امیدوار تھا اور اسی مقصد کے لئے تربت گیا ہوا تھا ۔ اسے محض قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے تاکہ بی۔ ایس۔ او کو بدنام کیا جا سکے۔ لیکن عدالت عالیہ میں حمید بلوچ کی طرف سے جو اپیل دائر کی گئی ہے اس میں فوجی ٹریبونل میں مقدمہ کی سماعت اور گواہی کے طریق کار کو چیلنج کیا گیا ہے۔ فوجی عدالت میں مقدمہ کی سماعت کے دوران جب سات گواہان استغاثہ کی شہادت دے چکے تھے اور کہہ چکے تھے کہ حمید بلوچ نے غلام رسول کو ہلاک کیا ہے' اچانک استغاثہ نے فرد جرم میں تبدیلی کر دی اور موقف اختیار کیا کہ حمید بلوچ نے غلام رسول کو نہیں' عبدالرزاق کو ہلاک کیا ہے۔ اس پر صفائی کے وکلاء نے اعتراض کیا اور کہا کہ مقدمہ کی نصف سماعت مکمل ہو جانے کے بعد مقتول کا نام اچانک تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وکیل صفائی نے اس بنیاد پر مقدمہ خارج کرنے کی درخواست پیش کی لیکن فوجی ٹریبونل نے یہ درخواست مسترد کر دی۔

اس کے بعد وکیل صفائی نے استغاثہ کے تمام گواہوں کو دوبارہ بلانے کی درخواست کی جو قبل ازیں گواہی دے چکے تھے اور یہ کہہ چکے تھے کہ حمید بلوچ نے غلام رسول کو قتل کیا ہے۔ یہ درخواست بھی مسترد کر دی گئی۔ اچانک وکیل صفائی کی طرف سے عبدالرزاق کے والد کو عدالت میں پیش کیا گیا جس نے ٹریبونل کو بتایا کہ اس کا بیٹا تو زندہ ہے استغاثہ کے پے در پے اعتراضات کے بعد فوجی عدالت کے صدر نے ایک بار پھر فرد جرم میں تبدیلی کر دی اور پہلی فرد جرم کے مطابق مقتول کا نام غلام رسول ہی کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں حمید بلوچ پر ایک بار پھر غلام رسول کے قتل کا الزام عائد کر دیا گیا۔ صفائی کے وکیل محمد اسلم چشتی نے اعلان کیا کہ مقتول کے بارے میں شدید اختلاف موجود ہے۔ مگر فوجی ٹریبونل نے مقدمہ کی سماعت جاری رکھی اور حمید بلوچ کو قتل کا مجرم قرار دے کر سزائے موت سنا دی۔

"کوئٹہ کے قانونی حلقوں کے مطابق وکیل صفائی کو فرد جرم کی نقل ہی فراہم نہیں کی گئی جو دوسری بار' مقدمہ کی سماعت کے دوران' تبدیل کی گئی تھی۔ لہٰذا فنی

Marfat.com

طور پر حمید بلوچ کو ایک ایسے شخص کے قتل کے جرم میں موت کی سزا سنائی گئی جو زندہ ثابت ہو چکا ہے ۔ مقدمہ کے نصف گواہوں نے شہادت دی کہ حمید نے غلام رسول کو قتل کیا ہے جبکہ باقی نصف نے کہا کہ ہلاک ہونے والا عبدالرزاق ہے ۔ اگر مقتول کی شناخت ہی متنازعہ ہوتو قانونی حلقوں کے مطابق یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ اسے حمید بلوچ نے ہی قتل کیا ہے ۔

" یہ مقدمہ عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے کیونکہ عدالت عالیہ حمید بلوچ اور ٹریبونلوں سے موت کی سزا پانے والے دوسرے افراد کی اپیلوں کی سماعت کر رہی ہے اور اس دوران بعض اہم قانونی نکات اٹھائے گئے ہیں ۔ گذشتہ دو سالوں کے دوران پاکستان کے فوجی حکام نے دو آئینی ترامیم جاری کی ہیں جن کے باعث ملک کی قانونی برادری کو شدید مشکلات درپیش ہیں ۔ پہلی آئینی ترمیم میں جو آئین کے آرٹیکل 212 الف کی صورت میں نافذ کی گئی ' سول عدالتوں کو مقدمات کے فیصلوں پر نظرثانی کے اختیارات سے محروم کر دیا گیا جو آئین کی رو سے انہیں حاصل ہیں ۔ مئی 1980ء میں ایک اور فرمان کا نفاذ عمل میں لایا گیا جس کے تحت آئین کے آرٹیکل 199 میں تین دفعات کا اضافہ کر دیا گیا ۔ ان ترامیم کے تحت اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات میں کمی کر دی گئی اور انہیں کسی مارشل لاء ریگولیشن یا مارشل لاء آرڈر کے قانونی جواز یا فوجی عدالتوں کے حکم سزا یا فیصلہ یا کسی بھی اقدام یا کارروائی کے قانونی جواز کے بارے میں حکم جاری کرنے کی ممانعت کر دی گئی ۔ ان احکام کے تحت کسی بھی شخص ' یا حاکم مجاز کے بارے میں کسی طرح کے حکم کے اجراء کی ممانعت کر دی گئی جو مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے احکام کے تحت کام کر رہا ہو ۔ (جنرل ضیاء الحق چیف مارشل لاء لا اینڈ منسٹریٹر تھا ۔)

" آئین میں آرٹیکل 212 الف کے اضافہ کے بعد ہی بلوچستان کی فوجی حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ فوجی عدالتوں سے سنائی جانے والی موت کی سزاؤں پر عمل درآمد کر دیا جائے گا ۔ اس پر " مجرموں " کے وکلاء نے اسلم چشتی ایڈووکیٹ کی قیادت میں عدالت عالیہ میں سزائے موت کے خلاف از سر نو حکم امتناعی جاری کرنے کے لئے اپیلیں دائر کر دیں ۔ انہوں نے فوجی احکام کے تحت آئین میں ترامیم کے

Marfat.com

عمل کو بھی الگ سے چیلنج کیا ۔ بلوچستان ہائی کورٹ اور صوبہ کے فوجی حکام کے درمیان محاذ آرائی کے بعد موت کی سزاؤں پر عمل درآمد روک دیا گیا ۔ اور عدالت عالیہ کے فل بنچ نے اس آئینی پوزیشن کا جائزہ لینا شروع کیا کہ سول عدلیہ کو ہی بالادستی حاصل ہے یا نہیں ؟ چنانچہ بلوچستان ہائی کورٹ نے ایک ایسا فیصلہ صادر کیا جو پاکستانی عدالتوں کی طرف سے کئے جانے والے فیصلوں میں سے سب سے اہم فیصلہ کے طور پر سالوں پڑھا جائے گا اور اسے نظیر کے طور پر پیش کیا جائے گا اس ہائی کورٹ نے فیصلہ دیاکہ اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات کو محدود کرنے والی تمام آئینی ترامیم کاکوئی جواز نہیں اور یہ سب غیر موثر ہیں ۔

" جج صاحبان نے مارشل لاء حکام کو یاد دلایا کہ 1977ء میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا تھا کہ اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات مکمل طور پر موجود ہیں اور وہ اپنے ان اختیارات کو ' مارشل لاء ریگولیشنز ' صدارتی احکام یا آرڈی نینسوں کے باوجود استعمال کرنے کی پوری طرح مجاز ہیں ۔

" آئینی ترامیم کو چیلنج کرنے والوں کی درخواستوں کی سماعت کے ساتھ بلوچستان ہائی کورٹ نے مارشل لا حکام کو دعوت دی کہ وہ بھی عدالت میں اپنا موقف پیش کریں ۔ چنانچہ فوجی حکام کی طرف سے ڈپٹی اٹارنی جنرل پیش ہوئے انہوں نے صرف یہ دلیل پیش کرنے پر اکتفا کیاکہ عدالت عالیہ کے اختیارات سلب کر لئے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے اپنے اس موقف کی وضاحت سے بھی انکار کر دیا کہ "حکومت کی طرف سے مزید دلائل دینے کی ضرورت ہی نہیں " اس پر جسٹس رشید نے عدالت کی طرف سے جواب دیا " ڈپٹی اٹارنی جنرل اور ایڈووکیٹ جنرل کے دلائل کا مطلب یہ ہے کہ :۔ قانون بنانے والا بول چکا ۔ اب کسی کی طرف سے کوئی بات کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ عدالت بھی کچھ نہیں کہہ سکتی ۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں قانون کی حکمرانی ہو ' اس نوع کے طرز عمل کی کوئی نظیر نہیں ملتی " ۔

" عدالت عالیہ نے ابتدائی طور پر فیصلہ سنا دیا ہے فیصلہ یہ ہے کہ عدالت عالیہ کو بلاشبہ اس امر کا جائزہ لینے کا مکمل اختیار حاصل ہے کہ آئین کے آرٹیکل 199 اور 212 میں ترمیم کے فرمان کا کوئی قانونی جواز ہے یا نہیں ۔ عدالت نے اس معاملہ

Marfat.com

میں رسمی طور پر فیصلہ صادر نہیں کیا۔ مگر عدالت کو توقع ہے کہ وہ اس معاملہ کی مکمل سماعت جلد ہی کرے گی اور وہ زیادہ تفصیل اور گہرائی میں جا کر اس آئینی معاملہ کا جائزہ لے گی۔ ضیاء حکومت کا المیہ یہ ہے کہ اگر آئینی ترامیم کو عدالتوں نے خلاف قانون اور بلا جواز قرار دے دیا اور حکومت نے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی تو اس اپیل کی واحد بنیاد' جو حکومت پیش کر سکتی ہے' سپریم کورٹ کے اس فیصلہ سے متصادم ہو گی جس کے تحت عدالت عظمیٰ نے نومبر 1977ء میں یہ رولنگ دی تھی کہ فوجی حکومت عبوری نوعیت کی ہے باور کیا جاتا ہے کہ وفاقی فوجی حکام اس طرح کی اپیل دائر کرنے میں متحمل ہیں کہ مبادا وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی ہی خلاف ورزی کے مرتکب قرار پائیں جس کے تحت انہیں ایک عبوری دور کے لئے حکومت کا اختیار دیا گیا تھا۔

" بلوچستان ہائی کورٹ ملک کے چاروں صوبائی عدالت ہائے عالیہ میں سے واحد ہائی کورٹ ہے جس نے اس اہم اور حساس مسئلہ پر غور کرنے کی جرات کی ہے بہت سے مبصرین کا خیال ہے کہ عدالت کا یہ فیصلہ صوبہ کے عام سیاسی حالات سے مکمل طور پر الگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلوچستان میں قیدیوں خصوصاً سیاسی قیدیوں کو پھانسی پر لٹکانا بے حد حساس' نازک اور انتہائی تلخ معاملہ ہے۔

" 1961ء میں مارشل لاء حکام نے چھ قبائلی سرداروں کو' جنہوں نے سردار نوروز خان کی قیادت میں فوجی حکومت سے بغاوت کی تھی' پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پاکستان کے پہلے مارشل لاء کا دور تھا۔ ان سرداروں کو اس امر کے باوجود گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکایا گیا' کہ وہ حکومت کے ساتھ جنگ بندی اور مکمل معافی کے معاہدہ کے بعد جو قرآن حکیم پر ہاتھ رکھ کر کہا گیا تھا۔ پہاڑوں میں اپنی کمین گاہوں سے باہر آئے تھے۔ یہ لوگ آج تک صوبہ میں شہداء تصور کئے جاتے ہیں۔ بلوچستان ملک بھر میں صوبائی اور وفاقی سطح پر جمہوری حقوق طلب کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے علاوہ ازیں بلوچستان کے عوام کے دلوں میں 77-1973 کی بغاوت کی یادیں آج بھی محفوظ ہیں جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے دوران منتخب صوبائی قیادت کو' شہنشاہ ایران کے ایماء پر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ایران پاکستان کا ہمسایہ ملک ہے جس کے

Marfat.com

پاکستان سے ملنے والے سرحدی علاقوں میں بلوچوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے ۔

" بلوچستان ہائی کورٹ نے اب تک تو جلادوں کو صوبہ کی جیلوں کے دروازوں سے دور رکھا ہے ۔ پاکستان بار ایسوسی ایشن کے نمائندوں کا کہنا ہے کہ گذشتہ ساڑھے تین سالوں کے دوران اس سے قبل کے تیس سالوں کی نسبت زیادہ افراد کو پھانسی پر لٹکایا جا چکا ہے ۔ ضیاء الحق نے ایک سنگین تسلسل کے ساتھ سزائے موت پانے والوں کی رحم کی اپیلیں مسترد کی ہیں ۔ انہوں نے رحم کی درخواستیں لے کر آنے والوں سے کہا ہے کہ چونکہ انہوں نے بھٹو کی رحم کی اپیل مسترد کر دی تھی لہٰذا وہ اب کسی اور کی اپیل منظور کر کے اپنے فعل میں عدم مطابقت کا مرتکب ہونا نہیں چاہتے ۔ اب تک صرف ایک استثنیٰ سامنے آیا ہے جس کا تعلق شبنم ڈکیتی کیس سے ہے ۔ شبنم جو پاکستان کی ایک معروف اور مقبول فلمی اداکارہ ہے ' اس کے گھر پر چند نوجوانوں نے حملہ کیا ۔ انہوں نے شبنم کا گھر لوٹ لیا اور اسے "پامال" کیا ۔ حملہ آور اعلیٰ سول اور فوجی افسروں کے بیٹے تھے ۔ ضیاء الحق نے ان سب کی سزائے موت معاف کر دی تھی ۔

" دریں اثناء بلوچستان ہائی کورٹ اس بات پر غور کی تیاری کر رہی ہے کہ صوبہ اور ملک میں آئین یا قانون ضرورت میں سے کس کی حکمرانی ہے ۔"

میں ملک کے سیاسی ' اقتصادی یا معاشرتی معروضی حالات کے حوالے سے پاکستان کے اختیارات کے یک طرفہ ' متعصبانہ اور غیر ملکی اخبارات کی غیر جانبدارانہ رپورٹنگ کے انداز پر گفتگو کر رہا تھا ۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے علم اور تجربہ میں آنے والی چند مثالیں پیش کروں ۔ مجھے یقین ہے کہ سیاستدانوں ' سماجی کارکنوں اور لکھنے پڑھنے والوں کو اس سے بھی بدترین حالات پیش آ سکتے ہیں ۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات اور نام نہاد ریفرنڈم کے بعد میں نے اس دور کے نمایاں ترین آئینی ترامیم کے مسائل پر ایک مضمون کا پہلا حصہ قلمبند کیا اس مضمون میں آئینی ترامیم کے مضمرات اور اثرات ' کا ذکر کیا گیا تھا ۔ اس مضمون کی اشاعت کی غرض سے میں نے اپنے دفتر سے کراچی کے معروف انگریزی روزنامہ کے ایڈیٹر کو فون کیا اور انہیں مضمون بھیج دیا ۔ ایڈیٹر صاحب نے مجھے جواباً فون کیا

Marfat.com

اور میرے مضمون کی تعریف کی ۔ انہوں نے فرمائش کی کہ میں مضمون کے باقی دو حصے بھی مکمل کر دوں ' وہ پورا مضمون شائع کر دیں گے ۔ میں نے ایک ہفتہ تک سخت محنت کی ۔ مجھے یقین تھا کہ ایک ایڈیٹر صاحب نے مجھ سے مضمون شائع کرنے کا وعدہ کیا ہے ۔ مضمون مکمل کیا اور اپنے پیش کار کے ذریعے ایڈیٹر صاحب کو بھجوا دیا ۔ میری اس ایڈیٹر سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی ۔ تاہم میرا مضمون لے لیا گیا ۔ کوئی دو ہفتے انتظار کیا مگر مضمون شائع نہ ہوا ۔ میں نے ایڈیٹر کو فون کیا تو بڑی بیزاری کے ساتھ یہ عذر پیش کیا گیا کہ وہ ملک سے باہر گئے ہوئے تھے ۔ ایک ہفتہ مزید بیت گیا ۔ میں مایوس ہو گیا میں نے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھا اور یہ درخواست کی کہ وہ مضمون کا مسودہ مجھے واپس ہی بھجوا دیں ۔ ایڈیٹر کے بجائے ان کے دفتر کے کسی اور صاحب نے ڈاک کی کاپی پر دستخط کئے اور میرا خط وصول کیا مگر میرا مضمون واپس نہ بھجوایا گیا ۔ جب ملازم نے مضمون کا مطالبہ کیا تو اس کو بتایا گیا کہ جو کچھ ہو چکا ' کافی ہے ۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ اب تک مجھے اس بات پر بڑا دکھ اور شدید صدمہ ہے اس لئے نہیں کہ میرا محنت سے لکھا ہوا مضمون جو اس وقت ملک کے سیاسی اور آئینی حالات کے بارے میں تھا شائع نہیں ہوا ' بلکہ اس لئے کہ ایک ممتاز اخبار ' جو ریاست کا نام نہاد چوتھا ستون ہونے کے دعویدار تھے کے ایڈیٹر میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ وہ مجھے صاف صاف بتا سکے کہ شاید میرا مضمون ان کے اخبار کی پالیسی کے مطابق نہیں یا اسے سنسر والوں نے ضبط کر لیا ہے ۔ یا ایڈیٹر نے یہ مضمون اسلام آباد "کلیرنس" کے لئے بھجوا رکھا ہے ۔ بلکہ اس کے برعکس ڈاک کی کاپی پر ' ضمیر کی چبھن کے بغیر ' کچھ اس طرح کی تحریر دی گئی گویا میرا مضمون مجھے واپس بھیجا جا چکا ہے ۔ یہ فیصلہ اب قارئین کے ہاتھ میں ہے کہ ان کو ایسے اخبار کے مسلسل خریدار رہنا چاہئے جس میں ان کے حقوق کے لئے یا سخت اور بلاجواز قوانین کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرات بھی نہیں ؟ بلاشبہ حکومت کی فیاضانہ سرپرستی کی موجودگی میں انہیں خریداروں کی رقوم کی چنداں ضرورت نہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جس روپے پیسے سے وہ اتنے امیر ہو چکے ہیں وہ عوام اور ٹیکس دھندگان سے ہی لے کر انہیں دیا جاتا ہے اسی پیسہ سے ہی ان اخبارات کے مالکان کارکنان اور عملہ کو روزگار فراہم ہوتا ہے ۔

Marfat.com

خوش قسمتی سے میرے پاس اپنے مضمون کی دوسری نقل موجود تھی اس کے بعد میرا یہ مضمون انگریزی روزنامہ "مسلم" نے اسلام آباد سے شائع کیا۔ یہ مضمون مجموعی طور پر بے ضرر تھا۔ کسی کو بھی یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ ہائی کورٹ کا ایک سابق چیف جسٹس اپنے وطن کے خلاف کچھ لکھے گا مگر میرے ساتھ یہ سلوک ہوا۔ جب کسی شخص کو بذریعہ اخبار اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے سفارش اور سرکاری دفاتر میں جا کر کام کروانے کے لئے رشوت دینے کی ضرورت آ پڑے' تو یہ قوم کے لئے نہایت مشکل وقت ہوتا ہے۔ جب قوم اور قومی ادارے اخلاق کی عمیق ترین پستی میں گر جائیں' تو ایسی قوم مشرق و مغرب یا شمال اور جنوب بلکہ خود اپنے اندر سے نمودار ہونے والے خطرات کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے۔

آیئے ہم کچھ اور مثالیں ملاحظہ کریں۔ یہ 25 مارچ 1981ء کا دن تھا جب صدر' چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے عبوری آئین کا حکم مجریہ 1981ء جاری کیا۔ اس کے نتیجے میں اعلیٰ عدالتوں کے انیس ججوں کو جن میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو یا تو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا یا کئی ججوں کو حلف نہ دلایا گیا یا ان سے حلف نہ لیا گیا۔ یہ آئینی ترمیم پہلے ٹیلی ویژن کے خبرنامہ میں سنائی گئی۔ میں اس رات کراچی میں تھا۔ سردیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں پیر علی محمد راشدی مرحوم کے گھر پر عشائیہ میں مدعو تھا۔ میرے اہل خانہ اور کچھ دوست بھی اس عشائیہ میں شریک تھے۔ اگرچہ ٹی وی کے خبرنامہ میں خوش قسمت یا بدقسمت ججوں کے نام نہیں دیئے گئے تھے صرف پی سی او پڑھ کر سنایا گیا۔ میں نے اپنے دوستوں کے روبرو پیر علی محمد راشدی کو بتایا کہ اپنے گذشتہ فیصلوں کی وجہ سے اس عبوری حکم کا پہلا نشانہ میں ہی ہوں کیونکہ بلوچستان ہائی کورٹ کے میرے کئی ایک فیصلوں سے اہل اختیار کافی ناراض اور نالاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور "حکومت" میرے فیصلوں کے نتائج کو ختم کرنے کے درپے ہے مجھے اس آرڈر کے تحت اگر حلف لینے کی دعوت بھی دی گئی تو میں نہیں جاؤں گا۔ باوجود یہ کہ میرے جج کی آئینی طور پر مقرر کردہ معیاد میں مزید 8 سال باقی ہیں یقیناً مستقبل میں مجھے کافی دشواریوں کا سامنا ہوگا حالانکہ میں 6 سال تک سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کا جج اور چار

Marfat.com

سال تک سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کا جج اور چار سال تک بلوچستان ہائی کورٹ کا چیف جسٹس رہ چکا ہوں ۔ چنانچہ اگلی صبح مجھے کوئٹہ سے ٹیلی فون آیا ۔ مجھے نئے حکم کے تحت حلف اٹھانے کی دعوت دی گئی ۔ مگر میں نے فون کرنے والے صاحب کو بتا دیا کہ مجھے حلف اٹھانے کی کوئی جلدی نہیں ۔ حلف اٹھانے کی رسم بعد میں بھی ادا ہو سکتی ہے اس کے علاوہ میں کوئٹہ میں اپنے دوسرے رفقاء ججوں خصوصاً پہلے سینئر جج مسٹر ایم ۔ اے رشید کے ساتھ سی میں فاتحہ خوانی کے لئے ملنا چاہتا تھا۔ جو اپنے والد محترم کے انتقال کے باعث سی میں مقیم تھے ۔ ان کا انتقال دو روز قبل ہی ٹریفک کے حادثہ میں ہوا تھا ۔ ٹیلیفون پر اس بات چیت کے بعد میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے ملنے کے لئے گیا ہماری ملاقات پہلے سے طے شدہ تھی میں نے سندھ ہائی کورٹ میں دیکھا کہ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی ۔ سبھی از سرنو گورنر سندھ سے حلف اٹھانے کی عجلت میں تھے کیونکہ حلف نہ اٹھانے کا مطلب ملازمت سے محرومی تھا ۔ سندھ ہائی کورٹ کے دو ججوں کو جو میرے پرانے رفقائے کار تھے ' بتایا گیا کہ انہیں حلف اٹھانے کے لئے گورنر ہاؤس آنے کی ضرورت نہیں ۔ جب ججوں کے چائے کے کمرے میں ایک جج نے گورنر ہاؤس جانے سے قبل مجھ سے دریافت کیا تو میں نے بتایا کہ میں تو آج سے جج نہیں رہوں گا مگر مجھے اس کا کوئی افسوس بھی نہیں البتہ مجھے حکومت کے ان اختیار کردہ ہتھکنڈوں کا افسوس ضرور ہے ۔

اب میں عدلیہ کی آزادی کے اختیارات سلب کرنے کے بارے میں پاکستانی اخبارات کے افسوسناک رویہ کی چند ایک مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ روزنامہ انگریزی " ڈان " کراچی نے کسی تبصرہ کے بغیر ان ججوں کے نام شائع کر دیئے جنہوں نے اپنے اپنے عہدہ کا آئین کی بجائے پی سی او پر از سر نو حلف اٹھایا تھا ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اخبار ان لوگوں کے نام شائع کرنے میں ناکام رہا یا ان کی اشاعت کو مصلحت کے خلاف سمجھا جنہوں نے حلف نہیں اٹھایا تھا ۔ یا ان سے حلف لیا ہی نہیں گیا یا جنہوں نے استعفیٰ پیش کر دینے یا حلف اٹھانے سے خود انکار کر دیا تھا ۔ ایسے ججوں میں مسٹر جسٹس انوار الحق چیف جسٹس آف پاکستان سپریم کورٹ ' مسٹر جسٹس دراب پیٹل اور مسٹر جسٹس فخر الدین (سپریم کورٹ) اور میں بھی شامل تھا ۔ خبر کا ایک

Marfat.com

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس روز بعض ججوں نے گورنر یا صدر مملکت کی بجائے اس دور کے وزیر قانون مسٹر شریف الدین پیرزادہ اور بعض صورتوں میں ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے حلف لینا عام عدالتی روایات کے منافی نہ سمجھا ۔ یہ خبر جمعرات 26 مارچ 1981ء کے "ڈان" میں صفحہ اول پر شائع ہوئی ۔ خبر اس طرح تھی ۔

سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے ججوں نے حلف اٹھا لیا

راولپنڈی 25 مارچ --- سپریم کورٹ ملک کے چاروں ہائی کورٹوں کے ججوں اور وفاقی شرعی عدالت کے ارکان نے صدر کی طرف سے گذشتہ رات نافذ کئے جانے والے آئین کی عبوری حکم کے تحت آج از سر نو حلف اٹھایا ۔

" راولپنڈی میں صدر محمد ضیاء الحق نے سپریم کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس مسٹر عبدالحلیم سے حلف لیا ۔ سپریم کورٹ کے پانچ مزید ججوں اور وفاقی شرعی عدالت کے سربراہ مسٹر جسٹس صلاح الدین احمد اور عدالت کے تین دوسرے ارکان نے بھی ایوان صدر میں منعقدہ تقریب میں اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا ۔

" لاہور کراچی اور کوئٹہ میں صوبائی گورنروں نے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور جج صاحبان سے حلف لیا ۔ سپریم کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس مسٹر جسٹس عبدالحلیم کا تعلق صوبہ سندھ سے ہے ۔ وہ ان تین ججوں میں شامل تھے جنہوں نے نواب محمد احمد خان قتل کیس میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل پر اختلافی نوٹ لکھا تھا ۔ ان کے علاوہ راولپنڈی میں سپریم کورٹ کے جن ججوں نے حلف اٹھایا ۔ ان میں مسٹر جسٹس اسلم ریاض حسین ، مسٹر جسٹس ایم افضل ظلہ مسٹر جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ ، مسٹر جسٹس عبدالقادر شیخ اور مسٹر جسٹس شفیع الرحمان شامل تھے ۔ سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس کرم الٰہی چوہان نے لاہور میں حلف اٹھایا ۔

"وفاقی شرعی عدالت کے چیئرمین کے علاوہ صدر نے جن ارکان عدالت سے حلف لیا وہ یہ ہیں :۔ مسٹر جسٹس آغا علی حیدر ، مسٹر جسٹس آفتاب حسین اور مسٹر جسٹس کریم اللہ درانی ۔

"وفاقی وزیر قانون سید شریف الدین پیر زادہ نے مسٹر جسٹس شفیع الرحمان سے لاہور ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت میں حلف لیا ۔

Marfat.com

پنجاب۔

"قائم مقام چیف جسٹس مسٹر جسٹس شمیم حسین قادری اور لاہور ہائی کورٹ کے دوسرے ججوں نے عبوری آئین کے حکم کے تحت آج سہ پہر کو لاہور میں حلف اٹھایا پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان نے ان سے ایک سادہ مگر پروقار تقریب میں جو گورنر ہاؤس میں منعقد ہوئی۔ حلف لیا۔

سندھ

"سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور 15 دیگر ججوں نے آج سہ پہر کراچی میں عبوری آئین کے حکم مجریہ 1981ء کے تحت اپنے عہدہ کا حلف اٹھایا۔ گورنر سندھ لیفٹیننٹ جنرل ایس ایم عباسی نے گورنر ہاؤس میں ایک سادہ مگر پروقار تقریب میں ان سے حلف لیا۔ جن جج صاحبان نے حلف اٹھایا ان میں چیف جسٹس مسٹر جسٹس عبدالحی قریشی، جسٹس نعیم الدین، جسٹس ظہور الحق، جسٹس بی۔ جی۔ این قاضی جسٹس سعید الزمان صدیقی، جسٹس ناصر احمد زاہد، جسٹس کے۔ اے۔ غنی، جسٹس ظفر حسین مرزا، جسٹس اجمل، میاں جسٹس سجاد علی شاہ، جسٹس غوث علی شاہ، جسٹس غلام محمد کوریجو، جسٹس ذوالفقار علی، سی۔ولیانی اور جسٹس سلیم اختر شامل تھے۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ

پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور جج صاحبان نے آج عبوری آئین کے حکم کے تحت جو صدر ضیاء الحق نے کل نافذ کیا تھا، اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا، حلف برداری کی تقریب گورنر ہاؤس میں ہوئی گورنر سرحد لیفٹیننٹ جنرل فضل حق نے حلف لیا۔ حلف اٹھانے والوں میں چیف جسٹس مسٹر جسٹس شاہ نواز خان، مسٹر جسٹس برہان الدین، مسٹر جسٹس عثمان علی شاہ۔ مسٹر جسٹس علی حسین قزلباش، مسٹر جسٹس فخر عالم اور مسٹر جسٹس شاہ عبدالرشید شامل تھے۔

کوئٹہ سے ہمارے نامہ نگار نے اطلاع دی ہے کہ :۔

"گورنر ہاؤس کوئٹہ میں آج تیسرے پہر ایک سادہ مگر پروقار تقریب میں مسٹر جسٹس ذکاء اللہ لودھی نے بلوچستان ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس کی حیثیت میں حلف اٹھایا۔ صوبائی گورنر لیفٹیننٹ جنرل رحیم الدین خان نے ان سے عبوری

Marfat.com

آئین کے حکم کے تحت حلف لیا ۔ گورنر نے مسٹر جسٹس عبدالقدیر چوہدری سے بھی ہائی کورٹ کے جج کے عہدہ کا حلف لیا ۔

"دریں اثناء پنجاب ہائی کورٹ کے راولپنڈی بنچ کے ججوں اور وفاقی دارالحکومت میں موجود سندھ ہائی کورٹ کے ججوں نے بھی آج صبح عبوری آئین کے حکم مجریہ 1981ء کے تحت اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا ۔ان سے ایک سادہ تقریب میں وزیر قانون سید شریف الدین پیرزادہ نے حلف لیا ۔ جن جج صاحبان نے آج حلف اٹھایا ان میں راولپنڈی بنچ کے مسٹر جسٹس آفتاب حسین ' ایڈیشنل جج مسٹر جسٹس محمد افضل لون اور مسٹر جسٹس میاں محبوب احمد شامل ہیں ۔ سندھ ہائی کورٹ کے جن ججوں نے مسٹر شریف الدین پیرزادہ سے حلف اٹھایا ' یہ ہیں ۔

"مسٹر جسٹس ایس ۔ اے نصرت ۔ وفاقی سیکرٹری قانون اور ایڈیشنل جج اور مسٹر جسٹس تنزیل الرحمان چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل ۔

مسٹر جسٹس عبدالشکور سلام نے ملتان بنچ کے جج کی حیثیت میں آج ملتان میں اپنے عہدہ کا حلف اٹھایا ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ملتان میجر جنرل راجہ سروپ خان نے گورنر پنجاب کی طرف سے ان سے حلف لیا۔"

اب اس اہم عرصہ میں دور رس اور بنیادی تبدیلیوں کے بارے میں غیر ملکی اخبارات کا ہی اپنے اخباروں سے موازنہ کریں تو اپنے اخبارات کی بے بسی کا احساس یکدم ہوگا ۔

عبوری آئین کے حکم (صدارتی حکم 1) مجریہ 1981ء کے نفاذ کے نتائج اور اثرات کے بارے میں خبریں یکم اپریل 1981ء کو روزنامہ " گارڈین " لندن اور 2 اپریل کو روزنامہ " ٹیلی گراف " لندن میں اور فار ایسٹرن اکنامک ریویو ہانگ کانگ میں 3 اپریل 1981ء کو ڈیلا ڈنمین کی رپورٹ شائع ہوئی ۔ بعد میں مسٹر جسٹس جی ۔ صفدر شاہ (اب مرحوم) کا ایک خط 6 اپریل 1981ء کو شائع ہوا جو اسی عبوری آئین کے حکم کے بارے میں تھا ۔ اب یہ قارئین کا کام ہے کہ وہ ملکی اور غیر ملکی اخبارات کی رپورٹوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد نتائج خود اخذ کریں ۔ غیر ملکی اخبارات کی رپورٹیں حسب ذیل ہیں ۔

Marfat.com

"گارڈین" لندن، یکم اپریل 1981ء
از پیٹرنیز وانڈ اسلام آباد

"پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل یحی بختیار کو کل پانچ سال قید با مشقت اور 5 ہزار پونڈ کے لگ بھگ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ایک سال قید بھگتنا ہوگی۔ ان پر 1977ء کے اپنے حلقہ انتخاب میں دھاندلی کا الزام ہے۔

"گزشتہ اکتوبر میں بلوچستان ہائی کورٹ نے مارشل لاء کے تحت یحی بختیار کے خلاف کارروائی کو "امتیازی" اور بدنیتی پر مبنی قرار دیا تھا۔ اس مقدمہ کے دونوں ججوں چیف جسٹس مری اور جسٹس رشید کو گزشتہ ہفتے ہی جنرل ضیاء نے ملازمتوں سے برطرف کردیا تھا۔

جنرل ضیاء نے گذشتہ ہفتے جو آئین نافذ کیا ہے اس کے تحت عدالتوں کو کسی بھی فوجی قانون کے قانونی جواز کے بارے میں سماعت کے اختیارات سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس آئین کے تحت ججوں کو از سر نو حلف اٹھانے کو بھی کہا گیا۔

"چنانچہ 19 ججوں کو ---- جو عدلیہ کا ایک چوتھائی حصہ ہیں --- یا تو حلف اٹھانے کے لئے بلایا ہی نہیں گیا۔ یا انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر ترمیمی آئین کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس طرح یہ 19 جج عدلیہ سے نکل گئے۔

"کوئی نہیں جانتا کہ جنرل ضیاء الحق سپریم کورٹ کو معمول کی سماعت کے بعد حکومت کی اپیل منظور کرنے کی اجازت دیں گے یا وہ (عدالت) قانونی موشگافیوں سے قطع نظر پولیس کو یحی بختیار کو گرفتار کرنے کی اجازت دے دیں گے۔

"ضیاء الحق کی حکومت میں لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے قانون کو بطور ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے چار وائٹ پیپر جاری کئے ہیں جو بھٹو دور میں اختیارات کے غلط استعمال کے بارے میں ہیں۔ جس کسی نے بھی پاکستان میں گذشتہ تین سال کے دوران حالات و واقعات کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے وہ ایک ایسی حکومت کے خلاف جو کہتے تو بہت کچھ ہے مگر اسے اخلاقی حمایت حاصل نہیں اس سے بہتر دستاویزات کے ساتھ مقدمات عدالت میں لا سکتا ہے۔

Marfat.com

" وہائٹ پیپروں میں سب سے بڑا اور بھاری وائٹ پیپر جو جولائی 1978ء میں جاری کیا گیا۔ انتخابات میں دھاندلی کے الزامات پر مشتمل ہے۔ یہ وائٹ پیپر لندن کی ٹیلی فون ڈائرکٹری سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ اس کے 405 صفحے تو الزامات کی تفصیل پر مشتمل تھے اور ان کے ساتھ ایک ہزار 43 صفحات پر مشتمل دستاویزات منسلک کی گئی تھیں۔

" یہ نرالا انداز اس وقت اختیار کیا گیا جب مارچ 1978ء میں بھٹو کو موت کی سزا کا حکم سنایا جا چکا تھا اور یحیٰ بختیار نے بھٹو کی سزائے موت کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی پیروی خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اس کے لئے کوئی فیس وصول نہیں کی۔ یحیٰ بختیار بتاتے ہیں۔ " 24 مارچ کو میں نے سینئر وکیل کی حیثیت میں بھٹو کی سزائے موت کے خلاف اپیل دائر کی۔ 25 مارچ کو انہوں نے میرے خلاف الیکشن میں دھاندلی کے الزام کے تحت مقدمہ درج کیا میں جب بھٹو کی اپیل کے سلسلے میں مصروف تھا ' میری خفیہ نگرانی شروع کر دی گئی اور مجھے ہراساں کیا جانے لگا۔ پولیس نے دو بار ہوٹل میں میرے کمرے پر چھاپہ مارا۔ میرے دو معاون گرفتار کر لئے گئے۔ جو کئی ماہ تک نظر بند رہے لیکن جرم کا کوئی ثبوت نہ ملنے پر انہیں رہا کر دیا گیا۔"

" 25 جون (1978) کو جبکہ میں اپیل کے سلسلے میں دلائل پیش کر رہا تھا مجھ سے چار پانچ گھنٹے پوچھ گچھ کی گئی۔"

"یہ بات عام ہے کہ الیکشن میں دھاندلی کی گئی لیکن سوال یہ ہے کہ اس دھاندلی کا ذمہ دار کون ہے۔ جنرل ضیاء کی قائم کردہ خصوصی عدالت میں جو مسٹر یحیٰ بختیار کے خلاف مقدمہ کی سماعت کے لئے ہی قائم کی گئی تھی۔ گواہان استغاثہ نے کہا کہ غنڈوں کے گروہ پولنگ سٹیشن میں داخل ہو گئے۔ پولنگ کے عملہ کو ڈرایا دھمکایا اور بیلٹ بکسوں میں بہت سے ووٹ ڈال دیئے۔ لیکن سبھی گواہوں نے یہ بات برملا کہی کہ یہ لوگ بھٹو کے مخالف تھے۔ ان میں سے اکثر پختون خواہ نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کے امیدوار محمود خان اچکزئی کے حامی تھے۔ اس ہنگامہ آرائی میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے کسی کے خلاف بھی مقدمہ دائر نہیں کیا گیا۔

Marfat.com

" اس حلقہ انتخاب میں انتخابی دھاندلی کا دوسرا دور پولنگ ختم ہونے کے بعد ہوا ۔ مسٹر بختیار کو یقین تھا کہ پولنگ کا عملہ اس تشویش میں مبتلا ہے کہ پولنگ سٹیشن میں جو بدامنی اور لاقانونیت ہوئی مسٹر بھٹو (جو اس وقت وزیراعظم تھے) کیا کہیں گے چنانچہ انہوں نے بیلٹ بکسوں میں بہت سے ووٹ ڈال دیئے تاکہ مسٹر بختیار کی جیت کو یقینی بنایا جا سکے ۔ فوجی حکومت کا اس بارے میں موقف یہ ہے کہ مسٹر یحی بختیار نے خود پولنگ عملہ کو فون کیا اور یہ ہدایت کی کہ وہ نتیجہ ان کے حق میں کریں (یعنی جعلی ووٹ ڈال دیں) لیکن سابق اٹارنی جنرل اس الزام کی تردید کرتے ہیں ۔

" دو سال بعد جب مسٹر بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا جا چکا تھا ' جنرل ضیاء نے خصوصی فوجی عدالت نمبر 11 اے قائم کی ۔ اس عدالت کے قیام کا مقصد بلوچستان کے ان افراد کے خلاف مقدمات کو نمٹانا تھا جو اٹارنی جنرل کے عہدے پر فائز رہ چکے ہوں "

۔

روزنامہ ۔ " ٹیلی گراف " لندن 2 اپریل 1981ء

از:۔ بروس لوڈون ۔ نئی دہلی

" پاکستان میں زبردست آئینی تبدیلیوں کے باعث جو گزشتہ ہفتے عمل میں آئی ہیں ۔ ملک میں قانونی نظام کس حد تک متاثر ہوا ہے ' اس کا اظہار مسٹر یحی بختیار کو پانچ سال قید بامشقت کی سزا کے اعلان سے ہوا ہے ۔ یحیٰ بختیار (بیرسٹر ہیں جنہوں نے مرحوم) ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ میں صفائی کی طرف سے پیروی کی تھی ۔

ان پر پانچ ہزار پونڈ جرمانہ کی سزا بھی سنائی گئی ہے ۔

" ان پر بظاہر ' ایک خصوصی فوجی عدالت میں ' سیاسی بدعنوانی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا جس کا تعلق 1977ء کے انتخابات میں دھاندلی سے ہے ان انتخابات کی بدولت ہی بھٹو کا زوال ہوا تھا ۔

" مبینہ الزامات کا تعلق اسی وقت سے ہے جب مسٹر یحی بختیار بھٹو حکومت میں اٹارنی جنرل آف پاکستان کے عہدے پر فائز تھے ۔ یحی بختیار کو فوری سزا سنانے کی ایک یہ بھی اہمیت ہے کہ گذشتہ سال بلوچستان کے چیف جسٹس میر خدا بخش مری نے فیصلہ دیا تھا کہ یحی بختیار کے خلاف مقدمہ کا کوئی قانونی جواز نہیں ۔ یہ نہ صرف غیر

Marfat.com

قانونی بلکہ غیر اسلامی بھی ہے کیونکہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔

"گذشتہ ہفتے فوجی حکمران ضیاء الحق کی نافذ کردہ آئینی تبدیلیوں کے بعد چیف جسٹس مری کو برطرف کر دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کا مطالبہ یہ تھا کہ تمام جج اس نئے آئین کے تحت حلف لیں، جس کے ذریعے 1977ء میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد سے فوجی حکومت کے تمام اقدامات کو قانونی جواز فراہم کر دیا گیا تھا۔

"مسٹر جسٹس مری کو تو اپنے عہدہ کا از سر نو حلف اٹھانے کے لئے بلایا ہی نہیں گیا بلکہ ان کی جگہ فوری طور پر ایک اور جج کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ اسکے بعد یحی بختیار کے خلاف الزامات کو از سر نو ایک خصوصی فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔

"مسٹر بختیار نے خود کو معصوم قرار دیا۔ لیکن ان کے خلاف الزامات شائع نہیں کئے گئے اور ان کے خلاف مقدمہ کی سماعت بھی بند کر دی گئی۔ یہ بات بھی صاف ظاہر نہیں کہ آیا مسٹر یحی بختیار جن کی صحت خراب ہے اپنی سزا کے خلاف کسی اعلیٰ عدالت یا چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے پاس اپیل کر سکتے ہیں یا نہیں۔ تاہم ایسی اپیل کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

"گذشتہ ہفتے نافذ ہونے والی آئینی تبدیلیوں کے بعد جج مارشل لاء حکام کے کسی اقدام یا کاروائی کو جو انہوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد کی ہو، نہ تو چیلنج کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان پر رائے ظاہر کر سکتے ہیں۔

"مسٹر بختیار کافی عرصہ سے فوجی حکام کی آنکھوں کا خار بنے ہوئے تھے۔ وہ مسٹر بھٹو کے مقدمہ میں وکیل صفائی تھے اور اس دوران انہوں نے جنرل ضیاء اور ان کے رفقاء کے بارے میں کافی سنگین باتیں کہی تھیں۔ مارشل لاء حکام اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ جب چیف جسٹس مری نے یحی بختیار کے خلاف الزامات کو بلا جواز قرار دیا تو وہ سخت خوفزدہ ہوئے تھے۔

"اگرچہ جنرل ضیاء الحق نے 1977ء کے انتخاب میں بے ضابطگی اور بدعنوانی کے الزامات وسیع پیمانے پر عائد کئے ہیں لیکن مسٹر یحی بختیار سابق بھٹو حکومت کے واحد اعلیٰ عہدیدار ہیں جنہیں انتخابی بدعنوانیوں کے جرم میں سزا دی گئی ہے۔ جس

Marfat.com

طرح عجلت میں یحی بختیار کو سزا سنائی گئی ' اس سے پاکستان میں انصاف کے حصول کے بارے میں شدید خدشات پیدا ہونا فطری امر ہے۔

" چیف جسٹس اور جج صاحبان جنہوں نے ضیاء کی آئینی ترامیم کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے 'اچانک بے روزگار ہو گئے ہیں "

فار ایسٹرن اکنامک ریویو ہانگ کانگ 13 اپریل 1981ء

از۔ : ڈیلا ڈ نمین

" اسلام آباد ۔ پاکستان کے چیف جسٹس اور 19 دوسرے سینئر جج اپنے عہدوں سے 25 مارچ کو اس وقت محروم ہو گئے جب انہوں نے صدر ضیاء الحق کی زبردست آئینی تبدیلیوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ۔ ان تبدیلیوں کے تحت سول عدالتوں کے اختیارات محدود کر دیئے گئے ہیں ' ملک کی تمام بڑی سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے اور مارشل لا حکومت کو مزید مستحکم بنایا ہے۔

" نیا آئینی حکم جو راتوں رات نافذ کیا گیا ہے ' دراصل ججوں کی طرف سے فوجی حکومت کی مخالفت کو روکنے کے لیئے ہے ۔ ججوں کو نئے آئین کے تحت اگلی صبح ہی حلف اٹھانا تھا ۔ حکومت کے مخالف وکلاء نے اس آئین کے نفاذ کو " غداری " قرار دیا ہے جس کے ذریعے جو فوج نے 1973ء کے آئین کو سبوتاژ کیا ہے۔ نئے حکم کے تحت ضیاء کو یہ اختیار مل گیا ہے کہ وہ آئین میں اپنی مرضی کے مطابق ترامیم کریں اور ملک کے سیاسی مستقبل کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیں۔

" چیف جسٹس انوار الحق اور سپریم کورٹ کے مزید تین ججوں نے یہ کہہ کر نئے آئین کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا کہ یہ ان کے ضمیر کا معاملہ ہے ۔ اور وہ سپریم کورٹ کی اس رولنگ کے بھی پابند ہیں جس کے تحت فوجی حکومت کو محدود عرصہ کے لئے قانونی جواز فراہم کیا گیا تھا ۔ سپریم کورٹ کا یہ اہم ترین فیصلہ ضیاء الحق کی طرف سے مرحوم وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو معزول کرنے کے صرف چار ماہ بعد صادر کیا گیا تھا ۔ اس فیصلہ میں فوجی حکومت کو اس شرط کے ساتھ قانونی جواز فراہم کیا گیا تھا کہ وہ 90 دنوں کے اندر ملک میں انتخابات کرا دے گی۔

" اس فیصلہ سمیت عدالتوں کے تمام فیصلے جو ضیاء الحق کی حکمرانی کے حق کے

Marfat.com

متعلق دیئے گئے ہیں نئے فرمان کے تحت کالعدم قرار پائے ہیں اور مستقبل میں عدالتوں کو ایسا کوئی فیصلہ کرنے کے اختیار سے محروم کر دیا گیا ہے ۔ دراصل ضیاء نے خود کو ہمیشہ برسر اقتدار رکھنے کا " حق " حاصل کر لیا ہے ۔

" افراد کے حقوق اور حکومت کے مفادات کے درمیان جو توازن ہوتا ہے وہ ختم ہو گیاہے ۔ انوار الحق نے غیر ملکی اخبار نویسوں کو بتایا "کوئی بھی جج جو اس نئے آئینی فرمان کی حمایت کرتا ہے حکومت کے تحفظ پر مجبور ہے اور وہ شہریوں کی قانونی امداد سے بھی انکار کرے گا ۔"

" سپریم کورٹ کے دو جج فخر الدین ابراہیم اور دراب پٹیل (یہ سپریم کورٹ کے ان تین ججوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے 79ء میں بھٹو کی سزائے موت کی مخالفت کی تھی) اور ایک اور جج نے انوار الحق کے موقف کی حمایت کی ۔ صوبائی ہائی کورٹ کے کم از کم چار جج بھی حلف برداری کی تقریب سے غیر حاضر تھے ۔ لہٰذا وہ خود بخود اپنے عہدوں سے برطرف ہو گئے ۔ یوں ضیاء الحق کم از کم 12 ایسے ججوں کی تطہیر میں کامیاب ہو گئے جو ان کی حکومت کے خلاف اپیلوں کی سماعت منظور کرتے رہے اور ان کی اتھارٹی کے لئے چیلنج بنے رہے ۔ وہ اپوزیشن کی اس مہم کی بھی حمایت کرتے تھے جو اس نے منتخب نمائندوں کو انتقال اقتدار کے لئے شروع کر رکھی ہے ۔ انہیں حلف اٹھانے لئے بلایا ہی نہیں گیا ۔ چنانچہ وہ خود بخود اپنی ملازمتوں سے محروم ہو گئے ۔ ان میں چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ مسٹر جسٹس خدا بخش مری بھی شامل ہیں ۔

" عدلیہ کے خلاف یہ اقدام سیاسی مخالفوں کے خلاف فوجی حکمرانوں کی تازہ ترین کارروائی تھی جنہوں نے فروری میں ملک میں سیاسی بے چینی پیدا کر دی تھی ۔ نو سیاسی جماعتوں نے جن میں پاکستان پیپلز پارٹی ہی قابل ذکر بڑی جماعت ہے ' ایک اتحاد قائم کیا جس کا نام " تحریک بحالی جمہوریت " (ایم ۔ آر ۔ ڈی) رکھا گیا ۔ اس پر تشدد تحریک کا مقصد ضیاء الحق کو مارشل لاء اٹھانے اور انتخابات کرانے پر مجبور کرنا ہے ۔

" ضیاء نے مارچ میں ایک پاکستانی طیارے کے فضا سے اغوا کے واقعہ کا سہارا لیا

Marfat.com

۔ یہ طیارہ 13 دن اغوا کنندگان کے قبضہ میں رہا ۔ اس دوران ایم آر ڈی کے رہنماؤں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں ۔ گرفتار شدگان میں بھٹو کی بیوہ نصرت بھٹو ' بیٹی بے نظیر بھٹو اور سینکڑوں دوسرے سیاسی کارکن طلبہ اور تحریک کے حامی افراد شامل تھے ۔

" نئے آئینی حکم کے تحت امتناعی قوانین کی رو سے نظربند افراد کی گرفتاری کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا ۔ اس سے حکومت کو یہ اختیار بھی مل گیا ہے کہ وہ پاکستان کے نظریہ اور سلامتی کے خلاف کام کرنے والی سیاسی جماعتوں کو ہمیشہ کے لئے کالعدم قرار دے سکتی ہے ۔ وہ تمام سیاسی جماعتیں کالعدم قرار پائیں گی جو آئندہ انتخاب کے لئے الیکشن کمیشن کے پاس اپنی رجسٹریشن نہیں کرائیں گی ۔ ضیاء الحق نے 1979ء میں انتخاب کرانے کا وعدہ کیا تھا مگر بعد میں یہ انتخابات منسوخ کر دیئے گئے ۔

" اگر حکومت سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھا لے تو بھی دائیں بازو کی رجسٹر شدہ اسلام پسند پارٹیاں ہی میدان میں آئیں گی ۔ جن کے حامیوں کی تعداد تو زیادہ نہیں لیکن وہ فوجی حکومت کے بے حد قریب ہیں ۔ وہ حکومت میں بھی شریک ہو سکیں گی اور نامزد ارکان پر مشتمل کونسل میں رکنیت حاصل کر سکیں گی ۔ پیپلز پارٹی اور دوسری سیکولر جماعتیں ' جنہوں نے رجسٹریشن نہیں کرائی ' کالعدم قرار دیدی جائیں گی ۔

" ایم آر ڈی میں اعتدال پسند تحریک استقلال ہی رہ جائے گی جس کے قائد ریٹائرڈ ایر مارشل اصغر خاں گذشتہ ایک سال سے اپنے گھر میں نظربند ہیں ۔ تحریک کے عہدیدار جن میں سے بیشتر وکلا ہیں ۔ حکومت کی مخالف ہر تحریک میں پیش پیش رہے ہیں اور ایم آر ڈی میں ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے ۔ تحریک کے قائم مقام صدر اور ایم آر ڈی کے ترجمان نفیس صدیقی نے 28 مارچ کو اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ان کی جماعت ایم آر ڈی کے مقاصد پر کاربند رہے گی ۔

" فوج نے چار سال سے 1973ء کے متفقہ آئین کو سرد خانے میں ڈال رکھا ہے " مسٹر صدیقی نے کہا " یہ نیا آئینی حکم تو فرد واحد کی مرضی کا عکاس ہے جس کا مقصد پاکستان کے عوام کو آزادی اور شہری حقوق سے محروم کرنا ہے "

Marfat.com

" امریکہ کے صدر رونالڈ ریگن کی اس تجویز پر، کہ افغانستان میں روسی افواج کی طرف سے پاکستان کے لیے امکانی خطرات کے پیش نظر امداد دی جانی چاہئے ۔ " تبصرہ کرتے ہوئے نفیس صدیقی نے تمام مغربی طاقتوں سے جو سماجی انصاف پر یقین رکھتی ہیں ' اپیل کی کہ وہ پاکستان کو فوجی اور اقتصادی امداد نہ دیں کیونکہ فوجی حکومت اس امداد کو ملک کے دفاع کی بجائے ملک کے عوام کے خلاف استعمال کرے گی "

" پاکستان اور امریکہ کی حالیہ بات چیت کے بارے میں کچھ بتایا تو نہیں گیا لیکن باور کیا جاتا ہے کہ امریکہ پاکستان کو 50 کروڑ ڈالر سالانہ امداد فراہم کر رہا ہے ۔ اس کا بڑا حصہ فوجی امداد پر مشتمل ہو گا تاکہ اسے دفاعی رنگ دیا جا سکے۔ ضیاء نے 27 مارچ کو ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات دونوں ملکوں میں گرما گرم بحث کا موضوع ہیں ۔ انہوں نے اس طرف اشارہ کیا کہ اگر مغربی ممالک نے پاکستان کو کافی امداد فراہم کر دی تو پاکستان افغان گوریلوں کو بھی ' جن کے اڈے پاکستان میں ہیں ' اسلحہ فراہم کر سکتا ہے ۔ اس سوال پر کہ آیا فوجی حکومت انتخابات کا منصوبہ بنا رہی ہے ' ضیاء نے کہا کہ میں اپنی حکومت کو طول دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تاہم وہ مزید ایک سال تک برسر اقتدار رہیں گے۔ اپنے نئے آئینی فرمان کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مارشل لا کی حکومت ایک مخصوص طریقہ پر چلائی جاتی ہے ۔ میں ان لوگوں کو اقتدار میں کیسے شریک کر سکتا ہوں ' جو اس کے حقدار نہیں ہیں ۔ انہوں نے مزید کہا " عدلیہ کا کام قانون کی تعبیر و تشریح اور عوام کو انصاف فراہم کرنا ہے نہ کہ انتظامیہ کو چیلنج کرنا ..... اور وکلاء کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے اور دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہئے "

روزنامہ گارڈین کے نام جسٹس صفدر شاہ کا خط

محررہ 6 اپریل 1981ء

" عدالتوں کے متعلق ضیاء کے حکم کا کوئی قانونی جواز نہیں "

" جناب والا "

" پیٹرنسوانڈ کا 28 مارچ کا اسلام آباد سے آنے والا مضمون دیکھا ۔ اسی میں پاکستانی ججوں کے متعلق جنرل ضیاء الحق سے یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں " اگر یہ

Marfat.com

عدلیہ کے ساتھ اقتدار میں شرکت کا معاملہ ہے تو میں ایسا نہیں کر سکتا ' ان کا کام قانون کی تعبیرو تشریح ہے "

" مجھے اس بیان سے کوئی حیرت نہیں ہوئی ۔ درحقیقت آئین کے خلاف ان کی حالیہ " بغاوت " کے بعد جب انہوں نے ملک کی اعلیٰ عدلیہ کے ایک چوتھائی ارکان کو الگ ہونے پر مجبور کر دیا' کیونکہ انہوں نے مارشل لا سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا ' جنرل ضیاء نے عدلیہ کو ننگا کر دیا ہے اور یوں ان کے آمرانہ عزائم بھی کھل کرسامنے آ گئے ہیں ۔

" کچھ عرصہ قبل ہی اپنی غاصبانہ پالیسی کے مطابق انہوں نے مارشل لاء حکام کے کسی حکم یا کارروائی کے خلاف رٹ جاری کرنے کے اختیار سے عدالتوں کو محروم کر دیا تھا ۔

" 23 مارچ کو مجھے برطانوی دارا لعوام کے پارلیمانی انسانی حقوق کے گروپ کی طرف سے پاکستان کے حالات پر اپنے تاثرات پیش کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا ۔ میں نے اس موقع پر کہا تھا کہ جنرل ضیاء اپنی مرضی سے اقتدار نہیں چھوڑے گا ۔ درحقیقت وہ کسی بھی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عوام کی سیاسی زندگی پر اپنی گرفت کو مضبوط تر بناتا چلا جائے گا ۔ اس کے کوئی دو دن بعد ہی ضیاء نے آئین کے خلاف تازہ ترین بغاوت کی اور یوں میرے نظریے کی صداقت کی توثیق کر دی ۔

" جنرل صاحب کے اس دعویٰ کا کہ "جج تو قانون کی تعبیرو تشریح کے لئے ہیں" صرف یہ مطلب ہے کہ جنرل کہتا ہے کہ " قانون موجود ہے " تاہم جب سے ججوں کی اکثریت نے جنرل کی ذات سے حلف وفاداری اٹھا لیا ہے تو اسے پھراب کوئی فکر نہیں ہونی چاہئے ۔

" المیہ یہ ہے کہ جنرل نے 5 جولائی 1977ء کو اپنی پہلی تقریر میں عوام سے جو وعدہ کیا تھا اس سے جان چھڑوانے میں اسے چار سال لگ گئے ۔ یہ تقریر بھٹو کی آئینی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد کی گئی تھی ۔ اس نے کہا تھا " میں ملک کی عدلیہ کا بے حد احترام کرتا ہوں ..... میرا اولین بلکہ واحد مقصد ملک میں منصفانہ اور آزادانہ انتخاب کرانا ہے جو اسی سال (1977ء) اکتوبر میں ہونگے ..... میں حلفاً کہتا ہوں

Marfat.com

کہ میں اس وعدے سے روگردانی نہیں کرونگا۔"

آپکا بھائی
جی۔ صفدر شاہ' سابق جج
سپریم کورٹ آف پاکستان
لندن۔ ڈبلیو 8

25 مئی 1981ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن نے اپنے سالانہ اجلاس میں مجھے بطور مہمان خصوصی شرکت کی دعوت دی۔ وہاں میں نے تقریر بھی کی۔ تقریب میں کراچی اور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے لگ بھگ پندرہ سو وکلاء شریک تھے جنہوں نے میرے جذبات کو بے حد سراہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کئی دوسرے مقرر اور بار ایسوسی ایشن کے عہدیدار تو دور تک گئے انہوں نے اپنی تقریروں میں مارشل لا کے خاتمہ اور بحالی جمہوریت کا مطالبہ کیا۔ یہ تقریب کراچی بار ایسوسی ایشن کے دفتر کے احاطہ میں ہوئی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے ریٹائرڈ ججوں میں سے میں پہلا جج تھا جسے بار ایسوسی ایشن نے یہ اعزاز بخشا تھا۔
میں نے اپنی تقریر میں کہا۔:

"جناب ابرار حسن صدر' جناب منور ملک جنرل سیکرٹری' بار کے معزز عہدیداران اور کراچی بار کی خواتین اور ساتھیو!

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے وقت میں اچانک اور بنیادی تبدیلیوں کے باعث' جو حال ہی میں نافذ کئے جانے والے عبوری آئین کے حکم مجریہ 1981ء کے تحت عدلیہ میں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں ایک بار پھر وکلاء برادری میں واپس آگیا ہوں۔ قبل ازیں بلوچستان سے میری کراچی میں آمد پر' چند ماہ قبل بھی بار ایسوسی ایشن نے مجھے ایک استقبالیہ میں مدعو کیا تھا جو اسی جگہ منعقد ہوا تھا اور مجھے کراچی بار کا رکن بنا کر میری عزت افزائی کی گئی تھی۔ آپ کی اس مہربانی کے باعث میں واپس کوئٹہ جا کر بھی یہ سوچتا رہا کہ ابھی سب کچھ نہیں کھویا کیونکہ ابھی ایسے پرعزم' بااصول اور باوقار لوگ موجود ہیں جو ملک کی سلامتی اور یک جہتی

Marfat.com

کے تحفظ ' عوام کی آزادی ' اداروں خصوصاً عدلیہ کی بالا دستی برقرار رکھنے کا عزم کئے ہوئے ہیں ۔ تمام صوبوں کے وکلاء میں یہی جذبہ کار فرما ہے ۔ آج آپ کے سالانہ عشائیہ میں میری موجودگی آپ کی طرف سے مجھ پر شفقت کا اظہار ہے بلکہ یہ ملک میں قانون کی حکومت اور جمہوریت کے لئے آپ کی تشویش کی بھی مظہر ہے ۔ میں اس عشائیہ میں دعوت کے لئے ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ بار کے ارکان وقتاً فوقتاً اپنے چند سینئر وکلاء اور سیاستدانوں کی لفاظی پر مشتمل لچھے دار تقریریں سنتے ہی رہتے ہیں ۔ میں آپ کی سماعت پر مزید بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا ۔ نہ ہی میں آپ کو حب الوطنی ' دیانت داری یا اخلاق پر کوئی لیکچر دینا چاہتا ہوں ۔ میں ان پیشہ ور مقرروں کی عادات سے عاری ہوں اور کوئی ایسی بات کہنے کا مجھ میں یارا نہیں جس پر مجھے خود یقین نہ ہو یا اس پر عمل پیرا نہ ہوں ۔ چنانچہ آج کی شام میں جو چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں وہ ذرا مختلف نوعیت کے ہونگے ۔

" پاکستان کے بانی ' بابائے قوم نے اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی مدد سے کوئی ایک صدی کی جدوجہد کے بعد یہ ملک حاصل کیا تاکہ وہ یہاں آزادانہ ' جمہوری اور اسلامی طرز پر زندگی گزار سکیں ۔ ہرعلاقہ کے شہری کے ساتھ مساوی سلوک ہو ' کمزور ' پسماندہ اور غریب افراد کا تحفظ کیا جا سکے اور انہیں لٹیروں ' موقع پرستوں اور ہر آن تیارو برقرار بیورو کریسی کی زیادتیوں سے بچایا جائے ۔ یہ مقاصد جمہوری طور پر منتخب پارلیمنٹ کے ذریعے حاصل کئے جانے تھے ۔ اور ان کا استحکام اور مزید تحفظ ایک آزاد اور نڈر عدلیہ کے ذریعے کیا جانا تھا ۔ ایسے ملک میں جہاں تحریرو تقریر کی آزادی ' نقل و حرکت کی آزادی اور ووٹ ڈالنے کا حق عوام کو آئین کے تحت حاصل ہو اور ان حقوق کے تحفظ اور نفاذ کے لئے آزاد عدلیہ موجود ہو ' وہاں اندرونی یا بیرونی طاقتوں کی طرف سے اس ملک میں عدم استحکام یا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ایک مضبوط اور متحد قوم انہی اداروں کی بدولت وجود میں آتی ہے ۔ بدقسمتی سے پاکستان کے ابتدائی چند سالوں کے سوا ہمیں ایسے حالات میسر نہیں آئے ۔ اس کے بعد اس ملک کی آئینی یا دوسری تاریخ کا آپ سب کو علم ہے ۔ پاکستان کو اپنے اکثریتی صوبہ ..... مشرقی پاکستان ..... سے محروم

Marfat.com

ہونا پڑا۔ حالانکہ اس صوبہ کے عوام بھی ہماری طرح اچھے مسلمان تھے۔

"گذشتہ دور کی حکومتوں کے دوران ایسے نعرے بار بار بلند کئے گئے۔ مگر ان کا مقصد صرف اپنی کرسی کو مضبوط بنانا تھا۔ اس قسم کے رویہ سے عوام میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور بتدریج وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ان کی بقا خطرے میں ہے میں کہوں گا اس صورت حال سے ہر قیمت پر گریز کیا جانا چاہئے۔ اچھے مسلمانوں کی طرح ہمیں یہ عزم کرنا چاہئے کہ یہ ملک زیادہ متحد' اس کے عوام میں زیادہ یکجہتی ہونی چاہئے اور ہم سب کو اس کی آزادی کے تحفظ کا پختہ عزم کر لینا چاہئے۔

" بلا شبہ قومی اور بین الاقوامی قوتیں ہمارے ملک پر منحوس سایہ ڈال رہی ہیں لیکن میرا یہ پختہ یقین ہے کہ ہم جمہوری طریق زندگی پر عمل پیرا ہو کر' ہی صوبوں اور مرکز کے درمیان کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر مفاہمت کے ذریعے ان قوتوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ کیونکہ عوام کا کوئی خاص طبقہ' حصہ یا کسی علاقہ کے لوگ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ صرف وہی محب وطن اور پاکستان کے محافظ ہیں۔

" اب چند الفاظ ماضی کے بارے میں۔ میری خواہش ہے کہ بحیثیت قوم ہم حالیہ ماضی سے کچھ سبق سیکھیں تاکہ ہم مستقبل میں سیاسی اور معاشرتی حادثات کا شکار نہ ہوں۔ تقسیم ہند اور پھر لاکھوں ہندوستانی مسلمانوں کی یہاں آمد کے باعث انہوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ پاکستان میں آگے بڑھنے کے بڑے ہی مواقع ہونگے۔ لیکن ان مواقع سے نوکر شاہی کے حکمران گروہوں نے ہی فائدہ اٹھایا۔ تعلیم یافتہ طبقہ نے بیوروکریسی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے کراچی جیسا بڑا شہر اور تربیلا جیسا عظیم بند تو تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن ہم نے انسانی وسائل کو نراموش کر دیا۔ ہم اپنے عوام کو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے میں ناکام رہے۔ ہم سماجی اور سیاسی طور پر مضبوط و متحد ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے معاشرتی گروہوں میں بٹ گئے جن کا ایک دوسرے سے کوئی ربط نہ رہا۔ چنانچہ ہمارے اندر بداعتمادی اور ایک دوسرے کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ ہمیں یہ سب کچھ ترک کرنا ہو گا' اپنے رویوں میں تبدیلی لانا ہو گی' ذہن وسیع تر کرنا ہو گا' ان لوگوں اور علاقوں کی احسان جتلائے بغیر بھرپور امداد کرنا

Marfat.com

ہوگی جو پسماندہ ہیں۔

" آیئے ہم دیانت داری سے کام لیں ' اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہیں۔ ہمارے قول و فعل میں ہوس ' لالچ مکرو فریب اور ریاکاری کا دخل نہ ہو کہ قرآن حکیم میں ریاکاروں کی آٹھ سے زائد بار مذمت کی گئی ہے ..... شکریہ "

میری اور بار ایسوسی ایشن کے دوسرے ارکان کی تقریروں کو روزنامہ " ڈان " نے 25 مئی 1981ء کی اشاعت میں صفحہ 12 پر شائع کیا۔ میں ڈان اخبار کی مختصر نویسی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نے لکھا

" قائد اعظم کی تعلیمات پر پوری طرح عمل کرنے کی اپیل "

" بلوچستان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس خدا بخش مری نے عوام کی بہبود کے لیے قائد اعظم کی تعلیمات اور پیغام پر سچے دل سے عمل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ کراچی بار ایسوسی ایشن کے سالانہ عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ملک کے قانونی نظام میں حالیہ تبدیلیوں سے عوام کو کوئی مدد نہیں ملے گی۔ عدلیہ نے ہمیشہ ملک کی سلامتی اور آزادی و یک جہتی کا تحفظ کیا ہے "

" اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے بار ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر کبیر الدین نے وکلاء پر زور دیا ہے کہ وہ ملک کے اندر اور ملک کی سرحدوں کے باہر ملک کے دشمنوں سے لڑیں۔ یہ جنگ عوام کے درمیان باہمی اعتماد ' بھائی چارے اور محبت سے لڑی جا سکتی ہے۔"

ایک اور مثالی رپورٹنگ ملا خطہ ہو جس میں کیا کچھ لکھا گیا۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پندرہویں سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت پر میں نے 19 مارچ 1985ء کو مندرجہ ذیل تقریر کی

" خواتین و حضرات!

" گذشتہ روز چند نوجوانوں نے آپ کی طرف سے مجھے آپ کے پندرہویں سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی اور میں نے حامی بھرلی میں نوجوان طلباء کو مایوس کرنے کی خود میں ہمت نہیں پاتا۔ کیونکہ وہی اب اس قوم کی امید ہیں۔ وہ مستقبل کی قیادت ہیں اور انہیں ہی قوم کی خدمت کرنا ہے۔ چنانچہ میں آپ کی

Marfat.com

دعوت میں موجود ہوں ۔

"اس نوع کے مواقع پر تنظیم اور اس کے عہدیداروں کو مبارکباد دینا ایک رسم ہے کہ انہوں نے طلباء برادری کی خصوصاً اور ملک کی عموماً شاندار خدمت کی ہے ۔ تو مبارکباد حاضر ہے ' دلی مبارکباد ' یہ بھی رسم ہے ' نوجوان دانشوروں کوچند حرف پند بھی کہے جائیں تاکہ وہ اپنے فیصلے آزادی سے اور کسی دوسرے کی مداخلت کے بغیر کر سکیں ۔ پھر انہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ طلباء برادری اور قومی معاملات کو کس طرح نمٹائیں کہ گذشتہ 40سال کی غلطیاں نہ دھرائی جائیں ۔

" میں جانتا ہوں نئی نسل ہمیشہ اور ہر جگہ عجلت میں ہوتی ہے وہ قومی مسائل کا ٹھوس حل چاہتے ہیں ۔ وہ بار بار دھرائی جانے والی لفاظی اور گھسی پٹی نصیحتیں بھی سننے کے روا دار نہیں ۔ ہمارے طلباء اتنے دانشمند ہیں اور وہ یہ سب کچھ خوب جانتے ہیں وہ زندگی سے بھرپور ہیں اور نہیں چاہتے کہ حکومت یا سیاستدان ان سے " نابالغ ذہنوں " والوں کی طرح کا سلوک کرے جیسا کہ عموماً کیا جا رہا ہے ۔

" وہ مویشیوں کی طرح ہانکے جانے سے نفرت کرتے ہیں وہ دوسرے شہریوں کی طرح خود سوچنا فیصلہ کرنا اور عمل کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ لمبے لمبے سیمناروں ' وعظ و نصیحت ' بیورکریٹس کے ورکشاپوں ' وہ سول بیورو کریٹ ہوں یا فوجی ' یا نیم پخت سیاستدانوں کی لچھے دار تقریروں کو پسند نہیں کرتے ۔

" سبھی جانتے ہیں کہ یہ ملک فوج کے ذریعے نہیں ' دلائل ' جمہوری عمل اور آزادانہ ووٹنگ کے ذریعے وجود میں آیا ہے ۔ قائد اعظم کو تشدد ہرگز پسند نہ تھا ۔ وہ آئینی اور قانونی طریقوں پر یقین رکھتے تھے ۔ چنانچہ من حیث القوم ہمارا نقطہ نظر آزادانہ ' غیر متعصبانہ ہونا چاہئے ۔ اگر ہم ایک آزاد اور خوددار قوم کی حیثیت میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو تحمل روا داری ہمارے معاشرے میں رچی بسی ہونی چاہئے ۔

" ہر قسم کی اجارہ داری خواہ وہ اقتصادی ہو یا معاشرتی اور سیاسی اسلام کے منافی اور بنی نوع انسان کے لیے قابل نفرت ہے ۔ چنانچہ نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں صنعت ' زمین ' مذہب ' پریس اور سیاست میں اجارہ داریوں کا خاتمہ کریں ۔ چھوٹے صوبوں کے مطالبات سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں ۔ وہ اپنے

Marfat.com

لسانی معاشرتی ' اقتصادی اور سیاسی حقوق طلب کرتے ہیں چنانچہ مستقبل میں صوبوں کے ان حقوق کی ٹھوس آئینی ضمانت ملنی چاہئے ۔ لوگوں کو زیادہ عرصہ تک دھوکہ تو نہیں دیا جا سکتا ہے ۔

" ایک خود مختار عدلیہ تمام سیاسی جماعتوں کا مطالبہ ہے اس بارے میں تو دو آراء ہو ہی نہیں سکتیں ۔ مارشل لاء کا افسانوی نظریہ باطل ہو چکا ہے ۔ پاکستان کا ہر شہری دوسروں کی طرح " مارشل " ہے لہٰذا ہر شہری کو فوج اور سول سروس ' بنکنگ ' دفتر خارجہ ' صنعت و حرفت ' پریس اور مملکت کے دوسرے تمام شعبوں میں شمولیت کے مساوی مواقع حاصل ہونے چاہئیں ۔

"ہمارے عوام میں جرات اور اپنے موقف پر ڈٹ جانے کا حوصلہ ہونا چاہئے۔ ہمیں ان لوگوں کی قدر افزائی کرنی چاہئے جنہوں نے آزادی اور جمہوریت کے لیے قربانیاں دی ہیں اور میں ایسے چند ایک چہرے یہاں دیکھ رہا ہوں۔ ہمیں خود ساختہ "خدمت گاروں" کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے خواہ وہ پنجابی ہوں ' مہاجر ہوں ' سندھی یا بلوچ ہوں ۔ مستقبل کی حکومتوں کا سخت اور موثر محاسبہ ناگزیر ہونا چاہئے تاکہ کوئی مہم جو ملک اور عوام کی قسمت سے کھیلنے سے قبل دو بار سوچنے پر مجبور ہو جائے ۔

" خواتین و حضرات ! مجھے بھی اب بس کرنا چاہئے اور آپ کے وقت پر اپنی اجارہ داری قائم نہیں کرنی چاہئے جو آپ نے کمال شفقت سے مجھے عطا کیا ہے ۔ آپ کا نہایت شکر گزار ہوں اور آپ کی تنظیم کی کامیابی کے لیے دعاگو ہوں !

" ملا خطہ ہو خبر کی رپورٹنگ ..... جو روزنامہ ڈان کراچی میں 21 مارچ کو شائع ہوئی " سابق چیف جسٹس کی طرف سے چھوٹے صوبوں کے حقوق کی حمایت " "کراچی 20 مارچ ۔ : مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) خدا بخش مری سابق چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ نے جمعرات کو چھوٹے صوبوں کے حقوق کی حمایت کی ہے ۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سترہویں سالانہ اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے زور دیا کہ ہر قسم کی اجارہ داری اسلام کے منافی اور بنی نوع انسان کیلئے قابل نفرت ہے ۔ انہوں نے نئی نسل پر زور دیا کہ وہ صنعت زمین ' مذہب ' پریس اور سیاست پر اجارہ داریوں کو ختم کرنے کے لیے آگے بڑھیں ۔ انہوں نے کہا کہ 1973ء کے غیر ترمیم

Marfat.com

شدہ آئین کے مطابق آزاد عدلیہ کے مطالبہ کے بارے میں دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ "مارشل ریس" کا افسانوی نظریہ باطل ہو چکا ہے اور اب ہر پاکستانی کو فوج ' سول سروس ' پریس اور مملکت کے دوسرے تمام شعبوں میں خدمات ادا کرنے کے مساوی مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔

" انہوں نے مزید کہا کہ نوجوان پندو نصائح سے پر یکسانیت کا شکار لفاظی اور پرشکوہ تقریروں سے بیزار ہو چکے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر پسماندہ افراد جیسے سلوک سے تنگ آئے ہوئے ہیں اور وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ انہیں مویشیوں کی طرح ہانک کر کسی بھی طرف لے جایا جائے۔ وہ آزادی فکر کے متمنی ہیں۔ وہ لمبے لمبے مذاکروں میں سول یا فوجی بیورو کریٹس کی گھڑی گھڑائی تقریریں سننے کے روادار نہیں۔ نہ ہی وہ نیم پختہ سیاستدانوں کے لچھے دار واعظ ہی سننا چاہتے ہیں۔

" قومی محاذ آزادی کے چیئرمین مسٹر معراج محمد خاں نے اپنے تفصیلی خطاب میں موجودہ حکومت پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ اس حکومت نے ملک کی معیشت ' دفاع اور خارجہ پالیسی کو امریکہ جیسی سامراجی طاقتوں کے پاس گروی رکھ دیا ہے اور مملکت کو دوسروں کے لیے ایک منڈی بنا دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بطور ادارہ مسلح افواج کے ہرگز خلاف نہیں ہیں بلکہ وہ فوج کے اس کردار کے مخالف ہیں جو ماضی میں اس نے ادا کیا ہے۔ اس نے سول حکومتوں کے تختے الٹے۔ اپنے ہی ملک کو "فتح" کیا اور ملک کی شمال مغربی سرحدوں کو بیرونی خطرات کے سپرد کر دیا۔ 1973ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہوئے معراج محمد خاں نے کہا کہ ان کی جماعت رجسٹریشن نہیں کرائے گی خواہ وہ ہم پر پابندی ہی کیوں نہ لگا دیں۔ ایسی صورت میں ہم کام کرنے کے دوسرے طریقے اختیار کریں گے۔

" ایم آر ڈی کے قائم مقام کنوینر مسٹر حسین بخش ناریجو نے کہا کہ قوم چوتھے مارشل لا سے خوفزدہ نہیں جس کی دھمکیاں سرکاری حلقے دے رہے ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہم عوام کے بنیادی اور جمہوری حقوق کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ہماری جدوجہد مقصد کے حصول تک جاری رہے گی۔ موجودہ حکومتی ڈھانچہ کو مسترد کرتے ہوئے انہوں نے الزام لگایا کہ وزراء اپنے اختیارات کے (دوسروں کے

Marfat.com

فائدہ کے لئے) استعمال کے عوض رشوتیں وصول کر رہے ہیں ۔ میں سندھ کے ایک وزیر کو جانتا ہوں جو کھلے بندوں رشوت طلب کرتا ہے اور اس مقصد کیلئے اپنے ساتھ ایک تھیلا رکھتا ہے ۔

" جن دوسرے لوگوں نے اس اجلاس سے خطاب کیا ان میں مسز نگس لطیف چودھری ' رشید رضوی ' خالد حمید ' شاہد عباس ' محمود علی اسد ' جعفر حسین ' الطاف سیلانی ' عبدالجبار سوبھو پوتا ' ظفر راجپوت اور ایاز بٹ شامل ہیں "

سندھی ' بلوچ پٹھان محاذ کے کنوینیر ممتاز علی بھٹو اور محاذ کے دیگر عہدیداروں کی گرفتاری پر میں نے 4 نومبر 1986ء کو ' اے پی پی کے کراچی آفس کو ایک بیان بھجوایا جو یہ ہے ۔

" جولائی 1977ء میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد سیاسی ' اقتصادی اور انتظامی ایڈہاک ازم نے ملک کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے ۔ جونیجو حکومت کی ٹوپی میں تازہ ترین سندھی ' بلوچ پٹھان محاذ کے عہدیداروں اور ورکروں کی تھوک گرفتاریاں ہیں ۔ گرفتار شدگان میں ممتاز علی بھٹو بھی شامل ہیں ۔ موجودہ سیاسی ماحول میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مس بے نظیر بھٹو کو بھی جلد ہی گرفتار کر لیا جائیگا جس کے بعد بدنام زمانہ ایمرجنسی بھی نافذ کی جا سکتی ہے ۔ یا پھر قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ کر آٹھویں مارشل لاء کا نفاذ عمل میں لایا جا سکتا ہے "

" ہر باشعور شہری بھی یہی سوچ رہا ہے جیسا کہ پریس میں شائع ہونے والے بیانات سے ظاہر ہے ۔ میں امید کرتا ہوں کہ ایسی سنگین صورت حال پیدا نہیں کی جائیگی ۔ لارڈ ایکٹن کے مطابق بلاشبہ " قوت اقتدار انسان کو " کرپٹ " کرتی ہے اور کلی اقتدار بندے کو " کلی کرپٹ " بنا دیتا ہے " ۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہر صوبہ سے خوشامدیوں کے گروہ مارشل لاء کے سائے میں اور اب نام نہاد اور جعلی سول حکومتوں نے ملک کی عنان سنبھال لی ہے ۔ اور کبھی کبھار کی برطرفیوں کے باوجود یہ اقتدار کے بھوکے ' 1985ء کے ریفرنڈم کے ذریعے غیر جماعتی طور پر " منتخب " وزراء اور ان کے علاوہ نہایت مستحکم بیورو کریٹ اور جنرل جو تاجر بن چکے ہیں ' پاکستان کے 10 کروڑ انسانوں کو یہ حق دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے کہ وہ اپنی قسمت

Marfat.com

کا فیصلہ آپ کر سکیں۔

"سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان ' جو مختلف صوبوں میں رہنے والے عوام کی آزادانہ رائے اور مرضی سے معرض وجود میں آیا تھا' اس دن کے لیے قائم کیا گیا تھا کہ بلوچستان میں پٹھان اور بلوچ ایک دوسرے کو قتل کر دیں' پنجابی مہاجر اور سندھی کراچی اور حیدر آباد میں بے دردی کے ساتھ ایک دوسرے کا خون بہائیں یا ہر سندھی اور بلوچ کو ڈاکو قرار دے کر سنگدلی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ کیا پاکستان اس لئے بنایا گیا تھا کہ شیعہ اور سنی ہر سال نہایت تن دھی سے ایک دوسرے کو قتل کرتے رہیں۔ یہ سب کچھ کون کر یا کرا رہا ہے؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب برائیاں قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں کے دوران کیوں پیدا نہیں ہوئیں؟ کیا یہ مناسب وقت نہیں کہ پاکستان کے موجودہ حکمران پاکستان کے خدا ترس اور غریب عوام کا پنڈ چھوڑ دیں اور ایسے لوگوں کو آگے بڑھ کر عوام کو متحد کرنے دیں جن کی عوام میں عزت ہے اور جو عوام میں مقبول ہیں۔ نئے حالات کے تحت بلا تاخیر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرائے جائیں تا کہ مشرق مغرب یا شمال سے پاکستان کی طرف بڑھنے والے خطرات کے مہیب سایوں کو دور رکھا جاسکے۔ اگر پاکستان کے عوام کو حق خود اختیاری کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو ان خطرات کا فوجی حل تین بار تو کشمیر میں آزمایا جا چکا ہے اور آخری بار ہم مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے جو پاکستان کا ایک اٹوٹ انگ تھا۔ پھر ہمارے 90 ہزار فوجی دشمن کی قید میں چلے گئے۔ یقین جانیے کوئی امریکی یا کوئی دوسرا غیر ملکی سپاہی' قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے سیاسی طور پر غیر متوازن اور طبقات میں بٹے ہوئے پاکستان کے دفاع کے لیے ہرگز جان نہیں دے گا۔ یہ پاکستان کے عوام ہی ہیں جن کو اگر موجودہ حکمران موقع دیں' تو وہ ان خطرات کا موثر طور پر مقابلہ کر سکتے ہیں جس طرح ویت نام کے بہادر عوام نے کیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ جیل خانوں' پولیس کی حوالاتوں اور نظربندی یا تشدد کے دوسرے مراکز کے دروازے کھول دیئے جائیں لوگوں کو آزاد کیا جائے اور پاکستان کے شہریوں کو ملک کے تحفظ میں اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر ملک کو بچانے کے لیے اللہ سے دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا

Marfat.com

فرمان ہے کہ دعا کے ساتھ عمل بھی کیا جانا چاہئے۔ جھوٹ بولنے' بند کمروں کے سیمناروں میں تقریروں اور دوران کارندا کروں اور ان کے بعد قوم کے خون پسینے کی کمائی ہوئی دولت کو مرغن غذاؤں پر مشتمل ظہرانوں پر اڑانے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔"

اب میرے اس بیان پر مشتمل وہ خبر کہ جو ایسوسی ایٹڈ پریس نے جاری کی ملاحظہ فرمائیں جو ڈان کراچی میں 6 نومبر 1986ء کو شائع ہوئی۔ اس خبر میں میرے بیان کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔:

" ریٹائرڈ جسٹس میر خدا بخش مری نے سندھی بلوچ پٹھان فرنٹ کے کنوینیر ممتاز بھٹو سمیت فرنٹ کے عہدیداروں اور ورکروں کی گرفتاری پر نکتہ چینی کی ہے۔ ایک بیان میں جسٹس خدا بخش مری نے کہا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ عوام کو ملک کو بچانے کے لئے اپنا کردار ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔"

نوٹ۔:

یہ بیان 4 نومبر 1986ء کو اشاعت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس وقت مارشل لاء ظاہراً ختم ہو گیا تھا اور 1985ء کی غیر سیاسی اسمبلی کام کر رہی تھی۔ پھر بھی خبر کو صحیح طور پر شائع کرنے کی جرات یا ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اگر اس کے سیاق و سباق سے کوئی جرم سرزد ہو سکتا تھا۔ تو وہ اس کے لکھنے والے پر ہوتا نہ کہ اخبار پر اب ایک قرار داد ملاحظہ کریں جو سندھ بار کونسل نے 27 مارچ 1981ء کو عبوری آئین کے حکم کے متعلق منظور کی تھی۔ اس کی ایک نقل مجھے بھی بھجوائی گئی۔ مجھے علم نہیں کہ کسی اخبار نے یہ قرار داد شائع کرنے کی جرات کی ہے یا نہیں تاہم بار کے جذبات پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

سندھ بار کونسل کی قرار داد

کراچی بار کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ 27 مارچ 1981ء میں جو قرار داد متفقہ طور پر منظور کی اس کا متن یہ ہے۔:

"سندھ بار کونسل کا یہ اجلاس عبوری آئین کے حکم مجریہ 1981ء کے نفاذ کی شدید مذمت کرتا ہے۔ کونسل کے نزدیک حکومت کے اس اقدام کا کوئی جواز نہیں۔

Marfat.com

اس طرح ملک کو ہماری قومی زندگی کے اس اہم موڑ پر سنگین خطرات سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ جبکہ اس وقت ہماری صفوں میں اتحاد' ملک میں جمہوری' آئینی اور نمائندہ حکومت کے قیام کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

"ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ آئین کی تنسیخ یا اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات پر قدغن نہ تو ملک کی سلامتی اور یک جہتی کے مفاد میں ہے اور نہ ہی پاکستان کے عوام کے مفاد کے مطابق ہے۔ چنانچہ یہ بار کونسل' اپنی سابقہ قرار دادوں خصوصاً اس قرار داد کی' جو 17 مئی 1979ء کو منظور کی گئی تھی۔ ایک بار پھر توثیق کرتے ہوئے اپنے مسلسل موقف کے مطابق یہ مطالبہ کرتی ہے کہ "عبوری آئین کا حکم" غیر مشروط طور پر واپس لیا جائے۔

"ہم مزید مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین 1973ء کے مطابق بلا تاخیر آئینی اور نمائندہ حکومت کے قیام کے لیے اقدامات روبہ عمل لائے جائیں۔ "ہم اس موقع پر سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس اور سپریم کورٹ و ہائی کورٹوں کے ان ججوں کو سلام کرتے ہیں جنہوں نے آئین کے تقدس اور عدلیہ کے وقار کو مد نظر رکھتے ہوئے بطور احتجاج اپنے عہدوں سے استعفے دیدیئے۔

"ہم حکومت کی طرف سے اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کو یک طرفہ اور آمرانہ انداز میں برطرف کرنے کی شدید مذمت کرتے ہیں"

Marfat.com

باب ششم

محروم صوبے اور بے بس عوام

پاکستان ایک آزاد مملکت کے طور پر وجود میں آیا تو اس کے دو حصے تھے جو مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کہلاتے تھے ۔ ان دونوں کے درمیان بھارت کا ایک ہزار میل طویل علاقہ حائل تھا ۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان کراچی سے ڈھاکہ یا چٹاگانگ تک بحری رابطہ ہی تھا ۔ یہ دونوں خطے اس لئے پاکستان کا حصہ بنے کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد تھی ۔ گویا یہ ایک سیاسی مجبوری تھی ۔ سیاسی ' فوجی اور اقتصادی اعتبار سے یہ " نظام " مشکوک ' مبہم اور غیر یقینی تھا انگلستان کی طرح طاقتور بحریہ کی مالک سامراجی شہنشاہیت کے سوا ' کسی ایسی مملکت کی مثال نہیں ملتی جس کے دو حصے اس طرح ایک دوسرے سے بعید ہوں ۔ 1947ء اور اس کے بعد پاکستان ' بوجوہ ' ایسی طاقتور بحریہ قائم نہ کر سکا جو جنگ کی صورت میں ملک کے دونوں حصوں کا دفاع کر سکتی ۔

پاکستان کی یہ دفاعی کمزوری اتنی واضح تھی کہ بھارت کو اس کا فائدہ اٹھانا ہی تھا۔ چنانچہ 1965ء کی جنگ میں بھارت نے اس سے فائدہ اٹھایا اور 1971ء میں تو اس نے طاقت کے بل پر مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر دیا اور 90 ہزار پاکستانی فوجی جنگی قیدی بنا لیئے گئے بعد میں ذوالفقار علی بھٹو نے ایک بے مثال ڈپلومیسی کے ذریعے شملہ معاہدہ کیا اور ان جنگی قیدیوں کو رہا کرا لیا حالانکہ پاکستان تو ایک شکست خوردہ ملک تھا۔

پاکستان کے ان دونوں حصوں --- مشرقی اور مغربی پاکستان --- کے درمیان صرف ایک ہزار میل کا طویل فاصلہ ہی حائل نہ تھا بلکہ دونوں حصوں کے عوام کی زبان' روایات رسم و رواج ثقافت اور دوسرے کئی معاشرتی معاملات ایک دوسرے سے بالکل جدا اور الگ الگ تھے ۔ ان دونوں کے درمیان قدر مشترک اسلام کا بندھن تھا یا پھر ہندو کی بالادستی کا خوف تھا جو جمہوری ہندوستان کی شکل میں برطانیہ کے بجائے موجود تھا ۔ اس کے باوجود بنگالی مسلمانوں کے قائدین شیر بنگال مولوی فضل

Marfat.com

حق ' حسین شہید سہروردی ' خواجہ ناظم الدین 'مولانا بھاستانی' اکرم خاں ' اور دیگر اصحاب نے جانتے بوجھتے ہوئے ہندو انڈیا کی مخالفت مول لی ۔ اور پاکستان کے حق میں جانوں کی بازی لگائی اور ووٹ دیا ۔ مشرقی بنگال کا مسلمان ' بنگالی ہندوؤں کلکتہ کے ہندو تاجروں اور دانشوروں کے مقابلہ میں تعلیمی اور اقتصادی طور پر نہ صرف پسماندہ تھا بلکہ یہاں آبادی بھی نسبتاً بہت زیادہ تھی ۔ بنگالیوں نے جمہوری طریقہ سے ..... ووٹ کے ذریعے ..... پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ اس امید پر کیا تھا کہ آزاد پاکستان میں مشرقی بنگال کو ' دوسرے صوبوں کی طرح بڑی حد تک صوبائی آزادی ' خود مختاری حاصل ہوگی۔ وہ اپنی زبان ' ثقافت اور عدلیہ ' فوج ' بحریہ ' صنعت اور تعلیمی اداروں کو اس انداز میں ترقی دے سکیں گے کہ ان کی ضروریات پوری ہو سکیں ' نیز اس علاقہ کے لوگوں کو اتنے کافی اور معقول مواقع میسر آ سکیں کہ وہ وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے قحط اور کمیابی کا مقابلہ کر سکیں ۔ ان کو توقع تھی کہ مغربی پاکستان کے لوگ ان کی رہنمائی کریں گے ۔ عملی امداد کریں گے اور ان سے فراخدلانہ رویہ اختیار کریں گے کیونکہ وہ صنعت ' سول سروس اور فوجی معاملات میں ان سے بہتر تربیت کے حامل تھے ۔

سندھ 'سرحد ' بلوچستان اور پنجاب کے عوام کی توقعات بھی بالکل اسی طرح کی تھیں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ 1857ء میں جب مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تو انگریزوں کو پورے ہندوستان پر ' جس میں پنجاب ' سندھ اور ایک حد تک شمال مغربی سرحدی صوبہ شامل تھا کنٹرول حاصل ہو گیا تھا ۔ لیکن بلوچستان کے عوام نے برطانوی سامراج کے خلاف علم بغاوت مسلسل بلند رکھا اور شمع آزادی کی صنو پھیلاتے رہے ۔ یہ عمل بڑی حد تک کسی نہ کسی شکل میں 1947ء تک جاری رہا ۔ برطانوی سامراج نے صرف کوئٹہ شہر میں کسی حد تک قدم جمائے اور 1876ء میں انہوں نے بلوچوں کی مسلسل جنگ آزادی کے بعد یہاں اپنی " ایجنسی " قائم کر لی ۔ لیکن سوائے بعض اہم فوجی مقامات پر چوکیوں کے قیام اور چند ریلوے لائنیں بچھانے کے سوا وہ علاقہ پر مکمل بالا دستی حاصل نہ کر سکے ۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں بلوچستان کے لوگ انگریزوں سے تعلیمی یا اقتصادی طور پر کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے ۔

Marfat.com

1846ء میں حیدر آباد کے قریب میانی کے مقام پر سندھ کے بلوچ سردار انگریزوں کے ساتھ جنگ میں آخری شکست کھا گئے اور سندھ آزادی سے محروم ہو گیا ۔ پنجاب پر انگریزوں نے 1849ء میں سکھوں کو شکست دے کر قبضہ کر لیا تھا ۔ یہ دونوں صوبے چونکہ بڑے زرخیز تھے لہٰذا وہ انگریزوں کی ہندوستانی ایڈمنسٹریشن اور معیشت کا حصہ بن گئے ۔ انگریزوں کی فوج کا 60 فیصد پنجابیوں پر مشتمل تھا ۔ انگریزوں نے ہندوستان میں ایک عمدہ تربیت یافتہ سول سروس قائم کی ۔ فطری طور پر صوبہ سرحد کے طے شدہ علاقوں ' مثلاً پشاور وغیرہ ' کو بھی انگریزوں کے قائم کردہ تعلیم اور دوسرے اداروں سے فائدہ پہنچا ۔ ان علاقوں کے لوگوں کو فوج میں بھی اچھا خاصہ حصہ ملا ۔

سندھ اور بلوچستان کے لوگوں نے چونکہ انگریزوں کی سخت مزاحمت کی تھی لہٰذا انہوں نے ان دونوں صوبوں کے عوام پر کبھی اعتماد نہ کیا ۔ چنانچہ فوج اور دوسری سروسز میں سندھ اور بلوچستان کے لوگوں کو کوئی حصہ نہ دیا گیا ۔ فلاں علاقہ کے لوگ " مارشل نسل " کے ہیں محض ایک افسانہ ہے جو انگریزوں نے گھڑا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض علاقوں کے لوگ رضاکارانہ طور پر برطانوی فوج میں شامل ہوئے اور برطانوی مفادات کے لیے بلوچستان ' سندھ ' سرحدی صوبہ ' افغانستان ' عالم عرب اور ترکوں کے خلاف لڑتے رہے اور پھر یورپ میں برطانوی دستوں کے ساتھ جنگ عظیم میں خدمات انجام دیں ' ان لوگوں کو " مارشل نسل " قرار دیدیا گیا ۔

اگر سندھ اور بلوچستان کے عوام کو فوج میں ان کا حصہ دیا جائے تو وہ کئی ایک سے بہتر سپاہی اور جرنیل ثابت ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ ان علاقوں کے لوگوں کا ملک کی آزادی کے تحفظ میں زیادہ حصہ اور بہتر کردار رہا ہے ۔ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ محمد غوری سے احمد شاہ ابدالی تک کوئی جنگ ایسی نہیں جس میں ہندو کے خلاف ' سندھ بلوچستان اور سرحد کے لوگوں نے افغانوں ازبکوں وغیرہ کے شانہ بشانہ حصہ نہ لیا ہو ' اور ہندوستان میں مسلم حکومت کی امداد نہ کی ہو ۔ مقام حیرت ہے کہ آزادی کے بعد اس خطہ ' خصوصاً بلوچستان کے لوگوں کو پسماندہ تصور کر لیا گیا اور 1971ء تک انہیں محدود صوبائی خود مختاری اور حق خود اختیاری سے مسلسل محروم رکھا گیا ۔

Marfat.com

1971ء تک بلوچستان کو تو مکمل صوبہ بھی نہ بنایا گیا جبکہ خود قائد اعظم نے 1879ء میں برطانیہ سے بلوچستان کو مکمل صوبہ بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔

قدرتی وسائل کی لوٹ کھسوٹ

گذشتہ 40 سال کے دوران اس علاقہ میں بمشکل ہی کچھ اقتصادی ترقی ہوئی ہے ۔ تعلیمی لحاظ سے بھی یہ صوبہ سب سے نچلی سیڑھی پر ہے ۔ بلوچستان کے وسیع قدرتی وسائل میں سے صرف سوئی گیس 60 فیصد سالانہ سے زائد قومی ضروریات پوری کرتی رہی ہے ۔ تعلیم کے تمام شعبوں میں حکومت پاکستان اور بیرونی ممالک صوبہ کے طلبا کے لیے 3 ہزار سے زائد وظائف دیتے ہیں لیکن کتنے حقیقی بلوچ اور پٹھان طلباء یا طالبات کو ان وظائف پر تعلیم دلائی جا رہی ہے ۔ حکومت کو 1948ء سے اب تک ان بلوچ یا مقامی پٹھان طلباء اور طالبات کی فہرست شائع کرنی چاہئے جنہیں یہ وظائف دیئے گئے ہیں ۔ اگر یہ فہرست شائع ہو تو اس سے عوام کو سخت صدمہ پہنچے گا ۔ بیشتر وظائف صوبائی سیکرٹریوں یا اعلیٰ افسروں کے بیٹوں اور بیٹیوں کو ہی دیئے گئے جو صوبہ پنجاب اور سرحد سے تعلق رکھتے ہیں اور بلوچستان ملازمت کے لئے جاتے ہیں ۔ یوں مقامی طلباء کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے جن طلباء اور طالبات کو ان وظائف سے نوازا گیا ہے ان کے پاس بلوچستان کے رہائشی سرٹیفکیٹ (Domicile) ضرور موجود ہیں مگر ایسے سرٹیفکیٹ کا حصول کوئی ناممکن بات نہیں ایسے سرٹیفکیٹ کے اجراء کرنے والے بھی بلوچستان میں باہر سے آئے ہوئے ملازم ہیں یہ لوٹ کب تک جاری رہے گی ؟ اور آخر اس لوٹ مار کو کب تک برداشت کیا جاتا رہے گا ؟ اور مستحق لوگوں کو اپنے ہی صوبہ میں مختلف حربوں سے تعلیمی سہولیات اور سرکاری نوکریوں سے محروم کیا جاتا رہے گا ۔ ؟ جب کوئی لوکل اس ناانصافی پر آواز اٹھاتا ہے تو اس کو یک دم متعصب ' صوبہ پرست کہا جانے لگتا ہے اور یہ الزام مراعات یافتہ سرکاری افسران اور ان کے عزیز و اقارب کے ذریعے لگایا جاتا ہے ۔ کیا بھائی بندی اورانصاف کا یہی تقاضا ہے ۔ ایسی ناانصافی کب تک اور کیوں برداشت کی جاتی رہی ہے ؟

Marfat.com

پاکستان پٹرولیم نے 1983ء میں بلوچستان سے قدرتی گیس فراہم کر کے 12 ارب 75 کروڑ روپے کے مساوی زرمبادلہ بچایا ہے جو گیس سوئی کے ذخائر سے فراہم کی گئی وہ 77 لاکھ 60 ہزار ٹن فرنیس آئل (ایک لاکھ 6 ہزار بیرل روزانہ) کے مساوی تھی بلوچستان کے علاقہ میں پیرکوہ میں گیس کے ذخائر سے جب گیس کی فراہمی شروع ہو گی تو قومی معیشت میں گیس کا حصہ کھربوں روپے تک بڑھ جائے گا۔

کوئی شخص دیانتداری سے کہہ سکتا ہے کہ بلوچستان ایک پسماندہ صوبہ ہے اور وہ اپنے 45 لاکھ افراد پر مشتمل آبادی کو بھی تمام ضروری سہولتیں فراہم نہیں کر سکتا۔ بلوچستان سے سالانہ دس لاکھ میٹرک ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ اگر اس کی قیمت فروخت چھ یا سات سو روپے فی ٹن بھی لگائی جائے تو اس سے سالانہ آمدنی 60 سے 70 کروڑ روپے ہو سکتی ہے۔ اسی طرح صوبہ میں سنگ مرمر کی پیداوار اور برآمد سے بھی کروڑوں روپے حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ بلوچستان سے موصول ہونے والا مالیہ ہی صوبہ کی کل آبادی کو پالنے کیلئے کافی ہے۔

بلوچستان کے قدرتی وسائل کے منافع کا معقول حصہ بھی بلوچستان میں بطور سرمایہ لگایا جاتا رہتا تو اب تک یہاں کئی یونیورسٹیاں، جن میں فنی یونیورسٹی شامل ہے، فوجی تربیت کے سکول معقول نظام بنکاری اور مقامی معدنیات پر مبنی کئی صنعتیں معرض وجود میں آ چکی ہوتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا کیونکہ تمام مالیات اور مالی وسائل پر وفاقی حکومت کا کنٹرول ہے اور کبھی کبھار ان مالی وسائل کا جو حصہ بلوچستان حکومت کی جھولی میں ڈالا جاتا ہے وہ صوبائی افسر شاہی اور بے اختیار وزراء کی تنخواہوں، سفر خرچ، غیر ضروری غیر ملکی دوروں اور دوسرے اللوں تللوں پر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ صوبہ کے عوام گذشتہ چالیس سال سے انتہائی تنگدستی کے ساتھ بمشکل دو وقت کی روٹی کھا رہے ہیں۔

اقتصادی اور صنعتی ترقی کو نظرانداز کر دیا گیا۔

جہاں تک صوبہ میں صنعتیں لگانے کا تعلق ہے، پچاس کی دہائی کے اوائل میں کوئٹہ کے قریب ایک ٹیکسٹائل مل لگائی گئی اور اس کے حصص بلوچستان کے ایک اعلیٰ

Marfat.com

حاکم قربان علی کو دیدیئے گئے ۔ کوئی دو سال تک کام کرنے کے بعد مل منظر سے غائب ہو گئی ۔ اس کی مشینری اور زمین کے اب تک ' کئی بار مالک بھی بدل چکے ہیں ۔ اس کا چیف ایگزیکٹو اس وقت گورنر جنرل کا ایجنٹ برائے بلوچستان کہلاتا تھا اور اس کا تعلق بلوچستان سے نہیں صوبہ سرحد سے تھا ۔ اب اس مل کی ٹوٹی ہوئی دیواریں ہی سریاب روڈ سے دیکھی جا سکتی ہیں ۔ بعد میں بھٹو صاحب کے دور حکومت میں بلوچستان کے اس وقت کے گورنر میر غوث بخش بزنجو کے اثر و رسوخ سے ایرانی سرمایہ سے دو بہت بڑی بڑی ٹیکسٹائل ملیں کوئٹہ اور اتھل (ضلع لسبیلا) میں قائم کی گئیں ۔ گذشتہ دس گیارہ سال سے یہ دونوں ملیں بند پڑی ہیں ۔ ان کی قیمتی مشینری کو زنگ کھا رہا ہے اور نوکر شاہی بعض بڑے تاجروں کی ملی بھگت سے ان ملوں پر اس طرح قبضہ کرنے کی تاک میں ہے کہ ملیں تو انہیں بس مفت ہی مل جائیں اور ان پر اربوں روپے کے واجبات کی ذمہ داری ہے وہ عام لوگوں یعنی پاکستان کے ٹیکس دہندگان کے کندھوں پر ڈال دی جائے۔ یوں ان ملوں سے نہ تو بلوچستان کے لوگوں کو کوئی فائدہ پہنچا ہے اور نہ ہی بلوچستان یا عموماً پاکستان کے عوام کو کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع ہے ۔ ہاں مراعات یافتہ طبقہ ان سے ضرور فائدہ اٹھاتا رہا ہے اور مزید اٹھائے گا ۔ 25 لاکھ کے قریب ہر مہینے ان کانوں کی چوکیداری کے لیے بے کار بیٹھے افسروں کو تنخواہ دی جاتی ہے ۔ بمقام سریاب کوئٹہ کے قریب 1982ء میں 91 کروڑ 20 لاکھ روپے کے تخمینہ سے سمینٹ کا ایک چھوٹا سا کارخانہ لگایا گیا تھا جس کی استعداد 250 ٹن روزانہ تھی ۔ اخباری اطلاعات کے مطابق 1987ء میں اس کارخانے میں آزمائشی طور پر کام شروع ہوا ہے جس پر بھاری اخراجات آئے۔ اب تک بجائے 9 کروڑ کے اس پر کل 60 کروڑ روپیہ سے بھی زیادہ صرف ہو چکا ہے۔ اتنے اخراجات کے بعد اس پلانٹ میں تیار ہونے والے سمینٹ کی قیمت فی ٹن کیا ہو گی۔ اس کا اندازہ لگانا محال نہیں۔ اور خریدار کون ہو گا۔

اس کارخانے پر جو بھاری رقوم صرف کی گئی ہیں آخر وہ کہاں چلی گئیں ؟ ان کا کوئی حساب کتاب بھی ہے یا نہیں ؟ اس کا احتساب کیوں نہیں کیا گیا ؟ مزید یہ کہ گذشتہ سالوں سے (90 ۔ 1989ء) یہ سمینٹ فیکٹری جس میں تقریباً تمام سرمایہ

Marfat.com

قومی بنکوں کا لگایا ہوا ہے ۔ بالکل بند پڑی ہے ۔ مشینری اچھی یا بری جو بھی ہے وہ گل سڑ رہی ہے اور کچھ وقت کے بعد ظاہر ہے سرکاری یا بینکوں کے افسران کوڑیوں کے دام اس کو نیلام کروائیں گے ۔ اور وہ بھی اگر پچھلی روایات کو مدنظر رکھا جائے تو بولی دینے والے بھی کسی افسر یا وزیر کے عزیز ہوں گے ۔ اس طرح برسوں سے جھوٹا پروپیگنڈہ بذریعہ اخبارات کہ بلوچستان کے لوگوں کو سمینٹ فیکٹری سے روزگار ملے گا چپکے سے ختم ہو جائے گا ۔ اسکے بعد بیورو کریٹ اس قسم کی کوئی اور سکیم بنائیں گے ۔ اس طرح سرکاری یا نیم سرکاری افسروں کی ترقی تو ہوتی رہے گی لیکن بلوچستان کی ترقی نہیں ہوگی ۔

صوبہ میں صنعتی ترقی میں تاخیر کیوں کی گئی کیا بلوچستان کی صنعتی ترقی کا یہ طریقہ ہے اس صوبہ کے نام پر عربوں ' مغربی ممالک اور امریکہ سے کروڑوں ڈالر کے قرضے حاصل کئے جا رہے ہیں مگر اربوں روپے کہاں جاتے ہیں ؟ کتنے ہی سوالات ہیں مگر جواب کوئی نہیں ! بلوچستان کی 90 فیصد کوئلہ ' سنگ مرمر اور معدنیات کی کانوں کے مالک پنجاب یا سرحدی صوبہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ البتہ ان کے پاس بلوچستان کے ڈومیسائل موجود ہیں ۔ بلوچستان کے معدنی وسائل سے بھاری رقوم حاصل ہوتی ہیں مگر یہ اربوں روپے بلوچستان سے باہر دوسرے صوبوں اور بیشتر حالات میں ملک سے باہر یورپ اور امریکہ میں سرمایہ کاری کیلئے منتقل کر دیئے جاتے ہیں ۔ اور اس کو سرکاری مشینری اور پروپیگنڈہ بلوچستان کے پلڑے میں ڈالتی رہتی ہے ۔

جہاں تک ملازمتوں اور روز گار کا تعلق ہے بلوچستان میں کوئلہ اور دوسری معدنیات کے نکالنے میں مصروف ایک لاکھ محنت کشوں میں سے 90 فیصد صوبہ سرحد سے آتے ہیں ۔ انجنیئروں کی اعلیٰ ملازمتوں اور دوسری فنی آسامیوں پر کراچی اور پنجاب سے عملہ درآمد کیا جاتا ہے ۔ تربیت یافتہ پٹھان یا بلوچ انجنیئروں اور فنی عملہ کو تو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا جاتا ۔ کانوں کے اجارہ دار مالکان تو مقامی افراد میں سے عام مزدور بھی بھرتی نہیں کرتے البتہ چوکیداری کے لیے کبھی کبھار کسی مقامی کو ملازم رکھ لیا جاتا ہے ۔ پڑھے لکھے مقامی نوجوان اور بلوچستان کے عام لوگ اس صورت حال سے سخت بیزار ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ بغیر کسی تاخیر کے تمام معدنیات کو

Marfat.com

صوبائی حکومت کی تحویل میں لے کر چلایا جائے وہ یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ 1947ء سے اب تک بلوچستان کو اس کے معدنی اور قدرتی وسائل سے کیا اور کتنا فائدہ پہنچا ہے۔

سوئی اور پیرکوہ کے گیس کے ذخائر کے لیے بھی فنی اور نیم فنی عملہ کراچی اور پنجاب سے درآمد کیا جاتا ہے۔ سوئی کے مقام پر ان کے لیے ایرکنڈیشنڈ کلب اور بڑے بڑے بنگلے بنائے گئے ہیں جبکہ غریب بلوچ اور دھرتی کے سپوت نہایت حقیر معاوضہ پر ذلت آمیز کام کر رہے ہیں۔ یہ عیاں ہے کہ یہاں معاوضہ کے دو الگ الگ معیار ہیں۔ "درآمد" ملازم تو بھاری معاوضہ وصول کررہے ہیں جبکہ مقامی افراد کو معمولی پگار دی جاتی ہے۔ 1977ء میں گورنر بلوچستان کی حیثیت میں جب میں نے سوئی کا دورہ کیا تو یہ اور کئی دوسری ناانصافیاں میرے علم میں آئیں۔ ڈیرہ بگٹی' سوئی یا بلوچستان میں کسی بھی جگہ کوئی فنی سکول نہیں کھولا گیا جہاں گیس کے ذخائر پر کام کرنے کے لیے مقامی نوجوانوں کو تربیت دی جا سکے۔ ان لوگوں کو اندھیرے میں رکھا جاتا ہے وہ اپنے ہی صوبہ کے وسائل سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور اس استحصال کی غرض سے انہیں دوسرے ملازموں سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے۔ کیا یہی اسلامی اخوت ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ چند مقامی معتبروں اور سرداروں کو کمپنی خفیہ کھاتوں سے بھاری رقوم دیتی رہتی ہے تاکہ وہ چپ رہیں۔ اور اسطرح اکثریت کا استحصال ہوتا رہے پنجاب کے چودھری ہوں' سندھ کے وڈیرے بلوچستان کے سردار' یا سرحد کے ملک اور خان ان سب کا پس منظر ایک ہی ہے وہ سب برطانوی سامراج کے پروردہ ہیں۔ قوم سے غداری اور انگریز سے مکمل وفاداری اور خدمات کے عوض انہیں سردار' نواب خاں بہادر' اور خان صاحب کے خطابات ملتے رہے اور بعض تو آج تک ان سے چمٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ نہ تو ان کا جواز ہے اور نہ یہ خطابات باقی ہیں لاکھوں ایکڑ سرکاری اراضی بطور جاگیر عطا کر دی' وظیفے دیئے خطابات سے نوازا اور ان کے بچوں کو بہترین سول اور فوجی اداروں میں تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم کئے۔ بلوچستان کے ملک اور سردار' جو ایک الگ طبقہ ہیں' گنتی کے چند ایک روشن خیال کو چھوڑ کر آج بھی صوبہ کے لیے ایک مسلسل لعنت بنے ہوئے ہیں۔ وہ عوام

Marfat.com

کی تعلیم اور روشن خیالی کی راہ میں رکاوٹ ہیں وہ صوبہ کے بلوچوں اور پٹھانوں کی ترقی کے لیے سڑکوں کی تعمیر اور صنعتیں لگانے کے شدید مخالف ہیں ۔ ایک آزاد اور جمہوری پاکستان کے قیام کے بعد جبکہ "ایک فرد ایک ووٹ" کا اصول کار فرما ہے ' یہ وزیروں ' چودھریوں اور ملکوں کا طبقہ تو صفحہ ہستی سے اب تک مٹ جانا چاہئے تھا یہ طبقہ اپنی افادیت کھو چکا ہے کیونکہ اس کے غیر ملکی آقا انگریز اب باقی نہیں رہے ۔ لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا بلکہ مرکزی اور در آمدی یا ڈومیسائل صوبائی نیم پختہ بیورو کریسی کی مدد سے جو خوشامد اور رشوت کی رسیا اور جلد از جلد ترقی کی خواہشمند ہے' یہ طبقہ پاکستان بھر میں بام عروج پر ہے اس نے بطور پالیسی مرکزی یا صوبائی اور ساتھ ہی اپنے عزیز و اقارب لئے بلوچستان کے عوام کے مستقبل پر قائم دائم قبضہ کے لیے مقامی بلوچ اور پٹھان یا دوسرے معدنیات ' مالکان اور کچھ غدار سرداروں اور ملکوں سے سیاسی گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور اس چھوٹے سے طبقہ کو سرکاری مراعات دیکر بقایا رقومات پبلک اور بلوچستان کی ترقی کے نام پر خود ہضم کر جاتے ہیں ۔ کیونکہ احتساب ' سزا اور جزا کے اصول پاکستان میں کم ہوتے ہوتے اب لوگ ان اصولوں کے مفہوم سے بھی عاری ہو چکے ہیں ' لہٰذا یہ دو گروپ نہ صرف بلوچستان بلکہ ہر صوبہ میں تن دہی اور خدا کے خوف سے عاری اپنے اس مذموم کام میں لگے ہوئے ہیں ۔ اگلے صفحات میں چند مثالیں پیش کرونگا ۔ گو مجھے یقین ہے کہ آجکل کے ان حالات میں اول تو کوئی پڑھنے کی تکلیف نہیں کریگا ' دوئم حکومت سے عمل کرنے کی امید بھی عبث ہے ' کیونکہ سوائے چند ایک افسروں کے ' جن کے دل میں قومی جذبہ یا خوف خدا ہے ' اکثریت اس کارروائی میں ملوث ہے ' کسی نے کیا سچ کہا تھا کہ "چوں کفراز کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی" مسلمانی اس نے دوسرے مفاد پرست طبقوں سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے چنانچہ عام لوگوں کے بچے حسب سابق ان پڑھ ہیں۔ بھلا " نئی روشنی سکولوں " سے دیہات میں علم کی روشنی پھیل سکتی ہے؟ ان کے تو اساتذہ ہی تربیت یافتہ نہیں ۔ اساتذہ ' اسی علاقے اور اسے خطے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان کی نگرانی مفقود ہے اور ان میں نظم و ضبط نام کی کوئی چیز نہیں ۔ وہ محض تنخواہ وصول کرتے ہیں جو ایک طرح کی سیاسی رشوت ہے ۔ لیکن اس سے بھی بدتر بلکہ بدترین بات یہ ہے کہ عوام

Marfat.com

میں تو تعلیم کی کمی ہو رہی ہے ۔ البتہ مراعات یافتہ لوگ جن کی تعداد لاکھوں میں ہے ' سرکاری خزانے کی مد سے خصوصی تعلیمی اداروں ' کالجوں ' ملک کے اندر یونیورسٹیوں اور بیرون ملک تعلیمی اداروں میں سرکاری وظائف پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ کیا اپنے اس طرز عمل سے ہم عوامی انقلاب کو دعوت نہیں دے رہے جیسا کہ مشرقی یورپ میں ہوا ہے یا پھر روس میں ہو رہا ہے یا ماضی قریب میں ایران ' افغانستان اور جنوبی ایشیاء کے دوسرے ممالک میں ہو چکا ہے ۔ اس کا اثر پاکستان پر بھی ضرور ہو گا

ان تمام انقلابات کے پس منظر میں مسلسل ناانصافی ' عوام کی اپنے سیاسی ' ثقافتی حقوق سے محرومی اور " آزادانہ معیشت " جہاں امیر کو امیر تر بننے اور غریب کو غریب تر ہو جانے پر مجبور کیا جاتا ہو جیسے عوامل کارفرما نظر آتے ہیں ۔ میری رائے میں ہم پاکستانی ایسی وسیع تر تبدیلیوں کے امکانات اور ان کے اثرات کو نظرانداز نہیں کر سکتے جو روز بروز قریب ہوتی جا رہی ہے ۔ مگر وائے قوم کی بے حسی !!

بنکوں میں بد انتظامی

پاکستان میں ایک اور قومی المیہ بھی ہے۔ یہ سرکاری تحویل میں لئے جانے والے بنکوں اور صنعتوں میں انتہا درجہ کی بد انتظامی ہے۔ قانون سازی کے ذریعے بیورو کریسی کے ارکان بنکوں پر مسلط کئے جا رہے ہیں اور راتوں رات " صنعتی جادوگر " تخلیق کئے جا رہے ہیں ان کی تحویل میں پاکستان کے ٹیکس گزاروں کی بھاری رقوم دیدی گئی ہیں ۔ چنانچہ پندرہ سال کی قلیل مدت میں ان نام نہاد ماہرین صنعت و بنکاری نے عوامی مفاد کے ان اداروں کو اپنے نااہل رشتہ داروں اور اپنے آقاؤں کی اولادوں کے لئے " دفاتر روزگار " بنا کر رکھ دیا ہے۔ اپنے موقف کے ثبوت میں مجھے "ڈان" کراچی کے اتوار 28 ستمبر 1986ء کے شمارہ کے ایڈیٹوریل سے ایک اقتباس پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ اس ایڈیٹوریل کا عنوان تھا " بنکوں کا محاسبہ " ۔ یہاں یہ بات نظر میں رکھنی چاہئے کہ 1986ء سے 1991ء تک بینکوں نے لوگوں کی جو حالت بنائی یا بااثر افراد اور حکومتوں نے بینکوں کی جو حالت کی وہ ڈھکی چھپی نہیں ۔

Marfat.com

عدالیتں بھری پڑی ہیں بدعنوانی کے دعوؤں سے

قومی تحویل میں لئے جانے والے بنک ' جن کا نظم و نسق بیورو کریسی کے ہاتھ میں ہے ' فی الحقیقت اجارہ داری بن گئے ہیں ۔ لیکن جہاں تک انکی استعداد ' اہلیت ' مستعدی اور عوامی سطح پر محاسبہ کا تعلق ہے ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے ۔ قومی تحویل میں لئے گئے بنکوں کی کارکردگی کے متعلق حال ہی میں جو انکشافات ہوئے ہیں ' وہ اس امر کے آئینہ دار ہیں کہ ان بنکوں کے محاسبہ کی اشد ضرورت ہے ۔ سٹیٹ بنک کے گورنر کے مطابق ان بنکوں نے افراد اور صنعتوں کو جو قرضے دیئے ہیں ان میں سے تین ارب روپے ابھی واجب الادا ہیں ۔

صرف 1985ء میں 7 کروڑ 70 لاکھ روپے کے قرضے قلم زد کیئے گئے کیونکہ ان کی ادائیگی ممکن نہ تھی ۔

" باخبر ذرائع کے مطابق در حقیقت گذشتہ 9 سال کے دوران پندرہ ارب روپے کے قرضے قلم زد کئے گئے ۔ یوں قلم زد یا معاف کئے جانے والے قرضوں میں فراڈ کے متعدد واقعات میں ہتھیا لی جانے والی رقوم بھی شامل ہیں ۔ حالانکہ بنکوں کے عملہ کی چشم پوشی اور تعاون کے بغیر ایسے فراڈ کرنا ممکن نہ تھا "

دوسرے الفاظ میں گذشتہ نو سال کے دوران بنکنگ کونسل ' افراد اور صنعتی اداروں کو ایک ارب 66 کروڑ روپے کے قرضے سالانہ معاف کرتی رہی ہے ۔ یہ قرضے اب قرض دار افراد یا اداروں سے کبھی وصول نہیں کئے جائیں گے ۔ کیا قوم یہ معلوم کرنے کا حق نہیں رکھتی کہ اتنی بڑی بڑی رقوم کسے تحفہ یا خیرات میں دی گئی ہیں ؟ کیا ان قرضداروں کے نام شائع کئے جائیں گے ؟ ؟ کیونکہ ملک کے چاروں صوبے قومی نقصان اور نفع میں مساوی شریک ہیں لہٰذا عوام کا مطالبہ ہے کہ ان افراد اور صنعتوں کے نام صوبہ وار شائع کئے جائیں تا کہ عوام کو معلوم ہو سکے کہ ٹیکس گزاروں کی یہ بڑی بڑی رقوم کن لوگوں کو دی گئی ہیں اور آیا یہ تحفہ حاصل کرنے والے واقعی اس قابل ہیں کہ ان کے ساتھ یہ فیاضانہ سلوک کیا جائے ۔ بلاشبہ یہ معاملہ زبردست عوامی اہمیت کا حامل ہے ۔ بنکوں کے جن افسروں نے پندرہ ارب روپے بطور تحفہ پیش کر دیئے ' ان کے نام بھی شائع کئے جائیں تا کہ عام لوگ بھی

Marfat.com

اس سے آگاہ ہو سکیں۔

پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سابق چیئرمین (اب 1991ء میں) ڈیڑھ سال سے انگلستان میں مقیم ہیں مسٹر حاکم علی زرداری نے اپنی پریس کانفرنس میں 'جو روزنامہ " ڈان " کراچی نے 2 جولائی 1989ء کو صفحہ 12 پر شائع کی ہے' بنکوں سے بڑی بڑی رقوم بطور قرض حاصل کرنے والوں اور مالیاتی بدعنوانیوں میں ملوث افراد کی نشاندہی کی ہے اور خورد برد ہونے والی رقوم کا بھی انکشاف کیا ہے۔ یہ اعداد و شمار جو مسٹر حاکم علی زرداری نے پیش کئے ہیں نامکمل معلوم ہوتے ہیں پھر یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ " مالیاتی جرائم " میں ملوث افراد کے خلاف کیا کارروائی کی گئی ہے۔ تاہم جو کچھ سامنے آیا ہے کافی دلچسپ ہے۔ خبر اس طرح ہے۔

" پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر حاکم علی زرداری نے کہا " یہ بات ظاہر ہے کہ اثر و رسوخ والے افراد کو ہی " یہ مالی رعایت " دی گئی ہے۔ یہ رعایت نہ صرف غیر مناسب ہے بلکہ یہ ان افراد کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہی فراہم کی گئی ہے۔" انہوں نے کہا کہ ضیاء الحق کے دور میں حکومت کو زبردست مالی نقصانات اٹھانا پڑے چار فائیو سٹار ہوٹل ایک شخص کو صرف ایک کروڑ روپے میں فروخت کر دیئے گئے حالانکہ کھلی نیلامی سے ان ہوٹلوں کی قیمت تقریباً دو ارب تک وصول ہو سکتی تھی۔ ہماری اطلاعات اور تحقیقات کے مطابق پاکستان سروسز لمیٹڈ نے ان ہوٹلوں (اوورسیز پاکستانی) کے لئے ایک ارب 95 کروڑ روپے کی پیشکش کی تھی .....

پلاٹوں کی الاٹمنٹ

پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ضیاء دور کے دوران 95 تجارتی پلاٹ بااثر لوگوں کو الاٹ کئے گئے۔ اس ضمن میں معمول کا طریق کار بھی اختیار نہ کیا گیا جس کے باعث دارا الحکومت کے ترقیاتی ادارہ کو 40 کروڑ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس ضمن میں تحقیقات کی رپورٹ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو ضروری کارروائی کے لئے ارسال کی گئی ہے۔ (اس وقت 1991ء میں یہ صاحب یا ان کے عزیز خود بھی پلاٹوں وغیرہ کی الاٹمنٹ کے بارے میں مقدمات میں

Marfat.com

ملوث ہیں)

" مسٹر زرداری نے ان لوگوں کی فہرست بھی پیش کی جنہوں نے گذشتہ دور میں قرضے معاف کرائے اور پلاٹ حاصل کئے۔

" پبلک سیکٹر! سرکاری شعبہ کی کارپوریشنوں کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر زرداری نے کہا وفاقی سرامک کارپوریشن کے 16 کارخانوں میں سے چھ شدید نقصانات اٹھا رہے ہیں۔ یہ نقصانات 20 کروڑ 40 لاکھ روپے تک پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے مزید انکشاف کیا کہ پی۔ آئی ڈی سی، جم سٹون کارپوریشن، نیشنل کنسٹرکشن کمپنی (این سی سی) تیل اور گیس کی ترقیاتی کارپوریشن، کراچی شپ یارڈ اور پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن سبھی بھاری خسارے میں چل رہی ہیں۔

" ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر حاکم علی زرداری نے کہا کہ مختلف سرکاری اداروں کو مجموعی طور پر گیارہ ارب 77 کروڑ روپے کا نقصان ہو چکا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ فنڈز کے ناجائز استعمال اور خورد برد کی تحقیقات کرائی گئی ہے اور تحقیقاتی رپورٹ وزیر اعظم کو ارسال کر دی گئی ہے۔

" قرض دار۔ پی پی آئی کے مطابق مسٹر زرداری نے مزید بتایا کہ سابق حکومت نے قرضے حاصل کرنے والے بارہ بڑے گروپوں کو نو ارب 22 کروڑ 9 لاکھ 65 ہزار روپے یعنی 22 کروڑ 11 لاکھ 65 ہزار روپے کے قرضے فراہم کئے۔ ان میں اتفاق گروپ (2۔ ارب 25 کروڑ 10 لاکھ روپے) چودھری شجاعت حسین اور پرویز الٰہی (50 کروڑ 40 لاکھ روپے) ڈاکٹر بشارت الٰہی (ایک ارب 32 کروڑ 60 لاکھ روپے) سلیم سیف اللہ خاں (27 کروڑ 10 لاکھ روپے) اسلام الدین شیخ (45 کروڑ 50 لاکھ روپے) صحاف گروپ (37 کروڑ 40 لاکھ روپے) افضل سنز (2 ارب 3 کروڑ 90 لاکھ روپے) اکبر پراچہ (42 کروڑ 30 لاکھ روپے) زیب تن ٹیکسٹائل (حاجی غنی 25 کروڑ 10 لاکھ روپے) السٹ یارن (سکندر حلیم 35 کروڑ 10 لاکھ روپے) اور ظفر شیخ و میاں ایم۔ احمد (44 کروڑ روپے) شامل ہیں۔"

قدرتی بات یہ ہے کہ قرضے ان بڑے تاجروں، صنعتکاروں یا ان کے اعزہ کو دیئے گئے ہیں جو اسلام آباد سے تار ہلا سکتے ہیں۔ لیکن چھوٹے سرمایہ کاروں سے

Marfat.com

رشوتوں کی ادائیگی کے باوجود ' سود درسود بطور سزا وصول کیا جاتا ہے اور ان کے قرضوں کی بر وقت فراہمی بھی نہیں ہوتی ۔ کیا حکومت عوام کے مفاد کی خاطر یا بنکنگ کونسل ان افراد یا کمپنیوں کی صوبہ وار فہرست شائع کرنے کو تیار ہے جنہیں گذشتہ بیس سال کے دوران ایک کروڑ روپے سے زائد کا قرض دیا گیا ہے تا کہ چھوٹے صوبوں خصوصا بلوچستان کے عوام کے ذہنوں میں جو اضطراب ہے اسے دور کیا جا سکے ۔ اگر یہ فہرست شائع ہو جائے تو ہم سب کی آنکھیں کھل جائیں گی ۔

شمالی بلوچستان میں دو کروڑ ستر لاکھ روپے کی لاگت سے ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا گیا تھا ۔ نجی شعبہ میں قائم کئے جانے والے اس کارخانہ کی مشینری درآمد کی گئی ' نصب کی گئی اور 1987ء میں آزمائشی پیداوار شروع ہوئی ۔ کراچی ' پنجاب اور صوبہ سرحد کے صنعت کاروں کی اقتصادی سہولت اور پرمٹوں اور لائسنسوں کی لوٹ مار کی خاطر صوبہ بلوچستان کی تحصیل " ھب " میں مصنوعی صنعتی علاقہ بنایا گیا جو دراصل کراچی کے صنعتی علاقہ کی توسیع ہے ۔ ان صنعتوں میں نہ تو بلوچستان کے بے روزگاروں کو نوکری ملتی ہے اور نہ ہی صوبائی حکومت کو کوئی خاطر خواہ ٹیکس یا کوئی اور فائدہ ۔

بلوچستان میں یہ واحد کارخانہ تھا جو منظم طور پر لگایا گیا ۔ بنکوں کو قومی تحویل میں لئے جانے کے بعد چونکہ بنکنگ میں بھی سیاست آگئی ہے ۔ اس کارخانہ کے مالکوں کو تمام تر کوششوں اور منظوری کے باوجود فنڈز مقررہ وقت پر فراہم نہ کئے گئے کیونکہ وہ کسی وزیر ' مارشل لا اتھارٹی یا سیاسی طور پر دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے ۔ چنانچہ یہ کارخانہ آزمائشی پیداوار کے مرحلہ میں ہی بند ہو گیا ۔ 2 کروڑ ستر لاکھ روپے کی لاگت کے اس منصوبے پر بنک کا سود تین کروڑ تک پہنچ سکتا ہے ۔ نہ تو بینک مزید قرضہ دے کر اس کو پیداوار کی سٹیج تک پہنچانے میں مدد دیتے ہیں نہ ہی کوئی اور امداد سوائے اس کے کہ کارخانہ بند پڑا ہے ۔ اور اپنے قرضہ پر سود کا نفع دکھاتے جاتے ہیں

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کراچی اور پنجاب کے سرمایہ کاروں کو بلوچستان کی ہب تحصیل میں (جو کراچی سے ملحق ہے) کارخانے لگانے کے لیے بھاری قرضے فراہم کئے

Marfat.com

گئے ۔ اس سرمایہ کاری کے ذریعے کسی طور بھی بلوچستان کے عوام کی معیشت کو بڑھاوا نہیں ملا نہ ہی انہیں روزگار کے مواقع ملے ہیں ۔ بات بڑی واضح ہے ۔ یہ کارخانے کراچی سے ملحق علاقہ میں ہیں ۔ ان میں سرمایہ کاری کرنے والے بلوچ نہیں لہٰذا انہیں بلوچستان کے عوام سے کوئی ہمدردی نہیں ۔ یہ سب کچھ تو قرضے دینے والے بین الاقوامی اداروں کو یہ دکھانے کے لیئے کیا جا رہا ہے کہ بلوچستان میں صنعتی ترقی ہو رہی ہے ۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ بلوچستان کا رقبہ ایک لاکھ 34 ہزار مربع میل ہے جو پاکستان کے کل رقبے کا دو تہائی ہے اور تحصیل ہب صرف 50 مربع میل رقبہ پر مشتمل ہے ۔ ہب کے بجائے گذشتہ دس سال کے دوران یہ صنعتیں مکران سے جنوب میں کوئٹہ تک اور شمال میں سبی تک پھیلائی جانی چاہئیں تھیں ۔ صرف اس صورت میں ہی یہ کہا جا سکتا تھا کہ بلوچستان میں بھی صنعتی ترقی ہوئی ہے ۔ اگر بلوچستان میں صنعتیں لگانے والوں کی فہرست شائع کی جائے تو یہ کھل کر سامنے آ جائے گا کہ بنکوں نے صنعتکاری کے لیے جو قرضے فراہم کئے ہیں ھب میں صنعتیں لگانے والوں کے سوا ' یہ قرضے صرف 20 سے زائد افراد کو نہیں ملے اور یہ افراد بھی اکثر و بیشتر بلوچستان معدنی کانوں کے اجارہ دار ہیں جن کا تعلق پنجاب اور سرحد سے ہے ۔ کیا اسے بلوچستان کے عوام کے ساتھ انصاف ' رواداری ' یا قومی وسائل کا مساوی استعمال قرار دیا جا سکتا ہے ؟ اور لوگ کیوں ناانصافیوں کے خلاف احتجاج نہ کریں اور صوبوں کے لوگوں کے درمیان فاصلے ظاہر ہے کہ زیادہ بڑھتے رہیں گے ۔ اس کا مداوا قومی یک جہتی کے لئے نہایت ضروری ہے مگر امید کم ہی ہے ۔

کچھ بھی ہو ' ٹیکس گزاروں کے روپے سے جس بے دردی سے کھل کھیلا گیا ہے ' بنکوں کے بیوروکریٹ افسروں نے جو کچھ کیا ہے اس کا ذکر میں نے اس باب کے اوائل میں کیا ہے ۔ میرے نقطہ نظر کو " ڈان " کراچی میں " قومیائے گئے بنکوں کا محاسبہ " کے عنوان سے شائع ہونے والے ایک مضمون سے مزید تقویت ملتی ہے ۔ یہ مضمون مسٹر مشتاق احمد نے سپرد قلم کیا اور " ڈان " کے 20 ستمبر 1978ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے ۔ مضمون میں کہا گیا ہے ۔ :

" کمرشل بنکوں کو سرکاری تحویل میں لینا دراصل ملک بھر کی صنعت کو قومی

Marfat.com

تحویل میں لئے جانے کے منصوبہ کا ایک حصہ تھا۔ اس سے حکومت کا مقصد مٹھی بھر صنعتکاروں کے استحصال سے عام لوگوں کو بچانا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں بنکوں سمیت معاشرہ کے پیداواری اداروں کی باگ دوڑ تھی۔ بنکوں کو قومی تحویل میں لینا' دراصل ' بھٹو دور کا ایک بہت بڑا اصلاحی اقدام تھا۔

" اس کے بعد بنکاروں اور بیورو کریسی کے ارکان کو' جو دراصل پرانے نظام کا ہی ایک ناگزیر حصہ تھے' اسی نئے نظام کے ناخدا بنا دیا گیا۔ چنانچہ ملکیت کی تبدیلی کے ساتھ شب بھر میں ان کے رویہ میں تبدیلی تو ممکن نہ تھی۔

" بنکوں کے حقیقی مالک تو کھاتہ دار ہوتے ہیں جنکی تعداد اب (1978ء میں) 2 کروڑ 80 لاکھ ہے۔ بنکوں میں ان کی امانتوں کی رقم تقریباً 218 ارب روپے ہے۔ اگرچہ حکومت کھاتہ داروں کی ان رقوم کی ضامن ہے مگر یہ رقوم حکومت کے سالانہ ریونیو سے دو گنا ہیں۔ کھاتہ داروں کی ان امانتوں کا تحفظ دیانت دار اور اچھی شہرت کے حامل بنکاروں جو بنکوں کے منتظم ہوتے ہیں' کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

" موجودہ نظام میں بنکوں کے عوامی محاسبہ کا کوئی عنصر نظر نہیں آتا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ بنکوں کی انتظامیہ میں عوام کی نمائندگی کا کوئی نظام نہیں ہے۔ کھاتہ دار یا ان کے نمائندے بنکوں کے اندر فیصلہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوتے بلکہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

" بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کے فیصلہ کے پس پردہ یہ عوامل بھی کارفرما تھے بنکوں کی طرف سے بڑے بڑے قرضے یا پیشگی رقوم کی ادائیگی کی پالیسی کا یہ اثر تھا کہ قرضے چند ایک افراد کو ہی ملتے اور اس طرح لین دین میں خطرات کا تناسب بڑھ جاتا اور چند ہاتھوں میں ارتکاز زر کا رجحان پیدا ہوتا جس سے قرضوں کی باز ادائیگی میں مشکلات پیدا ہوتیں۔ پھر ان بنکوں میں نئی پالیسی پر عمل درآمد کے لیے جن بنکاروں کو فرائض تفویض کئے گئے وہ پرانے نظام فکر کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کے نزدیک بنکوں کا بنیادی کام زر کی نقل و حرکت تھی۔ ان کے ذہنوں میں سماجی بھلائی یا دینی فلسفہ زر کا کوئی تصور نہ تھا اور ان کے تعلقات بھی سرمایہ دار' سرمایہ کار کلاس کے نمائندوں سے ہی تھے۔

Marfat.com

"ان کا دائرہ عمل کل بھی نجی سرمایہ کار تھا اور آج بھی ہے اور یہ بنکار صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ نجی سرمایہ کاروں کی ضرورتیں یا خواہشات پوری کرتے رہیں۔ چنانچہ آج بھی بنک جو قرضے دیتے ہیں ان کا بڑا حصہ انہی پرانے سرمایہ کاروں کے پاس جاتا ہے۔ چنانچہ (جون 1986ء تک) نجی اور سرکاری شعبہ میں بنکوں نے جو قرضے فراہم کئے ان کی کل رقم 74 بلین روپے تھی۔ اس میں سے 68 فیصد رقم نجی شعبہ کے ایک ہزار 375 کھاتہ داروں کو سو کروڑ روپے فی کھاتہ دار کے حساب سے دی گئی۔ گویا قرضوں کی تقسیم آج بھی ہنوز دلی دور است والا معاملہ ہے۔

"زیادہ تشویش کی بات ان بڑوں سے قرضوں کی وصولی ہے یہ اس قدر مشکل ہو گئی کہ بنکنگ کونسل کے چیئرمین نے بھی اپنی معذوری کا اظہار کیا ہے۔ اور تاجروں سے اپیل کی ہے کہ وہ قرضوں کی باز ادائیگی کے وعدے پورے کرنے میں بنکوں سے تعاون کریں۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ تین ماہ کی مدت کے لیے جاری کئے جانے والے قرضے تین سال میں واپس نہیں لئے جا سکتے اور غالباً پرانے قرضوں کی باز ادائیگی کے لیے نئے قرضے جاری کئے جاتے ہیں۔

"قرضوں کی عدم وصولی میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں بنک کے عملہ کی ملی بھگت اور چشم پوشی، قرضہ لینے والے کی بدنیتی، بیورو کریسی کا اثرو رسوخ اور سیاسی دباؤ کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

"بڑے دکھ اور صدمے کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے قرضے قلم زد کئے جاتے ہیں وہ مرفع الحال اور مالدار لوگ ہوتے ہیں۔ اگرچہ کسی کارخانہ کو "بیمار" قرار دے دیا جاتا ہے مگر اس کے مالکان تو خوب پھل پھول رہے ہوتے ہیں۔

"بنکوں میں فراڈ اور جعل سازی کے واقعات روز افزوں ہیں۔ ماضی میں فراڈ یا جعل سازی سے نکلوایا جانیوالا روپیہ بنکوں کے مصارف کے اکاؤنٹ میں چلا جاتا تھا۔ مگر اب اسے ناقابل وصول قرضہ کی طرح قلم زد کیا جاتا ہے اور فراڈ یا جعل سازی کے مرتکب افراد سے کوئی تعرض بھی نہیں کیا جاتا"

سندھ یا بلوچستان کے اندرونی علاقوں میں اوسط درجہ کی صنعتیں لگانے کے خواہشمند متوسط طبقہ کے افراد قرضہ کے حصول میں بری طرح خوار ہوتے ہیں، ان کی

Marfat.com

آپ بیتی بڑی ہی تکلیف دہ اور ہولناک ہے ۔ وہ قرضہ کے حصول کے لیے ایک دفتر سے دوسرے دفتر ایک میز سے دوسری میز تک دھکے کھاتے ہیں اور محکمہ مالیات کے نااہل کارپردازوں کی جھڑکیاں کھاتے اور گھرکیاں سہتے ہیں ۔ بنکوں کے بعض ذہین افسر جو نئے نئے نظریات پیش کرتے ہیں اور اپنی بات کہنے کی اہلیت سے مالا مال ہوتے ہیں اکثر ملازمت سے ہی سبکدوش کر دیئے جاتے ہیں ۔

کوئی خوش قسمت ہی ' وہ بھی کئی سالوں کی جدوجہد کے بعد ' قرضہ کی منظوری اور حصول میں کامیاب ہوتا ہے ۔ اس مقصد کے لیئے فارموں اور پر فارموں کی ایک بڑی تعداد .... اکثر ٹائپ شدہ پچاس صفحے ..... پر کرنا ہوتے ہیں ۔ ان میں غیر ضروری معلومات طلب کی گئی ہوتی ہیں ۔ ان کی بیشتر دفعات یا کالموں کا مقصد ہی قرضہ کے حصول کی راہ میں مشکلات پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ بیشتر فارم اور پرفارمے ان فارموں کی ہو بہو نقل ہوتے ہیں جو عالمی بنک ' بین الاقوامی مالیاتی فنڈ ' ایشیائی ترقیاتی بنک یا دوسرے بین الاقوامی اداروں کی طرف سے ہمارے بنکوں پر ٹھونسے جاتے ہیں ۔ جو ہمیں قرضے فراہم کرتے ہیں ۔ اس طرح غیر ضروری تاخیر کے باعث' جو قرضہ کے اجراء میں ہوتی ہے' قرضہ حاصل کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ مگر قرضہ کا سود در سود بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہاں جو لوگ اوپر سے تار ہلا سکتے ہیں یا جن کے پاس اپنے "ذرائع" ہوتے ہیں وہ تو اپنا کام جھٹ پٹ کروا لیتے ہیں ۔ اس صورت حال میں ' جو ایک عرصہ سے ہمارے ہاں جاری ہے ' یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وطن عزیز کا اندرونی حصہ اوسط درجہ کی صنعتوں سے محروم کیوں ہے ' خصوصاً سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں کیوں کوئی قابل ذکر چھوٹی صنعت نہیں لگائی جا سکتی ۔

بے محابہ بد عنوانی اور رشوت ستانی

سابق وزیر خزانہ و منصوبہ بندی ڈاکٹر محبوب الحق نے یہ انکشاف کیا تھا کہ سرکاری افسر ہر سال چالیس ارب یعنی چار ہزار کروڑ روپے رشوت اور بد عنوانی کے ذریعے کھا پی جاتے ہیں ۔ اس رقم کا جو عوامی خزانے سے ہی نکلتی ہے کوئی حساب کتاب ہی نہیں ۔ لیکن کسی برائی کی محض نشاندہی تو برائی کا علاج نہیں ۔ نہ ہی اس طرح ذمہ داری سے بچا جا سکتا ہے ۔ کوئی نہیں جانتا کہ سرکاری فنڈز کھا پی جانے کے

Marfat.com

الزام میں آج تک کسی بیورو کریٹ کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی ہے یا کسی کو سزا دی گئی ہے ؟ گزشتہ دنوں ایک اخبار میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ سابق وزیر ریلوے اور مواصلات مسٹر اسلم خٹک نے کہا تھا کہ 40 ارب روپے نہیں' بیورو کریٹ تو 52 ارب روپے ہضم کر جاتے ہیں لیکن مجال ہے کہ کسی ایک افسر نے اس پر اعتراض کیا یا احتجاجاً استعفیٰ دیا ہو۔

ایسے بیسیوں واقعات ہیں کہ قومی خزانہ پر دسترس رکھنے والے بیورو کریٹ کس طرح بجائے قوم کو تعلیم و تربیت کے ذریعے انسانی بلندی کی طرف لے جانے کے قومی خزانہ اللوں تللوں میں اڑاتے ہیں۔ میں ان میں سے صرف دو واقعات کا ذکر کروں گا۔ جو اخبارات میں رپورٹ ہوئے ہیں۔ 14 نومبر 1987ء کے "مسلم" اسلام آباد میں "ایک ارب روپے کی حماقت" کے عنوان سے یہ خبر شائع ہوئی۔

"کسی سرکاری عمارت کی تعمیر کے لئے 1982ء میں کس طرح یہ اندازہ لگایا گیا کہ عمارت 25 کروڑ روپے میں تعمیر ہو سکے گی مگر افراط زر کا عنصر ڈال کر اس کی لاگت 56 کروڑ روپے کر دی گئی اور جب یہ مکمل ہو گئی تو اس کی لاگت ایک سو کروڑ روپے ہو گئی ؟ 1982ء میں "فنانس اینڈ ٹریڈ سنٹر" کراچی کی تعمیر کے وقت لاگت کا جو اندازہ لگایا گیا تھا' کیا وہ یکسر غلط تھا ؟ یا سرکاری شعبہ کی گیارہ اہم تنظیموں نے' جو اس عظیم سنٹر کی تعمیر کی موید ہیں' اخراجات کے جس اندازے کی منظوری دی تھی وہ جان بوجھ کر کم رکھا گیا تھا ؟ سرکاری موقف تو یہ ہے کہ ملک میں افراط زر معمولی سا ہے' تو 25 کروڑ روپے کے اخراجات کا اندازہ' عمارت کی تعمیر تک ایک ارب روپے کیسے ہو گیا۔ جبکہ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ افراط زر تو بہت معمولی بڑھا ہے ایک سوال یہ بھی ہے کہ سرکاری شعبہ کی گیارہ مالی اور تجارتی تنظیموں کو اس قدر بڑی عمارت کی تعمیر کی ضرورت کیا تھی ؟ جو فن تعمیر کا بھی کوئی ایسا نادر نمونہ نہیں ہے ؟

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عمارت جس کی تعمیری لاگت ہی چار گنا بڑھ چکی ہے تعمیری اعتبار سے ہی انتہائی گراں نہیں بلکہ اس میں "رہائش" بھی نہایت مہنگی پڑے گی۔ وفاقی انٹی کرپشن کمیٹی کے مطابق جن گیارہ سرکاری تنظیموں نے یہ عمارت تعمیر

Marfat.com

کرائی ہے ' جب وہ اپنے دفاتر وغیرہ اس عمارت میں منتقل کریں گی تو وہ اپنے دفاتر کے موجودہ کرائے ---- ساڑھے تین روپے فی مربع فٹ کے بجائے چار گنا زائد کرایہ چودہ روپے فی مربع فٹ ادا کریں گی اس سے ان مالیاتی اور تجارتی تنظیموں کے منافع پر برا اثر پڑے گا ۔ جبکہ ان میں سے بعض تنظیموں کا منافع کا ریکارڈ قابل رشک نہیں ہے ۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کو اس حقیقت پر بھی گہری تشویش ہے کہ اس عمارت میں استعمال کے لئے بیرون ملک سے 5 کروڑ 5 لاکھ روپے کا سنگ مرمر درآمد کیا گیا جبکہ ملک میں اس سے بہتر سنگ مرمر موجود تھا ۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا ؟ اس منصوبے کی ابتدائی منظوری کس نے دی اور پھر وقتاً فوقتاً اخراجات کی منظوری کون دیتا رہا ؟ کمیٹی نے اس ضمن دو سینئر عمال حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے جن میں ایک سابق وفاقی وزیر بھی شامل ہے ۔ اس ایک ارب روپے کی حماقت کی باقاعدہ تحقیقات ناگزیر ہے اور جو لوگ مجرم پائیں جائیں ان کو مثالی سزا دی جائے ۔"

مگر یاد رہے کہ تاحال نہ کسی کو بد عنوانی کی پاداش میں سزا ہوئی ہے اور نہ ہی عام پبلک کو کچھ بتایا گیا ' کہ خطیر رقم ' کیسے ' کیوں اور کس کے ایماء پر ضائع کی گئی اور نہ ہی مستقبل میں تدارک کا کوئی طریقہ سوچا گیا ہے ۔ کیونکہ جب سزا ہی نہیں تو ڈر کس کا ' صرف خوف خدا سے تو یہ لوگ صحیح کام کرنے کے نہیں ۔

دوسرے واقعہ کی رپورٹ "پاکستان ٹائمز" کے 15 اکتوبر 1987ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے ۔ " سرکاری فضول خرچی " کے عنوان سے شائع ہونے والی اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے :-

" حکومت پنجاب کے حسابات متعلقہ 85-1984 کے متعلق اپنی رپورٹ میں آڈیٹر جنرل نے متعدد ایسے امور کی نشاندہی کی ہے جن میں حکومت کے متعدد اداروں نے کروڑوں روپے زاید خرچ کئے ہیں ۔ رپورٹ کے مطابق کوئی 8 کروڑ 63 لاکھ روپے کی مالیاتی بے قاعدگیوں کا ارتکاب کیا گیا ہے ۔ اس میں سے سب سے بڑی رقم ---- 4 کروڑ 94 لاکھ روپے جو بے قاعدگی کی زد میں آنے والی رقم کا 57 فیصد ہے --- تو غبن کی گئی ہے ' چرالی گئی ہے یا خورد برد کر لی گئی ہے ۔ آڈیٹر جنرل کی رپورٹ کے مطابق سرکاری خزانہ کو اصول و قواعد کی خلاف ورزی سے ایک کروڑ

Marfat.com

21 لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا گیا ہے۔

"کوئی غلط کام کر کے روپے وصول کرنا ہی رشوت نہیں ہے بلکہ کسی کو بلا جواز مفاد پہنچانا بھی بد عنوانی ہی ہے۔ وفاقی محتسب نے 85-1984 کی اپنی سالانہ رپورٹ میں "رشوت" کو بد انتظامی قرار دیا ہے۔ اپنی رپورٹ میں وفاقی محتسب نے مزید قرار دیا ہے کہ ایسا فیصلہ، عمل، سفارش، فروگزاشت ایسا کام جو قواعد و ضوابط کے منافی ہو یا مسلمہ طریق کار سے تجاوز کر کے کیا جائے۔ "بد انتظامی" ہے آڈیٹر جنرل پنجاب نے جن مالیاتی بے قاعدگیوں کا انکشاف کیا ہے وہ واضح طور پر رشوت اور بدعنوانی کی ذیل میں آتی ہیں۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے قبل ازیں کسٹمز افسروں کی طرف سے ان موٹر گاڑیوں کے غلط استعمال کا سختی سے نوٹس لیا گیا تھا جو کسی وجہ سے کسٹمز میں رکی ہوتی ہیں ضبط کی ہوئی ہوتی ہیں یا کسٹم کی ادائیگی کی منتظر ہوتی ہیں۔ اخبارات میں، قبل ازیں، ایک اور رپورٹ بھی شائع ہوئی تھی جس کے مطابق نیشنل ڈی ریگولیشن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں یہ الزام عائد کیا تھا کہ حکومت عوام کو سستا آٹا فراہم کرنے کے لئے جو امدادی رقم (سب سڈی) دیتی ہے اس کا 80 فیصد ---- تقریباً ڈیڑھ ارب روپے ----- محکمہ خوراک کے بد عنوان افسر فلور ملوں کے مالکان اور ڈپو ہولڈر مل کر کھا جاتے ہیں۔ پاسکو کے ایک ڈپٹی جنرل مینجر کے خلاف اس سال کے اوائل میں مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے دوسری بد عنوانیوں کے علاوہ جعلی ووچروں کے ذریعے لاکھوں روپے نکلوا لئے۔ اس نے اپنی ایک فرم کو فرضی نام سے پاسکو کے پاس رجسٹر کر لیا۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق محکمہ داخلہ اور محکمہ صحت بھی بد عنوانیوں سے مبرا نہیں۔ مالی بے قاعدگیاں، غبن، ادویات وغیرہ کی خورد برد اور قومی خزانے کی لوٹ مار ان محکموں میں بھی ہے جس کا کوئی محاسبہ بھی نہیں کیا جاتا۔ حکومت کے مختلف محکموں میں بد عنوانیاں اب کوئی استثنے نہیں بلکہ کلیہ بن چکی ہیں۔ ایسے حالات میں ذمہ دار اصحاب کی طرف سے سادگی، بچت اور ایک یا دو ڈشوں کی دعوتوں کے اعلانات میں سچائی اور پارسائی محسوس نہیں کی جا سکتی اور ایسے اعلانات کا کوئی مفید نتیجہ بھی برآمد نہیں ہو سکتا۔ جب تک سرکاری خزانے کی خورد برد اور غلط استعمال کو نہیں روکا جاتا سادگی اور بچت

Marfat.com

کا کوئی اقدام کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

با اثر بیورو کریٹس کا ملک سے باہر جو علاج کرایا جاتا ہے اور بلاجواز قومی خزانہ جس طرح لٹایا جاتا ہے اس کے بارے میں ہفتہ وار "ویو پوائنٹ" کے 15 اکتوبر 1987ء کے شمارہ میں سے مسٹر ظفر عمر کے مضمون کے دو پیرا گراف دیئے جا رہے ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون ایک فاضل مصنف کی طرف سے ہلکا سا احتجاج ہے لیکن پاکستان کی محروم اکثریت کے لئے یہ آنکھیں کھول دینے والے حقائق ہیں۔

"اگرچہ کسی بیمار شخص کو سرکاری خرچہ پر علاج معالجہ کے لئے ملک سے باہر بھیجنے پر آنے والے اخراجات میں کمی محض سادہ لوحی ہی ہو گی مگر معاشرہ کے امیر ترین افراد بھی علامتی کفایت شعاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جب دنیا میں تیل کی کمی ہوئی تھی تو امریکی ایوان صدر کو موسم سرما میں گرم رکھنے کے انتظامات میں کمی کر دی گئی تھی۔ اسی دور میں برطانیہ کے شاہی خاندان نے اکیلے اکیلے آنے جانے کے لئے کاروں کے بجائے ایک ہی ویگن میں آنے جانے کا شعار اپنایا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ امریکی صدر اور انگلستان کا شاہی خاندان عوام کو درپیش مشکل حالات میں ان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔

"یہ سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سرکاری افسر کسی ضرورت مند یا نام نہاد ضرورت مند کو بیرون ملک علاج کے لئے سرکاری فنڈ فراہم کرتے ہیں۔ بیرون ملک علاج کی روایت جاگیردارانہ روایات کا حصہ ہے۔ یہ اس دور کی یاد کی طرح ہے جب ایک مطلق العنان بادشاہ سرکاری خزانے کا واحد مالک و مختار ہوا کرتا تھا۔ اسے یہ حق حاصل تھا کہ کسی پر بھی خوش ہو کر اس پر خزانہ کے منہ کھول دے۔ مگر اس دور میں پاکستانی حکومتوں کے بارے میں کیا کہئے گا جو کسی ایسے شخص کے بیرون ملک علاج کے لئے بھاری رقوم فراہم کر دیتی ہیں جو اپنی زندگی کے کسی مرحلہ پر مشہور ہو گیا تھا۔ ان میں ایسے لوگ شامل ہو سکتے ہیں جنہوں نے کامیاب اور بھرپور زندگی گزاری اپنے دور میں کروڑوں روپے کمائے مگر قومی خزانے میں ایک پھوٹی کوڑی تک جمع نہ کرائی حالانکہ ان کا حق تھا کہ دوسرے انسانوں کی امداد کے لئے قومی خزانہ میں اپنی آمدنی کا ایک حصہ جمع کراتے۔ کیا ایسے لوگوں کے لئے بھاری قومی رقوم محض اس لئے صرف

Marfat.com

کرنا مناسب ہے کہ حکومت کا کوئی کرتا دھرتا ان کی حالت سے متاثر ہوا ہے ؟

" ایسے کاموں کی اخباروں میں وسیع پیمانے پر تشہیر کرائی جاتی ہے کیونکہ اس سے سرکاری عمال کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا ہے اور عوام ایسا کام کرنے والے وزیر ' مشیر یا بیورو کو مہربان ' نرم دل قرار دیتے ہیں جو دوسرے انسانوں کے مسائل میں دلچسپی لیتا ہے ۔ اس سے سرکاری رقم حاصل کرنے والے کے ساتھ بھی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے ۔ بد قسمتی سے اس نوع کے " تماشے " میں عام شہری محض ایک تماشائی کا کردار ادا کرتا ہے مگر وہ یہ کہہ کر اپنی انا کو تسکین دیتا ہے کہ اس کے جذبات و احساسات کی وجہ سے حکام نے انسانی بھلائی کا اقدام کیا ہے ۔ یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ ملک میں لاکھوں افراد ہیں جو خود ایسی ہی بیماریوں میں مبتلا ہیں مگر بیرون ملک جانا تو کیا ' انہیں ملک کے اندر ہسپتالوں میں کئے جانے والے علاج معالجہ کا ایک فیصد بھی میسر نہیں آتا ۔ کیونکہ ان ہسپتالوں میں ڈاکٹر ' نرسیں ' طبی بیورو کریٹ اور عمال حکومت محروم طبقہ کے افراد پر معمولی سی توجہ بھی نہیں دیتے اور انہیں بیماری میں مرنے یا دکھ اٹھانے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں ۔ ان محروم لوگوں کے پاس نہ تو لوگوں سے تعلقات بڑھانے کا وقت ہوتا اور نہ وہ اتنے اہم ہوتے ہیں کہ ان کو دور سے ہی شناخت کیا جا سکے نہ ہی وہ انتظامیہ کا حصہ ہوتے ہیں ۔ آڑے وقت میں ان کا کوئی دستگیر نہیں ہوتا اور وہ اسی طرح دکھ اٹھاتے اٹھاتے زندگی گزار لیتے ہیں ۔ معاشرتی امور کا کوئی بھی طالب علم ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ ملک میں معاشی طور پر محروم لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو ایسے امراض میں مبتلا ہے جن کا اندرون ملک علاج ممکن ہی نہیں ۔ کوئی ایسا واقعہ منظر عام پر تو نہیں آیا جہاں حکومت نے کسی غریب نادار اور محروم طبقہ کے فرد کو سنگین مرض کے علاج معالجہ کے لئے از خود بیرون ملک بھجوایا ہو ۔ اگر جھوٹے پروپیگنڈے کے لئے کبھی ایک آدھ آدمی کو باہر بھیجا بھی گیا ' غریب اور نادار کہہ کر ' مگر حقیقت میں وہ آدمی اتنے وسائل خود بھی رکھتا تھا ' صرف قلم کی جادو گری سے افسر لوگ جب چاہیں امیر کو بھی غریب دکھا دیتے ہیں ۔

ملازمتوں پر اجارہ داری

پاکستان میں تین سو سے زائد بنک اور دوسری سرکاری کارپوریشنیں ہیں جن کی

Marfat.com

اندرون اور بیرون ملک ہزاروں شاخیں ہیں ۔ ان میں لاکھوں افراد ملازم ہیں ۔ اگر حقیقی معنوں میں تحقیقات کی جائے تو ظاہر ہو گا کہ ان بنکوں اور کارپوریشنوں میں ملازمتوں کا بڑا حصہ ان اداروں کے آقاؤں کے اعزا ' بیٹوں ' دامادوں اور دوسرے رشتہ داروں کو ہی ملتا ہے ۔ ان بنکوں اور کارپوریشنوں میں کوٹہ مخصوص ہونے کے باوجود کسی سندھی یا بلوچ کے لئے ملازمت شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ ان اداروں کے آقاؤں کے رشتہ دار بلوچستان یا سندھ سے جھوٹے ڈومیسائل حاصل کر لیتے ہیں یا پھر خرید لیتے ہیں اور ان صوبوں کے لئے مخصوص ملازمتیں بھی ہتھیا لیتے ہیں ۔ ان اسامیوں پر تقرر کے لئے نام نہاد امتحانات اور انٹرویو بھی ہوتے ہیں مگر اس کا مطلب عوام کو دھوکا دینے کے سوا کچھ نہیں ۔ آسامیاں تو مراعات یافتہ طبقہ کے لوگوں کو ہی ملتی ہیں ۔ وہ نہ صرف آسامیاں ہتھیا لیتے ہیں بلکہ اپنے بیٹوں بھتیجوں اور دوسرے اعزاء کو سرکاری خرچ پر بیرون ملک تربیت کے لئے بھی بھجواتے ہیں ۔ اس دوران ان کی ملازمت بھی برقرار رہتی ہے ۔ اور واپسی پر انہیں جلد جلد ترقیاں بھی مل جاتی ہیں سندھ اور بلوچستان کے کسی فرد کا تو ذکر ہی کیا ان حالات میں کسی بھی عام گرایجویٹ نوجوان کے لئے کوئی موقع نہیں ہوتا ۔ یہاں دو واضح طبقے نظر آتے ہیں ۔ ایک مراعات یافتہ جسے سرکاری خرچ پر ملک کے اندر اور باہر حصول تعلیم کے تمام مواقع حاصل ہیں دوسرا طبقہ عام شہریوں کا ہے جس کی یونیورسٹی کی ڈگری بھی کسی کام نہیں آتی ۔ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لئے ملازمت بھی حاصل نہیں کر سکتا ۔ اگر یہ صورت حال زیادہ عرصہ جاری رہی تو اس کے نتائج بھی جلد ہی ظاہر ہو نگے پاکستان کی نوجوان نسل، سخت غصہ میں اور مرنے مارنے پر تیار ہے ۔ اسے زیادہ عرصہ تک دبا کر رکھا نہیں جا سکتا۔

وہ وقت دور نہیں کہ نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ ' صوبہ میں اور زبانوں میں تقسیم کرنے والی دیواروں کو توڑ کر قوم کو ایک پلیٹ فارم پر لائیں گے اگرچہ اس وقت ایک سکیم کے تحت مراعات یافتہ طبقہ سرکاری یا نجی' قوم کو منتشر کرنے کی غرض سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کئے ہوئے ہے اور تنگ نظر لیڈروں کی بہتات ہے جن میں سے اکثر جھوٹے وعدوں پر قومی خزانہ سے خفیہ طور پر روپے لے کر پھل رہے

Marfat.com

ہیں ۔ اس ابتدائی سٹیج سے گزرنے کی قدرت سے امید ہے ۔

کیا پاکستان کے قیام کا مطمح نظر یہی تھا ۔ اگر غیر جانبدار غیر ملکی ماہرین پر مشتمل کوئی کمیٹی یا کمیشن بنایا جائے اور وہ قومی خزانے کے ضیاع کے بارے میں تحقیقات کرے تو یقیناً ہمارا نقطہ نظر ثابت ہو جائے گا ۔ ایسے کمیشن یا کمیٹی کی رپورٹ شائع بھی کی جانی چاہئے یقیناً اس رپورٹ سے قومی ضمیر ۔۔۔۔ اگر ہمارا قومی ضمیر موجود ہے تو ۔۔۔ کو بیدار کرنے میں مدد ملے گی ۔

اس نوع کا اقدام تو کوئی منتخب عوامی حکومت ہی کر سکتی ہے ۔ یہ " حکمران طبقہ ' کے بس کی بات نہیں ۔ میں نے اوپر جن نا انصافیوں اور عدم مساوات کا ذکر کیا ہے وہ محض ایک جھلک ہے ۔ مگر حال کی بھٹو اور جتوئی حکومتوں نے اس بارے میں بالکل چپ سادھ لی ۔ اور وہ آئے اور گئے ۔ دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے ۔

اعلیٰ سطح کی صوبائی یا وفاقی ملازمتوں مثلاً خارجہ سروس ' بینکنگ ' صنعت ' بری فوج ' بحریہ ' فضائیہ ' پی آئی اے ' وزارت خزانہ ' ریلوے کسٹمز اور عدلیہ میں سندھ اور بلوچستان کے لوگوں کا حصہ برائے نام یا بالکل نہیں ہے ۔ طلباء کی تنظیموں اور سیاسی جماعتوں کی طرف سے احتجاج کے باوجود یہ ناانصافی جاری ہے ۔ کیا اس صورت حال کا کوئی علاج ہے ؟ کون اور کب یہ علاج کرے گا ؟ اور حیرت یہ ہے کہ بھلا لوگ کب تک مزید انتظار کریں گے ؟ ؟

اگر کوئی شخص ان ناانصافیوں اور عدم مساوات کی نشاندہی کرے تو اسے غدار اور غیر محب وطن قرار دے دیا جاتا ہے جیسا کہ مولوی فضل حق اپنے وقت کا مسلمہ " شیر بنگال " حسین شہید سہروردی اور بعد میں شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ ہوا ' یا سرحدی صوبہ میں خان عبدالغفار خان ' عبدالولی خان ' سندھ میں جی ۔ ایم ۔ سید ' بلوچستان میں میر غوث بخش بزنجو ' سردار عطاء اللہ مینگل ' سردار خیر بخش مری ' عبدالصمد اچکزائی ' شہزادہ عبدالکریم ' میر گل خان نصیر اس کتاب کے مصنف (جسٹس خدا بخش مری) اور متعدد دوسرے افراد کے ساتھ کیا گیا ۔ قوم حقائق کو دبانے کا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں دیکھ چکی ہے ۔ ہمیں امید کرنی چاہئے کہ اس وقت چاروں صوبوں کے نوجوان بیدار ہیں ' وہ سب کچھ خوب جانتے بوجھتے ہیں اور

Marfat.com

کسی کو دوبارہ یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

1960ء اور اس کے بعد بلوچستان میں پولیس اور فوج کے بار بار کے چھاپے اور اب سندھ میں ایسی ہی کارروائیاں اس مسئلہ کا حل نہیں ہیں' اس کے برعکس ایسی کارروائیوں سے عوام میں محرومی کا احساس مزید بڑھے گا۔ جو تشدد آمیز کارروائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ قوم میں ایسی صورت پیدا نہ ہونے دی جائے تو بہتر ہو گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حکمرانوں اور نوکر شاہی کے رویہ میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ لیکن ابھی تک انہوں نے اس ضرورت کو تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ عوام کو اپنی مرضی اور خواہش کے اظہار کے لئے منظم ہونے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتے۔ ملک کے چاروں صوبوں کو مکمل خود مختاری دی جانی چاہئے اور وفاقی حکومت کے پاس دفاع' مواصلات' تجارت اور امور خارجہ کے شعبے ہی رہنے چاہئیں۔ یہ سب کچھ نئے آئینی ڈھانچے کے اندر رہ کر کیا جانا چاہئے تاکہ ملک میں آئندہ مارشل لاء کے نفاذ کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

سینٹ کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ فنانس بل کی ابتداء کر سکے اور قومی اسمبلی میں منظور شدہ فنانس بل کو مسترد کر سکے۔ سینٹ کا درجہ دوسرے ایوان (قومی اسمبلی) کے مساوی ہونا چاہئے۔ جیسا کہ امریکہ میں ہے۔ 1973ء کے آئین میں' بد قسمتی سے' یہ خامی موجود ہے جس کے باعث ہماری سینٹ محض "بحث و مباحثہ" کا ایوان بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے ارکان مالی مفادات حاصل کرتے ہیں' غیر ملکی دوروں پر جاتے ہیں اور وزیر بھی بن جاتے ہیں مگر ایوان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اگر سینٹ کو قومی اسمبلی کے مساوی اختیارات حاصل ہوتے تو شاید 1977ء کا مارشل لاء نافذ نہ ہوتا۔ 1973ء کے آئین میں یہی خامی ہے اور یہ آئین چھوٹے صوبوں کے حقوق کا تحفظ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ موجودہ صورت میں سینٹ صرف بحث مباحثہ کا' تقریریں کرنے کا ایک ادارہ ہے اور بس۔ ہمیں اس سے' چالیس سال میں ایک بار ہی سہی' سبق سیکھنا چاہئے۔ مسلح افواج کو اپنی بیرکوں میں رہنے کا موقع دینا چاہئے یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ سول حکومتیں اپنی ذمہ داریاں سمجھ کر عوام کی خدمت کریں' نہ کہ اپنے امور اپنے خاندان کو پالنے کا ذریعہ بنی رہیں۔ اس

Marfat.com

صورت میں تمام قومی ادارے رفتہ رفتہ بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ اور عوام پھر طوعا وکرھا فوج کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور یہ صورت حال گذشتہ چالیس سال کی مختصر ملکی تاریخ میں بار بار پیدا ہوتی رہی ہے۔

عام حالات میں فوج کا سول حکومت میں کوئی کردار نہیں ہونا چاہئے ۔ انہیں سیاسی بکھیڑوں میں اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے دفاع وطن کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا چاہئے ۔ حکمرانی کا اختیار عوام کو ملنا چاہئے ۔ آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے چاروں صوبوں میں قومی وسائل کی مساوی تقسیم ہونی چاہئے اور وفاقی حکومت کو صوبائی حکومت کے کام میں کم از کم مداخلت کرنی چاہئے ۔

مکمل صوبائی خود مختاری کی ضرورت

مستقبل میں ایک اور مارشل لاء کی مکمل روک تھام کے لئے فوج میں چاروں صوبوں کی مساوی نمائندگی ناگزیر ہے ۔ بڑی بڑی اجارہ داریوں ' بیورو کریسی کے زیر انتظام بڑی بڑی صنعتوں ' تجارتی اداروں اور بنکاری کے نظام کا خاتمہ کیا جانا چاہئے کیونکہ یہ سب صرف اور صرف نوکر شاہی کے مفاد کے مطابق چلائے جا رہے ہیں ۔ کراچی 'ہب' لاہور اور دوسرے شہروں میں مرکز صنعتوں کو صوبوں کے اندرونی علاقوں میں منتقل کیا جانا چاہئے تاکہ اندرون ملک عوام کو نہ صرف روزگار مل سکے بلکہ انکی فنی تربیت بھی ہو سکے ۔ آئندہ آنے والی حکومتوں کو اشیائے خوردنی کے لئے بیرون ملک سے خیرات یا بھاری سود پر قرضوں کے بجائے ملک کے اندر زرعی پیداوار پر مکمل انحصار کی پالیسی کو اپنانا چاہئے ۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے ' مسٹر جناح نے 1929ء میں برطانوی حکومت سے بلوچستان کے لئے صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا لیکن قیام پاکستان (1947ء) کے بعد آزاد پاکستان کی حکومت کو بلوچستان کو صوبہ کا درجہ دینے میں 25 سال لگ گئے بلوچستان کو پہلی بار 1971ء میں مسٹر بھٹو کی حکومت میں صوبہ کا درجہ دیا گیا ۔ اور بلوچستان کی تاریخ میں پہلا ہائی کورٹ بھی مسٹر بھٹو کے دور میں دسمبر 1976ء میں قائم کیا گیا اس سے قبل کی کوئی نصف درجن حکومتوں کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی فطری طور پر اس تاخیر کی وجہ سے' بلوچستان میں 25

Marfat.com

سال تک قومی تعمیر کے ادارے ہی قائم نہ ہو سکے ۔ صرف یہی نہیں بلوچستان کو صوبہ کا درجہ دیئے جانے کے باوجود بلوچستان کی الگ ہائی کورٹ کا قیام مزید چھ سال کی تاخیر سے عمل میں لایا گیا بلوچستان ہائی کورٹ کا قیام دسمبر 1976ء میں ہوا ۔ یہ کوئی رعایت نہیں تھی کہ مجھے بلوچستان ہائی کورٹ کا پہلا چیف جسٹس مقرر کیا گیا بلکہ میں بلوچستان کا پہلا بلوچ تھا جس کے پاس اعلیٰ تعلیم کی تین ڈگریاں تھیں اور میں چھ سال تک سندھ بلوچستان ہائی کورٹ میں بطور جج کام کر چکا تھا ۔ جو لوگ نئی ہائی کورٹ کے قیام میں پیش آنے والی مشکلات اور مسائل سے آگاہ ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ میں نے بلوچستان ہائی کورٹ کے قیام کے لئے کتنی محنت کی ہو گی اور مشقت اٹھائی ہو گی ۔

ابتداء میں ہم نے ہائی کورٹ ایک چھوٹی سی عمارت میں قائم کی جہاں سیشن جج کی عدالت قائم تھی ۔ بطور چیف جسٹس اپنی تعیناتی کے دوران میں نے صوبائی اسمبلی کے بالمقابل پانچ ایکڑ زمین حاصل کی تاکہ ہائی کورٹ کے شایان شان ' باوقار عمارت تعمیر کی جا سکے ۔ میں نے اس مقصد کے لئے حکومت سے فنڈز حاصل کئے عمارت کا نقشہ بنوایا اور ماہرین فن تعمیر کی خدمات حاصل کیں ۔ آخر میں ہائی کورٹ کی عمارت کا سنگ بنیاد 1988ء میں (سابق) وزیراعظم محمد خان جونیجو سے رکھوایا گیا ۔

ابتداء میں بلوچستان ہائی کورٹ کے ججوں کی تعداد تین تھی جو بعد میں پانچ تک بڑھا دی گئی ۔ عدالت نے افراد اور حکومت کے مابین مقدمات میں انصاف کا پرچم بلند رکھا اور پاکستان کی ہائی کورٹوں ' ہندوستان اور مغربی جمہوری ممالک کی اعلیٰ عدالتوں کی قائم کردہ روایات کی پاسداری کی گو اس میں ہمیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ' ہمیں انتہائی مشکل وقت درپیش تھا کیونکہ بلوچستان ہائی کورٹ کے قیام کے صرف چھ ماہ بعد مسٹر بھٹو کی منتخب حکومت برطرف کر دی گئی اور جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا ۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد شہریوں کے حقوق اور شہری آزادیوں پر زد پڑی جو مارشل لاء آرڈرز اور مارشل لاء ریگولیشنز کے نفاذ کا فطری نتیجہ تھا ۔ ہم نے اپنے حلف اور آئینی ضروریات کے مطابق مارشل لاء کی عدالتوں کی طرف سے شہری آزادیوں میں مداخلت کو حتی الوسع روکا اور انہیں ایک حد کے اندر رکھنے کی سعی کی ۔

Marfat.com

ہم نے یہ کام مقدس فرض سمجھ کر ملک و عوام کے مفاد کے مطابق انجام دیا۔ وکلاء اور صوبہ کے دانشور جانتے ہیں کہ جولائی 1977ء سے مارچ 1981ء تک چار سال کے طویل عرصہ میں بڑی حد تک بلوچستان ہائی کورٹ نے ہی مارشل لاء کے شدید دباؤ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مارشل لاء کی عدالتوں کی طرف سے شہری آزادیوں میں مداخلت کو روکا، شہریوں کے حقوق کا تحفظ کیا اور ماورائے آئین قوانین کو بیگم نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کی حدود کے اندر رکھا۔ اس عرصے میں بلوچستان ہائی کورٹ نے متعدد فیصلے صادر کئے جن میں سے بعض ملکی اور غیر ملکی قانونی جرائد میں چھپ بھی چکے ہیں ہماری ان دیانتدارانہ کوششوں پر مارشل لاء حکام سخت ناراض بھی ہوئے اور انہوں نے 1973ء کے آئین میں، جو پہلے ہی معطل تھا، آرٹیکل 212 الف کا اضافہ کیا اور آئین میں بنیادی تبدیلیاں کر دیں۔ ان ترامیم کے باعث مارشل لاء حکام کو "اندھے اختیارات" حاصل ہو گئے جن کے نتیجے میں ہائی کورٹ کی طرف سے رٹ جاری کرنے کے اختیارات غیر موثر بلکہ تقریباً ختم ہو کر رہ گئے۔

اس کے باوجود ہم نے درخواست نمبر 781/274 میں، جو اب قومی اور بین الاقوامی سطح پر "سلیمان قاسم بنام چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر" کے طور پر مشہور ہے، بلوچستان ہائی کورٹ کے فل کورٹ فیصلہ کے ذریعے ایک اور کوشش کی۔ ہم نے مارشل لاء عدالتوں کے کام کرنے کی بعض حدود کا تعین کیا جو بیگم نصرت بھٹو کیس میں متعین حدود کے مطابق تھیں۔ ہم نے مرکزی اور صوبائی حکومت کو یہ موقع بھی فراہم کیا کہ وہ ہمارے فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرے تاکہ سپریم کورٹ کو اپنے سابقہ موقف کی توثیق یا تردید کرنے کا موقع ملے۔ یہ ملک و قوم اور مارشل لاء حکومت کے فائدہ کے لئے ہوتا۔ حکومت نے اپیل بھی دائر کی مگر وہ سپریم کورٹ میں بغیر کسی کارروائی کے پڑی رہی۔ جب مارچ 1981ء میں آئینی ترمیم کے ذریعے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ضروری اختیارات واپس لے لیئے گئے۔

اسی معاملہ میں ایک ممتاز سیاستدان ایرمارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں نے بھی سپریم کورٹ میں ایک رٹ دائر کی۔ حیرت ہے کہ سپریم کورٹ نے مارچ 1981ء تک

Marfat.com

اپنے زیر سماعت اپیل پر کوئی فیصلہ نہ سنایا اس وقت آئین میں ایک اور ترمیم کی گئی جس کی پاکستان کی آئینی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی ۔ یہ آئینی ترمیم " عبوری آئین کا حکم " مجریہ 1981ء کی شکل میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے نافذ کی اس آئینی ترمیم کے نتیجے میں بلوچستان ہائی کورٹ کے تین ججوں --- میں چیف جسٹس اور سینئر ترین جج جسٹس ایم ۔ اے رشید کو اپنے عہدے چھوڑنا پڑے کیونکہ ہم نے نئے آئینی حکم کے تحت از سر نو حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا ۔ لاہور ہائی کورٹ اور سندھ ہائی کورٹ کے بعض ججوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سندھ ہائی کورٹ نے " بلوچستان ہائی کورٹ کے برعکس " اسی نکتہ پر حکومت کے حق میں فیصلہ صادر کیا ۔ یہ فیصلہ 3-2 کی اکثریت سے کیا گیا جبکہ لاہور ہائی کورٹ اور پشاور ہائی کورٹ نے آئین میں آرٹیکل 212 الف کے اضافہ کو تسلیم کر لیا اور محض یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ وہ اس معاملہ میں مداخلت کا اختیار نہیں رکھتے۔

بدقسمتی سے اس ملک میں یہ روایت ہی نہیں رہی کہ کوئی گورنر' جرنیل 'کوئی جج یا وزیر کسی اصولی معاملہ پر اختلاف کرتے ہوئے اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائے ۔ لیکن آبادی کے اعتبار سے ملک کے سب سے چھوٹے صوبہ کی ہائی کورٹ نے جس کے ججوں کی تعداد ہی تین تھی اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے تینوں ججوں نے متفقہ طور پر فیصلہ سنایا جو پاکستان کی قانونی تاریخ میں ایک نیا سنگ میل ہے ۔

کیا ہمارے ملک کے عوام بلوچستان کے عوام سے مزید قربانی کی توقع رکھتے ہیں ۔ بد قسمتی سے ہماری اس قربانی کو عام شہریوں ' دانشوروں ' سیاستدانوں اور پریس نے نہیں سراہا 'گویا انہیں وقوف ہی نہ تھا کہ ہم نے کتنی بڑی قربانی دی ہے ۔ " عبوری آئین کے حکم " کے تحت ججوں کو ان کی مرضی کے بغیر دو سال کے لئے ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں تبادلے کا مستوجب بھی قرار دے دیا گیا اور ان پر مزید کئی پابندیاں عائد کر دی گئیں ۔ اس طرح ہائی کورٹوں کے اختیارات کم کرنے کے علاوہ ججوں کی ملازمت کا تحفظ ختم کر دیا گیااور ان کے وقار میں کمی ہو گئی ۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سپریم کورٹ کے تین ججوں نے بھی " عبوری آئین کے حکم " مجریہ 1981ء کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا ۔ اور ان تینوں کو بھی ملازمتوں سے

Marfat.com

محروم ہونا پڑا ۔ در حقیقت " عبوری آئین کے حکم کے ذریعے نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کو ہی غیر موثر قرار دے دیا گیا اور ججوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے جاری کردہ احکام ' آرڈی نینس وغیرہ پر جوں کا توں عمل کریں جنہوں نے اب 1973ء کے بچے کھچے آئین میں مزید ترامیم کے لئے مکمل اختیارات از خود حاصل کر لئے تھے ۔ جیسا کہ حالات سے ظاہر ہے 1950ء کی دہائی کے بعد قومی پریس کا تو گویا کوئی وجود ہی نہ تھا ۔ پریس بتدریج تجارتی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر استوار تھا خواہ وہ اردو پریس ہو یا انگریزی ' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ' دوسرے اداروں کی طرح پریس میں بھی شدید گروہ بندی آ گئی ۔ 1984ء میں حکومت نے تقریباً 15 اخبارات اور جریدوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ۔ ایک سال (1983-84) میں مقبوضہ پریس کو چلانے کے لئے قومی بجٹ سے 15 کروڑ 80 لاکھ روپے صرف کئے گئے ۔ اس پریس کا اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ وہ وقت کی حکومت اور اس کے عمال کے تمام اچھے یا برے کاموں کی تحسین کرے اور ان کا جواز پیش کرتا رہے۔

دوسرے نام نہاد آزاد اخبارات پانچ یا چھ خاندانوں کی ملکیت ہیں ۔ یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ یہ " آزاد " اخبارات حکومت سے کروڑوں روپے کے اشتہارات ' نیوز پرنٹ اور دوسری کئی مراعات حاصل کرتے ہیں ۔ یوں یہ اخبارات انتہائی درجہ کے فرقہ پرست اور تجارتی ادارے بن گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ یہ " آزاد " اخبارات لاہور اور کراچی میں مرتکز ہیں ۔ ایک دو مستثنیات کے سوا جو اخبار جرائت سے کام لے کر کچھ لکھتے ہیں ان کے اشتہارات بند کر دیئے جاتے ہیں ۔ دیہی علاقوں میں رہنے والے 70 فیصد عوام تو مقامی اردو یا انگریزی اخبارات سے کلی طور پر محروم ہیں ۔ یوں عوام کی بھاری اکثریت جو دیہات یا چھوٹے قصبوں میں رہائش پذیر ہے ۔ ان کے نہ تو مسائل ہی سامنے آتے ہیں اور نہ ہی ان کی مشکلات کا کوئی حل نکالا جاتا ہے ۔

قیام پاکستان سے قبل کے عرصہ میں نکلنے والے اخبارات کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا آج پاکستان جن علاقوں پر مشتمل ہے ' قیام پاکستان سے قبل وہاں پر ضلعی اور تحصیل ہیڈ کوارٹر میں ایک آدھ ہفتہ وار یا پندرہ روزہ اخبار

Marfat.com

ضرور نکلتا تھا ۔ جن کے ذریعے ملک کے سیاسی حالات اور عوام کے مسائل منظر عام پر آتے رہتے تھے ۔ بدقسمتی سے اب ایسا نہیں کیونکہ اجارہ دار اخبارات صوبائی اور وفاقی حکومتوں سے تمام تر مراعات اور فنڈز حاصل کر لیتے ہیں جن کے عوض وہ حکومت وقت کے تمام اچھے یا برے کاموں کی تعریف کرتے ہیں ۔ یہ افسوس ناک صورت حال تبدیل کی جانی چاہئے ۔ اس کے بغیر پاکستان مکمل جمہوری ملک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ پریس کے متعلق نئی پالیسی رو بہ عمل لانی ہو گی ۔ اجارہ داریاں توڑنا ہوں گی ' اور ملک کے اندرونی حصوں میں اخبارات کی حوصلہ افزائی کرنا ہو گی ۔ اسی طرح پنجابی ' بلوچی سندھی اور پشتو زبانوں کو فروغ ملے گا ۔ ملک میں ایک متوازن پریس معرض وجود میں آئے گا اور ملک کے دیہی علاقوں میں رہنے والے 70 فیصد عوام کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی صورت نکل سکے گی ۔

زبان

مادری زبان کی حلاوت اور جس آسانی سے دوسری زبانوں کی نسبت مادری زبان میں تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے ' سبھی کو اس کا علم ہے ۔ لہٰذا مجھے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں افریقہ کے سینٹ آگسٹن نے 16 سو سال قبل اپنے " اعترافات " میں بھی اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے ۔ وہ نسلا بربر تھا اور شمالی افریقہ میں پیدا ہوا تھا جو اس دور میں سلطنت روم کا حصہ تھا ۔ آگسٹن نے کار تھیج میں تعلیم حاصل کی تھی جو موجودہ تونس کی جگہ آباد تھا اور اس دور میں علم و فضل کا مرکز تصور کیا جاتا تھا ۔ پھر وہ روم اور میلان (اٹلی) چلا گیا ۔ جہاں اس نے مزید تعلیم حاصل کی ۔ اس کی مادری زبان لاطینی تھی لیکن اس دور کے نظام تعلیم کے مطابق اسے یونانی زبان سیکھنا پڑی ۔ غیر ملکی زبان سیکھنے میں اسے کس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا یہ اسی کی زبان سے سنئے یہ اقتباس آگسٹن کے اعترافات سے ہی حاصل کیا گیا ہے ۔ ان اعترافات کا انگریزی ترجمہ ریکس وارنر نے کیا ہے جو 1963ء میں شائع ہوا ہے اس بات پر زور دینے کی شاید ضرورت نہیں کہ سینٹ آگسٹن نے 354-401 میں جو مشکلات (غیر ملکی زبان سیکھنے میں) محسوس کی تھیں وہی مشکلات آج ایک پنجابی ' پٹھان ' سندھی ' یا بلوچی بولنے والے شہری کو پیش آتی ہیں جب اسے اپنی مادری زبان کے سوا کسی اور زبان

Marfat.com

میں تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے ۔ اس کا ایک حل شاید یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام نسلی گروپوں کو جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ۔ ایک خاص سطح تک چاروں زبانیں سیکھنے کا پابند بنایا جائے جیسا کہ سوئٹزر لینڈ میں ہے ۔ اس سے یہ سارے نسلی گروپ ایک دوسرے سے زیادہ قریب آ جائیں گے ۔ دوسرا متبادل یہ ہے کہ ہم روس کے اختیار کردہ راستے پر چلیں جو انہوں نے مختلف صوبوں میں مختلف زبانوں کی تدریس کے لئے اختیار کیا ہے ۔ ایک بات یقینی ہے کہ پاکستان کی کسی نہ کسی حکومت کو یہ معاملہ طے کرنا ہو گا ۔ پاکستان میں اس وقت مختلف صوبوں میں جو رویہ اور رجحانات پائے جاتے ہیں انکے پیش نظر یہ مسئلہ جتنی جلد حل کر لیا جائے ملک کے لئے اتنا ہی سود مند ہو گا تاہم حکومت بلوچستان نے صوبائی اسمبلی کی ایک قرارداد کے ذریعے بلوچی ' پشتو اور براہوی کو صوبائی زبانیں قرار دیدیا ہے ۔ دوسرے صوبے بھی اس کی تقلید کر سکتے ہیں چلئے کچھ بھی ہو آگسٹن نے کہا تھا ۔ :۔

" میں اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھے یونانی زبان سے نفرت کیوں ہے جو مجھے بچپن میں پڑھنا پڑی تھی ۔ میں تو لاطینی زبان کا دلدادہ تھا ۔ اس کی گرامر کا نہیں لاطینی ادب کا ۔ مگر میں یونانی ادب سے کیوں نفرت کرتا ہوں جو ادبی شاہکاروں سے بھرپور ہے ہومر بڑا چابکدست ادیب ہے اور ادبی شاہکاروں کا خالق ' اس کی خودستائی میں بھی ایک شیرینی ہے ۔ پھر بھی جب میں ابھی نوعمر تھا ' ہومر کے ادب پارے میری پسند کے مطابق نہ تھے ۔ میرے خیال میں یونانی بچوں کے ورگل کے بارے میں احساسات میرے احساسات کے مشابہ ہی ہوں گے جب انہیں ورگل کے ادب پارے پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہو گا جیسا کہ مجھے ہومر کو پڑھنے پر مجبور کیا گیا تھا ' بلاشبہ یہ مسئلہ زبان کی مشکل کا تھا اور غیر ملکی زبان پر دسترس حاصل کرنے میں یہ دشواری ایسی تھی گویا یونانی ادب پاروں ' افسانوں اور میٹھی کہانیوں کی مٹھاس پر حنظل کا پانی چھڑک دیا گیا ہو ۔ مجھے تو یونانی کے الفاظ آتے ہی نہیں تھے اور مجھے یونانی سیکھنے پر مجبور کرنے کے لئے سخت اقدامات کئے جاتے تھے ' سزا دی جاتی تھی اور مزید سزا کی دھمکیاں دی جاتی تھیں ۔ اگرچہ میرے بچپن میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب مجھے لاطینی کا بھی ایک لفظ نہیں آتا تھا ۔ لیکن میں نے کسی مشکل یا اذیت کے بغیر معمولی

Marfat.com

توجہ سے لاطینی سیکھ لی ۔ میں نے لاطینی اپنی انا کی پرلطف اور پیار بھری باتوں' اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ہنسنے ہنسانے والے چٹکلوں اور نرم و ملائم بات چیت سے سیکھی تھی یہ زبان سیکھنے کے لئے نہ تو مجھ پر کوئی دباؤ ڈالا گیا اور نہ مجھے کسی سزا یا ازیت کا خطرہ تھا نہ ہی کسی کو مجھے یہ کہنے کی ضرورت تھی کہ میں لاطینی سیکھ لوں ۔

"میرا دل مجھ سے کہتا تھا کہ اس میں جو خیالات پوشیدہ ہیں ' میں ان کا اظہار کروں اور ایسا کرنا تبھی ممکن تھا کہ میں الفاظ سیکھتا ' بولتا اور سمجھتا۔ میں نے یہ الفاظ کسی استاد سے نہیں سیکھے ' میں نے یہ الفاظ ان لوگوں سے سیکھے جو میرے ساتھ یہ الفاظ بولتے تھے یا میں ان کو بعض الفاظ بولتے سنتا تھا۔ یوں میں بھی اپنے دل میں پیدا ہونے والے خیالات کے اظہار پر قادر ہو گیا۔ میرے محسوسات کو زبان مل گئی۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ زبان سیکھنے کے معاملہ میں آزادانہ تجسّس اور شوق' سختی سے نافذ کئے جانے والے نظم سے زیادہ مفید اور طاقتور ذریعہ ہوتا ہے "۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مغربی پاکستان کے تنگ نظر سیاستدانوں نے بیورو کریٹس کے ایماء پر مشرقی پاکستان کے عوام کے جائز اور بروقت مطالبے کو کہ بنگالی کو بھی قومی زبان یا مشرقی پاکستان کی زبان قرار دیا جائے' نہایت نفرت اور بغیر حیل و حجت کے مسترد کرتے رہے۔ اس کے برعکس صرف "اردو" کو قومی زبان قرار دیا گیا۔

حالانکہ متحدہ پاکستان کی 56٪ آبادی کی زبان بنگالی تھی ۔ اس کے برعکس اردو بولنے والوں کی تعدد موجودہ پاکستان میں بھی صرف 7 فیصد ہے ۔ جبکہ چاروں صوبوں کی بقیہ 93٪ آبادی کی مادری زبانیں ' پنجابی ' بلوچی ' سندھی ' پشتو اور سرائیکی ہیں ۔ اور ان صوبوں کو ماضی سے سبق سیکھ کر اپنی زبانیں سرکاری طور پر صوبوں میں رائج کرنے کا اختیار ملنا چاہئے ۔

اردو ایک خوبصورت زبان ہے لیکن کسی کی مادری زبان سے زیادہ اس کے لئے کوئی زبان خوبصورت نہیں ہو سکتی جیسی کہ سندھی کے لئے سندھی ' بلوچ کے لئے بلوچی ' پٹھان کے لئے پشتو اور پنجابی کے لئے پنجابی ہو سکتی ہے ۔

یہ امر غیر متنازعہ ہے کہ اردو زبان کو سو سال کے عرصہ کے دوران وادی گنگا جمنا میں فروغ ملا جو مسلمان بادشاہوں کا علاقہ تھا ۔ چونکہ مسلم افواج میں ترک ' افغان '

Marfat.com

ازبک' ایرانی' بلوچ' عرب اور سندھی شامل تھے لہٰذا ان سب کے ملاپ سے ایک نئی فوجی زبان معرض وجود میں آئی ۔ یہ زبان مختلف زبانیں بولنے والے گروپوں کے درمیان رابطہ کی زبان بن گئی ۔ بعد ازاں مسلم شرفاء اور دانشوروں نے ہندوؤں کے " ثقافتی حملہ " کے خلاف مزاحمت کے لئے اردو کو اپنایا ۔ کیونکہ ہندوؤ " ہندی زبان " استعمال کر رہے تھے ۔

مگر اب پاکستان میں تو ہندی یا ہندو ثقافت کے غلبہ کا کوئی امکان نہیں ۔ لہٰذا ماضی کی طرح اب " اردو " کو مذہبی تقدس عطا نہیں کیا جا سکتا ۔ اردو کو اگر ایک زبان کی حیثیت میں زندہ رہنا ہے تو یہ کام اس کی اپنی فطری قوت کے ساتھ ہی انجام پا سکتا ہے کہ یہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے عوام کے درمیان رابطہ کا بڑا ذریعہ ہے ہاں گولی یا قانون کے ذریعے اس کا تسلط قائم نہیں کیا جاسکتا ۔ اگر ہم جمہوری اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو آج بنگالی ہماری قومی زبان ہوتی یا پھر آج پنجابی کو قومی زبان کا درجہ مل چکا ہوتا کیونکہ پنجابی (موجودہ) پاکستان کی آبادی کا 60 فیصد سے زیادہ ہیں ۔ بھلا پاکستان کے 93٪ فیصد شہریوں پر ' ان کی رضا مندی کے بغیر' اردو کو کس طرح ٹھونسا جا سکتا ہے ۔ بلوچی ' پشتو اور سندھی زبانیں دو سے تین ہزار سال پرانی ہیں جبکہ اردو کی عمر لگ بھگ ایک سو سال ہے ۔ پاکستان جمہوری عمل اور ووٹ کے ذریعے حاصل کیا گیا تھا ۔ فوجی قوت سے نہیں نہ ہی بڑے بڑے تاجروں یا انگریزوں کے مراعات یافتہ سرداروں ' چوہدریوں 'خانوں اور جاگیرداروں نے یہ خطہ زمین حاصل کیا تھا کوئی دو ہزار شہری بابو پنجابی جو برطانوی سامراج کے زیر سایہ پیدا ہوئے اور پرورش کئے گئے جو سول سروس اور مسلح افواج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے' بلھے شاہ اور ہیر وارث شاہ کی خوبصورت پنجابی زبان احساس کمتری میں مبتلا ہو کر بولنے سے شرماتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے اردو کو اپنالیا ۔ لیکن پنجابیوں کی غالب اکثریت آج بھی پنجابی بولتی ہے اور وہ پنجابی بولنے پر نادم نہیں ہے دوسرے صوبوں میں بھی بالکل یہی صورت حال ہے اس مراعات یافتہ چھوٹے طبقے' ان شہری بابو پنجابیوں نے اردو کی کوئی خاطر خواہ خدمت نہیں کی کیونکہ وہ آج بھی باہمی بات چیت میں انگریزی کو ذریعہ اظہار بنانا پسند کرتے ہیں اس کے بعد وہ پنجابی اور سب سے آخر میں اردو بولنے کو

Marfat.com

ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اعلیٰ منصب پر فائز اردو بولنے والوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اردو بولتے ہیں یا پھر اردو بولنے سے ان کا مقصد پنجابیوں کے خلاف اپنی ثقافتی برتری ثابت کرنا ہوتا ہے۔

گزشتہ دنوں مجھے کراچی کے ایک اردو اخبار میں ایک مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا جو ایک اردو بولنے والے یا مہاجر --- بعض لوگ یہ لقب پسند کرتے ہیں --- کا لکھا ہوا تھا ۔ جہالت یا حالات سے واقف نہ ہونا قابل معافی ہے لیکن تعصب اور آنکھیں بند کر کے طرف داری قابل مذمت ہے ۔ مضمون کا مرکزی خیال یہ تھا کہ پشتو اور بلوچی قبائلی اور لکھے پڑھوں کی زبانیں نہیں اور ان کا کوئی ادب بھی نہیں۔ صاحب مضمون نے یہ باتیں اردو کے غیر ضروری دفاع کے لئے لکھی تھیں ۔ سندھی ' پشتو ' اور پنجابی کے بارے میں بھی موصوف کے خیالات یہی تھے ۔ لیکن حقائق تو اس کے برعکس ہیں جن کا اجمالی ذکر میں نے کتاب کے اس باب میں کیا ہے ۔

بلوچ عوام اور ان کی زبان کوئی تین ہزار سال پرانی تاریخ کے امین ہیں ۔ اس ضمن میں مفصل تاریخی اور لسانی بحث میری کتاب "And Blochistan Search Lights of Blochis" کے باب تا 70 میں دیکھی جا سکتی ہے جو رائل بک کمپنی کراچی نے 1974ء میں شائع کی تھی ۔ یا اس کے اردو ترجمہ میں پڑھی جا سکتی ہے جو نساء ٹریڈرز پیٹل روڈ کوئٹہ نے شائع کیا ہے ۔

یہ عمومی نظریہ کہ بلوچی دراصل بگڑی ہوئی فارسی ہے ' نامور مستشرق پروفیسر بی۔اے گریرسن نے قدیم تحریروں کو بذریعہ کلید پڑھنے کے بعد باطل ثابت کر دیا ہے ۔ پروفیسر گریرسن کے مطابق بلوچی فارسی سے زیادہ قدیم زبان ہے اور یہ اپنی فطری قوت کے باعث ہی پروان چڑھی ہے ۔ اس نے اپنی تمام نزاکتوں اور باریکیوں کو قائم رکھا ہے حتیٰ کہ حروف علت اور حروف جار کی اپوزیشن بھی تبدیل نہیں ہوئی ۔ اس ضمن میں بلوچی قدیم پہلوی کے مساوی درجہ کی حامل ہے ۔ پروفیسر گریرسن کے مطابق " بلوچی دوسری بہت سی ایرانی زبانوں کی طرح ' پرانی فارسی کی نسبت " اوستا " کی زبان سے زیادہ قریب اور ملتی جلتی ہے ۔ " اوستا " پرانی تحریروں کی زبان ہے جس سے جدید فارسی نے جنم لیا ہے ۔

Marfat.com

ایران کے ڈاکٹر رضازادہ شفق نے اپنی کتاب " تاریخ ادبیات ایران " میں ایک پرانے مخطوطہ کا ذکر کیا ہے جس کا زمانہ 465-486 قبل از مسیح بیان کیا جاتا ہے۔ اس مخطوطہ کی زبان بالکل موجودہ بلوچی سے مشابہ ہے جو آج بھی پاکستان ایران اور افغانستان کے بلوچوں میں بولی جاتی ہے۔

جدید فارسی میں گرامر کے اعتبار سے الفاظ کی شکلیں بدل چکی ہیں اگر قدیم فارسی کے کسی جملہ کو جدید فارسی میں تحریر کیا جائے تو ان دونوں میں شاید ہی کوئی مشابہت تلاش کی جا سکے لیکن بلوچی میں ایسا نہیں قدیم بلوچی اور اس وقت بولی جانے والی بلوچی میں گرامر کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں بلکہ زبردست مشابہت موجود ہے۔

بلوچی میں (قدیم اور جدید) فعل کی شکل تقریباً یکساں ہے۔ مثلاً "شی یا گوشی" قدیم فارسی میں " پت " اب جدید فارسی میں " پدر " بن چکا ہے مگر بلوچی میں یہ آج بھی " پت " ہی ہے جیسا کہ " اوستا " اور " سنسکرت " میں ہے۔ اسی مخطوط میں ہم بلوچی الفاظ دیکھتے ہیں۔ مثلاً قوم بمعنی " بیج " مئے یعنی میرا ' "رورگر" بمعنی بذریعہ قوت و جبر سے لینا ایذا بمعنی یہاں ' موریتا یعنی مردہ یا مرگیا۔ اور شیاتیا بمعنی عمرت ہیں لیکن جدید فارسی میں یہ " تخم مال من " ' (قدیم فارسی میں ضمیر متکلم یا تو جدید فارسی میں فروغ نہیں پا سکا یا پھر ختم ہو کر رہ گیا ہے) مثلاً زر کنیدہ ' اینجا ' مرد اور شادی میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

مغربی پروفیسر گریرسن کے کیمبرج اور آکسفورڈ ' عظیم مشرقی پروفیسر مینارسکی روسی عالم زروبین ' انگریز مستشرق پروفیسر بیلی اور ڈاکٹر گرے وچ نے بلوچی زبان میں بہت تحقیق کی ہے۔ گذشتہ چند سالوں سے ایک نوجوان متشرق پروفیسرا یلفن بائس نے بلوچستان میں رہ کر بلوچی زبان پر بہت کام کیا ہے اور اپنی تحقیقات کتابوں کی صورت میں چھاپ دی ہیں۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ بتاتا جاؤں جب میں انگلستان میں قانون کی تعلیم کے لئے گیا ہوا تھا 1954ء-1958ء کے دوران میں نے برٹش میوزیم لائبریری اور دوسری بڑی لائبریریوں سے استفادہ کیا بلوچی زبان ' بلوچوں کی تاریخ اور ادب کے بارے میں اس دوران میں مجھے پروفیسر " بیلی " سے ملنے کا موقع ملا پروفیسر گرے وچ

Marfat.com

بھی میرے ساتھ تھے مجھے یاد ہے کہ اس وقت ان کی عمر 80 سال سے تجاوز کر گئی ہو گی مجھ سے بلوچی میں ٹیپ پر جو جی میں الفاظ ریکارڈ کرنے کی درخواست کی گئی ۔ اس کے بعد پروفیسر نے ٹیپ کو آہستہ چلایا اور دو یا تین الفاظ نوٹ کئے ۔ اور اپنے الفاظ کی لائبریری کے ریکارڈ میں چھان بین کے بعد بتایا کہ یہ دو الفاظ بنیادی طور پر 3 ہزار سال پرانے ہیں ۔ ان میں صدیوں کے دوران معمولی تبدیلی ضرور آئی ہے ۔ مگر بنیادی طور پر یہ پرانے ہیں ۔ مجھے پروفیسر نسارسکی کی طرف سے دعوت نامہ ملا کہ کیمرج میں ایک ہفتہ اور رہوں تاکہ کچھ مزید تحقیق کی جا سکے ۔ بد قسمتی سے مجھے لندن واپس جانا تھا اور میں نے یہ موقع گنوا دیا ۔ یہ جون 1958ء کی بات ہے ساتھ ہی پروفیسر گرے وچ نے مجھے کیمرج میں بلوچی زبان پر کام کرنے کے لئے سکالرشپ کی بھی پیش کش کی مگر میں نے یہ موقع گنوا دیا ۔ ہمارے اردو بولنے والے مصنفین ' اگر سب نہیں تو کچھ نہ کچھ ' فردوسی سے ضرور واقف ہیں ۔ فردوسی نے اپنی طویل نظم " مثنوی " " شاہنامہ " میں کم از کم بارہ مرتبہ بلوچ جنگجو بہادروں کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق شاہ کاؤس کی فوج سے تھا جسے تاریخ میں کے خسروں (53۔558 ڈی سی) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے ۔ فردوسی نے شاہ نامہ میں اردشیر (251۔226) کے دور میں بھی بلوچوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ شاہ نامہ میں آخری بار بلوچوں کا ذکر نوشیرواں کے عہد میں ہوا ہے ۔ جس کا زمانہ 640ء کا ہے ۔ بلوچوں نے نوشیرواں کی فوجوں کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں ۔ فردوسی نے اتفاقاً اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ بلوچوں کی اپنی زبان تھی جو دوسروں کی بولیوں سے ممتاز تھی ۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سندھی اور پشتوں زبانوں کا اپنا شاندار ادب ہے۔

برطانوی دور کے اوائل میں ' مکاتب اور مدرسوں میں بلوچی' فارسی اور عربی کے ساتھ پڑھائی جاتی تھی ۔ سندھی کی بھی یہی صورت حال تھی جو سندھ کے کئی سرکاری دفاتر اور پولیس کے ریکارڈ میں آج بھی مستعمل ہے ۔ یہ بات باعث حیرت ہے کہ صوبائی زبانیں کس طرح اور کس وجہ سے نظر انداز کی جا سکتی ہیں ۔ اس کے برعکس اردو بولنے والوں کو بھی یہ زبانیں سیکھنا ہوں گی ۔ کیونکہ وہ پاکستان کی آبادی کا ایک حصہ ہیں ورنہ وہ عوام کے دھارے سے کٹ کر رہ جائیں گے ۔ اور یوں غیر ضروری

Marfat.com

علیحدگی اور تنہائی کا باعث بن جائیں گے۔

جن دنوں میں انگلستان میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا' مجھے متعدد "بلوچی مسودے" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مسودے جو نثر اور نظم دونوں پر مشتمل تھے۔ بلوچ مصنفین کے قلم کا شاہکار تھے اور تقریباً 1880ء میں ورطہ تحریر میں لائے گئے تھے۔ یہ مسودے برٹش میوزیم لائبریری کے مشرقی زبانوں کے حصہ میں موجود ہیں۔ بھلا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ بلوچی ایک "غیر تحریری" یا خانہ بدوش قبائل کی زبان ہے۔ علاوہ ازیں بلوچی زبان میں بیسیوں جرائد اور کتابیں بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ نے شائع کی ہیں یہ کتابیں اور جرائد جو نظم اور نثر دونوں سے مرصع ہیں نوجوان بلوچ ادیبوں کے قلم سے نکلے ہیں۔ بلوچی اکیڈیمی 1962ء میں قائم ہوئی۔ میں اس کا بانی اور پہلا جائنٹ ڈائریکٹر تھا۔ جام درک کی بلوچی شاعری کا مجموعہ جو بشیر بلوچ نے مرتب کیا تھا۔ 1963ء میں بلوچی اکیڈیمی کی پہلی کتاب تھی۔ آج بلوچی اکیڈیمی ایک بڑا ادارہ بن چکی ہے اس کے تحت نوجوان بلوچ قلم کاروں نے بہت سا کام کیا ہے۔ یہ ہر سال بلوچی میں متعدد کتب شائع کر رہی ہے۔ میں خود ایک مری بلوچ ہوں۔ میرا تعلق بلوچستان کے "مری" علاقہ سے ہے اور بلوچی میری مادری زبان ہے۔ میں نے بھی بلوچی میں کچھ کتابیں مرتب کی ہیں "قدیم بلوچی شاعری" ان میں سے ایک ہے جو اردو ترجمہ کے ساتھ 1965ء میں کوئٹہ اور پھر 1976ء میں کراچی سے (دوسرا ایڈیشن) شائع ہو چکی ہے۔ یہ کہنا کہ بلوچی زبان تو ادب سے محروم ہے' کھلی جہالت ہے۔ میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی ہے۔ میری تجویز ہے کہ بلوچی' سندھی' پشتو' اور پنجابی کو زیادہ نہیں تو اردو کے ساتھ مساوی مرتبہ دیا جانا چاہئے ایسا کرنا تمام صوبوں کے عوام کے مفاد میں ہو گا۔

جہاں تک اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے کا تعلق ہے میں سندھ کی نمائندہ رائے پیش کرتا ہوں جس کا اظہار علی گڑھ کے تعلیم یافتہ' اردو' سندھی اور انگریزی کے عالم بلحاظ پیشہ ایک ماہر تعلیم' اور اب پیپلز پارٹی کی حکومت میں وفاقی وزیر تعلیم سید غلام مصطفیٰ شاہ نے کیا ہے۔ انہوں نے کراچی پریس کلب میں "سندھی معاشرہ اور کل کا سندھ" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا ہے (بعد میں ان کی یہ تقریر

Marfat.com

ان کے ماہ نامے سندھ کوارٹرلی " میں شائع ہوئی ۔ میں اس کی صفحہ 32 تا 35 سے چند پیرگراف پیش کرتا ہوں۔)

" آج چالیس سال گزر جانے کے بعد اگر آپ کوئی اردو یا انگریزی روزنامہ ' جریدہ یا رسالہ اٹھا کر دیکھیں تو آپ ششدر رہ جائیں گے کہ ملکی افراد ' خواتین اور بچوں ' مقامات ' ذات قبیلوں علاقوں ' جغرافیائی نام وغیرہ ' سبزیوں ' پرندوں اور مویشیوں کے نام تک سے لوگ آشنا نہیں اور ان ناموں کے ہجے تک غلط لکھے ہوتے ہیں ۔ ان کے صرف ہجے اور تلفظ ہی غلط ادا نہیں کیا جاتا بلکہ اس طرح غلط سلط لکھا جاتا ہے کہ ان ناموں وغیرہ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا جاتا ہے اور بسا اوقات تو یہ صورت توہین آمیز اور جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی ہوتی ہے ۔ اس طرح افراد ' مقامات اور واقعات کے بارے میں تمام معلومات ہی ناقص ' نا قابل اعتبار اور گمراہ کن ہو جاتی ہیں ۔ پاکستان میں آپ کو متعدد ایسے نام نہاد تعلیم یافتہ حضرات ملیں گے جو دنیا بھر کے بارے میں ہر قسم کی معلومات بڑے وثوق سے فراہم کریں یا بیان کریں گے ۔ لیکن انہیں پاکستان ' اس کے صوبوں یا ان کی جغرافیائی صورت حال کے بارے میں کچھ علم نہ ہو گا ۔ آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو ڈیرہ اسماعیل خان کو ڈیرہ غازیخان سے غلط ملط کریں گے ' ان کو پاکستان کے دریاؤں کے نام تک یاد نہ ہوں گے ' جن کو بلوچستان اور چولستان کا فرق معلوم نہیں ہوگا ' جو میرپور سکردو کو میرپور خاص کا نواحی قصبہ تصور کرتے ہوں گے سجاول کو سن کے قریب بتائیں گے اور کنڈیارو کو جیکب آباد کے قریب سمجھتے ہوں گے ۔ ان کا خیرپور ناتھن شاہ ' خیرپور میرس میں واقع ہو گا ' وہ نصیر آباد کو نثار پور سے ملا دیں گے اور شہداد کوٹ کو شہداد پور سمجھتے ہوں گے وہ کہیں گے کہ تھانو بلا خان تو تھر میں ہے اور اسی طرح کئی اور باتوں میں بھی وہ جاہل ہوں گے وہ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع دیہات اور قصبوں کو کسی ہچکچاہٹ ' خدشے یا شرم کے بغیر دائیں کنارے پر "منتقل" کر دیں گے ۔ یوں ایسی جہالت اور بیہودگی کا مظاہرہ کریں گے کہ سوائے ان پر ہنسنے اور اظہار افسوس کے کچھ نہیں کیا جاسکتا ۔ میں آپ سب سے درخواست کروں گا کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد تو اس ملک کے ساتھ احتیاط کا مظاہرہ کیجئے اور اسے سمجھئے ۔ ہماری جہالت ' لاپرواہی اور

Marfat.com

سنگدلی کی بدولت یہ ملک روز بروز کمزور تر ' آسانی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ' اور سخت دباؤ میں ہے ۔ اردو میں لکھی جانے والی کتابوں اور اردو ' انگریزی اخبارات میں ہم پاکستان کے متعلق جو کچھ پڑھتے ہیں درحقیقت یہ ملک اس سے بہت مختلف ہے ۔ یہ کتابیں اور اخبارات تو حکمرانوں کے لئے لکھی اور جاری کئے جاتے ہیں جنہوں نے ملک کو اس حالت کو پہنچایا ہے ۔

" وقت آگیا ہے جب سندھ اور پاکستان کی سرزمین کسی نوع کی غیر ذمہ داری ' لا پرواہی اور بے ہودگی برداشت نہیں کرے گی ۔ ایسی جہالت تباہ کن ہو سکتی ہے ۔ میں ملک کے ہمدردوں ' صاحب بصیرت اور صاحب عقل و دانش اصحاب سے اپیل کروں گا کہ وہ ان حالات پر غور کریں جو ملک میں پیدا ہو چکے ہیں ' اور اپنی نسلوں کے مستقبل پر نظر ڈالیں جنہوں نے اس ملک میں جینا اور مرنا ہے اگر ادب اور زبان و معاشرہ کے مسائل کے بارے میں قومی رویہ اختیار نہ کیا گیا تو فطرت ہمیں مزید مہلت یا ڈھیل نہیں دے گی ۔ "اردو" کو اس ملک اور اس ملک کے عوام کی روح کا ترجمان ہونا چاہئے جو درحقیقت اس مٹی کے فرزند ہیں ۔ اردو کو آسمان کی "بلندیوں" سے نیچے زمین پر آجانا چاہئے اور وہ اسی طرح ترقی کر سکتی ہے ۔ فروغ پذیر ہو سکتی ہے ۔ اگر یہ سطحی رویہ اختیار کرے اور ہوا میں رہے گی تو ہم سب کو اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی ۔ حقائق اور پاکستان میں زندگی اور طرز زندگی کی حقیقتوں سے مزاحمت ضرر رساں بلکہ مہلک ثابت ہو گی ۔ میں نے اپنی زندگی کی نصف صدی نوجوانوں کی تعلیم ' تربیت ' رہنمائی ' خدمت اور بہبود میں صرف کی ہے ۔ خدا نے مجھے ' تجربہ ' ادبی جدوجہد ' ملک کے اندر اور باہر قیام کے ساتھ جو کچھ عطا فرمایا ہے اور میں نے زندگی سے جو کچھ سیکھا ہے اس کی بنیاد پر مجھے یقین ہے کہ وقت گزر رہا ہے ہر گھڑی کی سوئیاں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ہمیں حقائق کو اس زمین کے حقائق کو تسلیم کرنا ہو گا ورنہ ہم اس دن کو پچھتاتے رہیں گے اور قدرت تو حساب لیتی ہے ' اس کا احتساب ناگزیر ' سخت اور بے رحم ہوا کرتا ہے ۔

"ہم نے اردو کو بہر حال تسلیم کر لیا ہے ۔ اردو نے بڑی حد تک ہمارے معاشرہ کے پڑھے لکھے بلکہ ان پڑھ طبقہ کے فکر کو یقیناً متاثر کیا ہے لیکن ابھی اس کو افراد

Marfat.com

کے دلوں اور ذہنوں میں اپنا مقام پیدا کرنا ہے ۔ یہ مرتبہ حاصل کرنے کے لئے ابھی اردو " زبان " کو طویل سفر طے کرنا ہے اور یہ ثابت کرنے کے لئے خاصی جدوجہد کرنا ہے کہ وہ واقعی اس ملک کی قومی زبان ہے ۔ یہ بے حد ضروری بلکہ ناگزیر ہے کہ اردو کے حروف تہجی کو وسعت دی جائے ۔ اس کے تلفظ ' صوت الفاظ ' آواز کے زیر و بم ' ناک اور حلق سے نکلنے والی نیز غنہ اصوات میں بھی ملک کے اندر بولی جانے والی دوسری زبانوں کے تلفظ اور اصوات شامل کی جائیں ۔ ایسا نہ کیا گیا تو اردو کا کوئی مستقبل نہیں ۔ عوام کی زبان کا ہی مستقبل ہوتا ہے ۔ جو زبان ملا ' مٹھی بھر با اثر افراد ' چیدہ لوگ نوکر شاہی یا " امراء شاہی " بولتی ہو ' اس کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا چوک ' امین آباد ' چاندنی چوک ' میدان جنگ اور متروکات کی زبان کے طور پر پاکستان میں اردو کا مستقبل مخدوش ہے ۔ پاکستان کے عوام اور جمہوریت کو اردو کے زبردستی نفاذ سے ہمیشہ نقصان پہنچتا رہے گا ۔

" جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اردو برہمنوں ' رقص ' گیت اور تفریحات کی زبان بن چکی ہے ۔ یہ اقبال اور قائداعظم کی ہڈیوں پر پرورش پا رہی ہے ۔ نیم مذہبی اور بظاہر مذہبی کتابیں اس کے فروغ کا ذریعہ ہیں جو یکسانیت کے باعث اکتا دینے والی اور ناگوار ہوتی ہیں کیا مجھے ابن خلدون ' بلاذری ' تیرل بارکر اور بکل کا حوالہ دینا چاہئے اردو کو پاکستان کی زبان ہونا چاہئے ' بھارت کی نہیں ۔ بھارتی زبان کی حیثیت میں تو اس کا کوئی مستقبل ہی نہیں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صرف شہروں ' برہمنوں اور محدود گروپوں کی زبانیں ختم ہو جاتی ہیں ۔ کسی بھی زبان کو عوام کی روح اور جذبات کا آئینہ دار ہونا چاہئے ۔ شور ' لفاظی ' سطحیت ' غازہ ابٹن اور دھوکہ اور فریب پاکستان کے عوام کبھی قبول نہیں کریں گے ۔ میں متنبہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اردو کی اپنی کوئی ثقافت نہیں اور اردو کے ذریعے ہم ہندی ثقافت کی پاکستان میں ترویج کی اجازت نہیں دیں گے ۔ پاکستان کی اپنی تہذیب و ثقافت کے نقطہ نظر سے اردو کی ثقافت ' زنانہ ' زن صفت ' نمائشی ' طوائفانہ ' بد کرداری ' منافقت ' ظاہر داری اور ہیرا پھیری سے عبارت ہے ۔ اس میں جو ایک طرح کی نفاست ہے وہ تو محض ایک طرح کا "کیمو فلاج" اور دھوکہ کی ٹٹی ہے ۔ اردو ثقافت میں صاف دلی کھرا پن اور

Marfat.com

خلوص نہیں ہے ۔ یہ ایک طرح کی بے ایمانی اور مکرو ریا ہے جو اپنے سے مضبوط ' بالاتر اور زبردست ' زیادہ جارح اور ہندوستان کی مقامی ہندو ابادی اور اس کے ثقافت کے خوف سے پیدا ہوئی ہے ۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت ہندو کلچر اور ہندو روایات کے خوف یا ان کی خوشامد کی پیداوار ہے ۔ ہندوؤں کی ناقص اور مکارانہ اصطلاحات پاکستان کی تہذیب و ثقافت نہیں ہو سکتیں ۔ فاتح ولیم نارمنڈی سے فرانسیسی زبان لے کر آیا ۔ انگلستان پر اس کے دور حکمرانی میں فرانسیسی انگلستان کے امراء ' حکام اور دربار شاہی کی زبان بن گئی انگریزی عام اور نچلے طبقہ کے لوگوں کی زبان قرار پائی اور اسے ناشائستہ گنواروں اور عامیوں کی زبان سمجھ کر برداشت کیا جاتا رہا ۔ لیکن پچاس سال میں سب کچھ بدل گیا انگلستان میں فرانسیسی کو غیر ملکی زبان تصور کیا جانے لگا ۔ ہاں تعلیمی اداروں میں اسے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی گئی ۔ نپولین کے زوال تک فرانسیسی کو یورپ میں سفارتی زبان کا درجہ دیا جاتا رہا ۔ 19 ویں صدی کے دوسرے نصف 193 کے دوران یورپ میں فرانس کی بالادستی ختم ہو گئی اور جلد ہی فرانسیسی زبان صرف فرانس تک محدود ہو کر رہ گئی ۔

"موجودہ اردو میں بطور زبان وہ تمام خامیاں اور کمزوریاں موجود ہیں کہ وہ ہمیشہ پاکستان کی قومی زبان نہیں رہ سکتی ۔ یہ پنجابی فوج ' پنجابی بیورو کریسی اور پنجاب میں نشرو اشاعت کی تجارت ہے جو اردو کی امداد کر رہی ہے ۔ اور اس کی زندگی کو مصنوعی طور پر طویل کرنے کی ذمہ دار ہے یہ پنجاب کے عوام کو دبانے ' بے آبرو کرنے اور زیردست رکھنے کی زبان ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انگریزی ایک جمہوری ' معقول ' حقیقت پسندانہ اور بنیادی طور پر نثری تحریر کے لئے موزوں زبان ہے ۔ اردو درباری ' نسوانی ' عاشقانہ ' زرق برق اور مبالغہ آمیز ہے ۔ اس کو موثر بنانے کے لئے عربی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال ضروری ہوتا ہے جو اس کے مستقبل اور مقبول عام کے مواقع کم کرتا ہے اور پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے اس کے مستقبل کو مخدوش بناتا ہے ۔"

حکومت وقتاً فوقتاً جو اعداد و شمار جاری کرتی ہے ' ان پر کم ہی اعتماد کیا جاتا ہے اور اسے قبول کرنے میں لوگ متامل ہوتے ہیں تاہم حکومت کے جاری کردہ زبان کے

Marfat.com

متعلق تازہ ترین اعداد و شمار پیش کرتا ہوں جو روزنامہ " جنگ " کراچی کے 13 اگست 1989ء کے شمارہ میں شائع ہوئے ہیں ۔ اس سروے کے مطابق صرف 6ء7 فیصد لوگ اردو بولتے ہیں (ان میں گجراتی اور کاٹھیاواڑی بھی شامل ہو سکتے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں) 7ء11 فیصد لوگ سندھی 17ء48 فیصد پنجابی 10ء3 فیصد بلوچی 2ء1 فیصد بروہی 14ء13 فیصد پشتو ' 43ء2 فیصد ہندکو 83ء9 فیصد سرائیکی اور 81ء2 فیصد لوگ دوسری زبانیں بطور مادری زبان بولتے ہیں ۔ میں اس سلسلے میں سندھ اور پنجاب کے چند ماہرین تعلیم کی آراء بھی پیش کرتا ہوں ۔

ڈاکٹر اکرام اعظم اپنی کتاب " پاکستان جیو پولٹکس " GEOPOLITICS PAKISTAN میں جو "فیوچر سٹکس فاؤنڈیشن اینڈ انسٹی ٹیوٹ " اور " حدیبیہ پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ اسلام آباد" نے 1989ء میں شائع کی ہے ' لکھتے ہیں ۔

"..... اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان ایک وفاقی .... یقیناً وحدانی نہیں --- مملکت ہے ۔ مختصر یہ کہ یہاں کثیر الجہت اور گوناگوں متنوع معاشرہ قائم ہے جو متعدد علاقوں اور زبانوں سے عبارت ہے --- اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کو مساوی مرتبہ اور اہمیت دی جائے ۔ بلاشبہ اردو ہماری آزادانہ طور پر منتخب ' قومی زبان ہے لیکن اسے ایک ایسی زبان کی خوبیاں اور خامیاں حاصل نہیں جو یہاں کی دوسری علاقائی یا مقامی زبانوں کو معاشرتی اور ثقافتی طور ' فطری انداز میں حاصل ہیں ' اردو کو مسلط کرنا دوسری بڑی زبانوں کو مخالف بنانے اور ملک کی اس اکثریت کی مخالفت مول لینے کے مترادف ہو گا جو ان زبانوں کی نمائندہ ہے ۔ اس سے یہ روز افزوں احساس بھی پیدا ہوا ہے کہ اب تک جو لوگ اردو کے نام پر حکومت کرتے چلے آرہے ہیں ۔ وہ اردو کے نام پر ہی مستقبل میں بھی مسلط رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں ۔ مثال کے طور پر ایک نہایت ہی معمولی سی مہاجر اقلیت جنہوں نے ابھی تک اس دھرتی کے فرزندوں ان کی روایات ثقافت زبان ' طرز زندگی اور اقدار کو مساوی بنیادوں پر تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ خود کو ان سے برتر تصور کرتے ہیں یا مشرقی پاکستان میں زبان اور معاشرتی و تہذیبی اور ثقافتی مسائل کیوں پیدا ہوئے ۔ سندھ اور دوسرے مقامات پر پنجاب کے سوا ایسے ہی مسائل نے کیوں

Marfat.com

سر اٹھایا ؟ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے ' پوری دنیا میں انگریزی سیکھی اور پڑھی جا رہی ہے لیکن ہم اسے ترک کرنے پر تلے ہوئے ہیں ۔۔۔ شاید یہ سب کچھ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت ہو رہا ہے ۔۔۔۔ اور مغربی رنگ میں رنگے ہوئے حکمرانوں اور بے چارے مقامی محکوموں کے درمیان سامراجی فاصلہ برقرار رکھنے کے درپے ہیں ۔ مقامی افراد کا احساس ہے کہ ان کو گویا فتح کر لیا گیا ہے ۔ ان کا حق ختم کر دیا گیا ہے تاکہ مہاجروں کو آباد کیا جا سکے جن میں حال ہی میں شامل ہونے والے افغان بھی ہیں جن کا کوئی اور چھور نہیں وہ دھرتی کے فرزند یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معمولی سی مہاجر اقلیت جو ابھی ان کے ساتھ گھل مل کر بھی نہیں رہ رہی 1947ء سے اب تک ان پر حکمران ہے ۔ زندگی کے ہر شعبہ میں۔۔۔۔ یہ سیاست ہو یا معاشی شعبہ ' سول سروس ہو یا فوجی ' وہی ہر جگہ با اختیار ہیں ۔ یہ بات درست ہو یا نا درست ' لیکن اجنبیت کا ایک احساس تباہ کن انداز میں جڑ پکڑ رہا ہے اور قومی یکجہتی کے کاز کو شدید نقصان پہنچا رہا ہے ۔ یہ اب حکمرانوں کا کام ہے کہ وہ اس صورت حال کا احساس کریں ' آنکھیں کھولیں اور دور اندیشی سے اس صورت حال کے تدارک کے لئے کچھ کریں "۔

میں نے اسی باب میں کسی جگہ سندھی زبان کے بارے میں پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ کی رائے دی ہے ۔ یہ مناسب ہو گا کہ پنجابی دانشوروں اور سکالروں کی ایک نمائندہ تنظیم کی رائے بھی بیان کر دی جائے ۔ جنہوں نے پنجابی زبان اور ادب کی حمایت کرتے ہوئے اسے صوبہ پنجاب کی زبان قرار دینے کے لئے موزوں قرار دیا ہے ۔ اس تنظیم کی یہ رائے روزنامہ " ڈان " کراچی کے 6 دسمبر 1985ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے ۔ اس خبر کا عنوان تھا ۔

" پنجابی زبان کے فروغ کا مطالبہ "

"لاہور 5 دسمبر:۔ استاد دامن میموریل کونسل کے زیر اہتمام مرحوم شاعر کی پہلی برسی کے موقع پر ایک تقریب میں مقررین نے پنجابی کو بطور زبان ذلیل کرنے کی سوچی سمجھی کوشش پر مذمت اور بیزاری کا اظہار کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ پنجابی کے فروغ اور ترقی کے لئے جو ملک کی آبادی کی اکثریت کی مادری زبان ہے ' مثبت

Marfat.com

اقدامات کئے جائیں۔"

" تقریب میں جس کی صدارت ممتاز مصنف سجاد حیدر نے کی استاد دامن کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا گیا اور انہیں ملک کے اردو کے بیشتر شعراء سے بڑا شاعر قرار دیا گیا مقررین نے کہا کہ استاد دامن کو پنجابی کی شناخت کے طور پر یاد رکھا جائے گا جنہوں نے پنجابی زبان اور ان کے ثقافتی ورثہ پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ استاد نے اپنی شاعری کے ذریعے محروم اور پسماندہ طبقوں کی جو خدمت کی ہے اس پر بھی استاد دامن کی تعریف و توصیف کی گئی۔

" تقریب میں جن دانشوروں نے خطاب کیا۔ ان میں سائیں حیات پسروری ' پروفیسر غلام رسول آزاد ' حسین شاد ' شفقت تنویر مرزا ' کشور ناہید ' طلعت محمود ' فرزند علی ' سیف اللہ سیف قمر انجم انقلابی اور سائیں اختر شامل تھے۔ جبکہ اشرف شہاب پوری ' محمد گلزار اور پرویز ہاشمی نے مرحوم استاد دامن کا کلام سنایا۔

" اپنی تقریر میں مسعود کھدر پوش (اب مرحوم) نے دانشوروں کی سماجی ناقدری پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ استاد دامن پنجابی کے واحد شاعر نہیں جنہوں نے عسرت میں زندگی گزاری اور اسی حال میں موت کو لبیک کہا بلکہ پنجابی کے بیشتر بڑے بڑے قلم کاروں کا یہی حشر ہوا۔

"انہوں نے کہا کہ برطانوی سامراجیوں نے پنجاب پر اردو کو صرف اس لئے مسلط کیا کہ اس عظیم تر صوبہ کی زبان اور ثقافت کو دبا دیا جائے کیونکہ یہی وہ صوبہ ہے جس نے آخر دم تک سامراجیوں کے تسلط کے خلاف مزاحمت کی۔ انہوں نے انسائیکلو پیڈیا برٹینکا (جلد 11 صفحہ 47) کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا ہے کہ " یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ پنجاب کو فتح کرنے کے بعد برطانوی حکومت نے نہ صرف سینکڑوں کی تعداد میں اتر پردیش (یو۔پی) سے تعلق رکھنے والے اہل کار پنجاب میں متعین کر دیئے بلکہ ان کی زبان اردو بھی صوبہ پر مسلط کر دی گئی۔ پنجاب کے مسلم شرفاء نے حکومت سے فارسی زبان برقرار رکھنے کی درخواست کی اور اردو کو مسترد کر دیا ---- پاکستان میں اردو ' دراصل ' برطانوی ورثہ ہے "۔

" مسعود کھدر پوش نے مزید کہا کہ اردو مسلط کئے جانے کے بعد ہر پنجابی مجبور ہو

Marfat.com

گیا ہے کہ وہ سرکاری ملازمت اور سرپرستی کے لئے اردو سیکھے ۔ اسی طرح پنجابی زبان کو نصاب تعلیم سے خارج کر دیا گیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے چارے پنجابی اپنی ثقافت اور ثقافتی ورثہ سے ہی محروم ہو گئے ۔ مسعود کھدر پوش کے مطابق پاکستان کا مستقبل محفوظ تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پنجابی جو ملک کی کل آبادی کا 65 فیصد ہیں اپنی شناخت اور عزت نفس سے محروم کر دیئے گئے ہیں "۔

جن لوگوں کی مادری زبان " اردو " ہے انہوں نے ماضی میں ملک کی کسی بڑی زبان ---- پنجابی ' پشتو ' سندھی یا بلوچی --- کا اتنا علم حاصل کرنے کی جان بوجھ کر کوشش نہیں کی وہ یہ زبانیں بول ہی سکتے غالبا ان کو توقع تھی کہ وہ اردو کے حق میں پریس کے مسلسل پراپیگنڈے اور حکومتی مشینری کی قوت کے گذشتہ چالیس سال کے استعمال سے دوسری زبانوں کو محض " بولی " تک محدود کر دیں گے اور اردو کو قانون سازی کے ذریعے ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی ' عوام پر مسلط کر دیں گے وہ مشرقی پاکستان سے ملنے والا سبق بھی بھول گئے جہاں 1948ء سے ہی جب اردو کو قومی زبان بنانے کا اعلان کیا گیا تھا بنگالیوں نے تحریک مزاحمت شروع کر دی تھی جو بالآخر مشرقی صوبہ کی علیحدگی پر منتج ہوئی ۔

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ پروفیسر کرار حسین نے جو ایک ماہر تعلیم ' انگریزی ' اردو اور فارسی کے نامور سکالر اور اپنی دیانت کے لئے معروف ہیں ' آواز بلند کی اور اردو کو ایسے لوگوں پر زبردستی مسلط کرنے کی صورت میں سنگین خطرات کی نشاندہی کی جو خود اپنی صدیوں پرانی زبانوں ' ثقافت اور ادبی روایات کے امین ہیں ۔

مجھے پروفیسر کرار حسین کی یہ تقریر پڑھنے کا موقع نہیں ملا جو ایک کتاب " پاکستانی مشاعرہ اور ادب " میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب "پاکستان سٹڈی سنٹر کراچی یونیورسٹی" نے شائع کی ہے ۔ تاہم میں نے اس کتاب پر " زینو " کا تبصرہ پڑھا ہے جو " پاکستانی کلچر اور اس کا بحران " کے عنوان سے 4 ستمبر 1987ء کو روزنامہ " ڈان " کے صفحہ 4 پر شائع ہوا ہے ۔

اس موقع پر جن لوگوں نے خطاب کیا اور بعد ازاں جن کی تقریریں کتابی صورت میں شائع ہوئیں ' ان کے ناموں کی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ یک

Marfat.com

طرفہ تھا کیونکہ اس کے تمام مقرر اردو بولنے والے ہی تھے لیکن سیمینار کا عنوان " پاکستان مشاعرہ اور ادب " رکھا گیا ۔ گویا ملک میں بولی جانے والی دیگر چار زبانوں کا کوئی ادب ہی نہیں ۔ مضمون سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ آیا سیمنار میں کوئی پشتو ' بلوچی ' پنجابی یا سندھی ادیب اور سکالر بھی مدعو کیا گیا تھا یا نہیں کہ وہ بھی اپنی زبان اور ادب کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کر سکے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ان زبانوں کے ادیبوں اور سکالروں کا بھی کوئی قحط نہیں ۔ بہرحال میں پروفیسر کرار حسین کی تقریر کے بارے میں " زینو " کا تبصرہ پیش کرتا ہوں جو " اردو سامراج " کے عنوان سے شائع ہوا ۔

" پروفیسر کرار حسین نے سیمینار کے اختتامی اجلاس سے اپنے خطاب میں جو کچھ کہا ہے وہ زبردست اہمیت کا حامل ہے خصوصاً اس لئے کہ ان کا خطاب اور بین اللسانی حقوق کے بارے میں ان کا رویہ گزشتہ چالیس سال کے دوران فروغ پانے والی سیاسی صورت حال کے زیادہ قریب ہے ۔ وہ پاکستان میں رابطہ کی زبان کے طور پر اردو کے کردار سے بخوبی آگاہ ہیں جبکہ وہ اردو کے " سیاسی استعمال " سے پیدا ہونے والے تصادم سے بھی آگاہ ہیں انہوں نے ان تمام تضادات اور تصادم کو ایک ہی نام ---- " اردو سامراج ---- سے پکارا ہے ۔ یہ احساس اردو کی حمایت میں انتہا پسندی اور دوسری زبانوں کو دیس نکالا دینے کی حد تک آگے بڑھنے کے عمل سے پیدا ہوا ہے۔

"پروفیسر کرار حسین نے اردو اور مقامی عوامی زبانوں کے درمیان تصادم کے مسئلہ کا حقیقت پسندانہ حل پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "یونیورسیٹیوں میں اردو کو واحد ذریعہ تعلیم قرار دینے سے تاکہ صرف اردو ہی پڑھائی جاسکے ' یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا نہ ہی یہ مسئلہ اردو کو واحد دفتری زبان قرار دینے سے حل ہو سکتا ہے ۔ حکومت کی طرف سے فرمان کے ذریعے کسی امر کے نفاذ کا احساس ہی اسے ناقابل قبول بنا دیتا ہے یہ سیاسی اسباب اور سیاسی محرومی کا ہی کرشمہ ہے کہ ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس میں بعض افراد---- معاشرہ کے ممتاز افراد---- اردو کا استعمال بھول گئے ہیں۔ حالانکہ قبل ازیں وہ اردو بولتے اور خوب سمجھتے تھے۔"

"پروفیسر کرار حسین نے اپنی مختصر تقریر میں اس مسئلہ کے بارے میں بعض

Marfat.com

تجاویز پیش کی ہیں ان کے اسباب اور حل کا تذکرہ کیا ہے ۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس قسم کے مواقع ۔۔۔ جیسا کہ یہ سیمنار تھا ۔۔۔ ایسے مسائل پر ٹھوس مباحث کے لئے استعمال کئے جانے چاہئیں ۔ ہم نہیں جانتے کہ اس موقع پر آزادانہ اور بے تکلفانہ بحث کی اجازت دی گئی تھی یا نہیں ۔ عموماً نیک ارادوں کو عمل کا جامہ کم ہی پہنایا جاتا ہے جو نہایت قابل افسوس ہے کیونکہ اس طرح مواقع کا عدم استعمال ..... صحیح استعمال ۔۔۔۔ ایک عادت بن جاتا ہے "۔

اسی مضمون میں " زینو " کا یہ اظہار خیال کہ " یہ مسئلہ جتنا شدید سندھ میں ہے ملک کے دیگر حصوں میں نہیں ہے ۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کا اس زبان سے تصادم ضرور ہے جو ایک عظیم ورثہ کی امین ہونے کی دعویدار ہے۔" میرے خیال میں " زینو" کا یہ خیال زیادہ درست نہیں کیونکہ انہوں نے سندھی بلوچی اور پشتو ادیبوں اور سکالروں کی زبردست ادبی کاوشوں کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ خود پنجابی ادیب اور سکالر بھی گذشتہ سات آٹھ سال سے پنجابی زبان کو اس کا حقیقی مقام دلانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ۔ میرا نقطہ نظر مزید واضح ہو سکتا ہے اگر کوئی غیر جانبدار مبصر کوئٹہ سے لاہور تک بلوچستان کے کسی بھی قصبہ میں جائے وہ شہر کی تمام دیواروں ' سرکاری دفاتر کی دیواروں پر ' بلکہ درہ بولان کے دونوں طرف چٹانوں پر بھی ' بلوچی اور پشتو زبانوں کے حق میں چیختے ہوئے نعرے لکھے ہوئے پائے گا ۔ جن کے ذریعے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ان دونوں زبانوں کو اس علاقہ میں بطور مادری زبان ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں انگریزی کو سرکاری زبان رکھا جانا چاہئے ۔ انگریزی کے بغیر تو گویا ہم ان پڑھوں کی ایک قوم بن جائیں گے مگر سکولوں اور کالجوں میں اردو کو دوسری صوبائی زبانوں ' سندھی ' بلوچی ' پشتو اور پنجابی کے ساتھ مساوی درجہ دیا جانا چاہئے ۔

Marfat.com

باب ہفتم

حرف آخر

کسی بھی ملک کی قوت یا کمزوری کا اندازہ اس کی خارجہ پالیسی سے لگایا جاتا ہے۔ خارجہ پالیسی ملک کی اندرونی معاشی قوت ' سیاسی اور سماجی یک جہتی اور مملکت کے اہم ترین اداروں متفقہ ' عدلیہ اور انتظامیہ کی عمدہ کارکردگی میں منعکس ہوتی ہے۔

ہمارا ملک پاکستان جو آج کل سیاسی' سماجی' مذہبی اور نسلی گروہ بندی' تفرقہ اور اختلافات میں مبتلا ہے اور سب سے بڑھ کر زبردست معاشی بدعنوانی اور بد انتظامی کا دور دورہ ہے ایسی صورت میں ہم موثر' غیر جانبدار اور آزاد خارجہ پالیسی اختیار کرنے کا دعویٰ ہی نہیں کر سکتے۔ بانی پاکستان محمد علی جناح کو موت نے مہلت نہ دی' وہ قیام پاکستان کے ایک سال بعد ہی چل بسے۔ انہیں ملک کو قابل عمل آئین دینے یا ایک پائیدار اور عمدہ خارجہ پالیسی استوار کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

ان کی وفات کے جلد ہی بعد اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کو ہندوستان سے آئے ہوئے بمبئی اور کلکتہ کے مہاجر گجراتی تاجروں ' بے لچک بیورو کریٹوں ' ٹیکنو کریٹوں اور برطانوی سامراج کے تربیت یافتہ سول سروس کے افسروں نے گھیرے میں لے لیا۔ اپنے ذہنی تحفظات اور تربیت کے باعث سرخ فیتہ کے دلدادہ' سطحی سوچ رکھنے والے یہ بیورو کریٹ امریکہ اور سوویت روس کے ساتھ تعلقات کے تناظر میں کوئی متوازن خارجہ پالیسی تیار کرنے یا اس پر عمل کرنے کے قابل ہی نہ تھے ۔ انہوں نے وزیر اعظم کو مجبور کیا کہ وہ پاکستان کے ہمسایہ ملک روس کی طرف سے دورہ کی پہلی پیش کش مسترد کر دیں ۔ دراصل ان سطحی سوچ رکھنے والوں کی نظروں میں امریکی ڈالر سمائے ہوئے تھے۔ پھر فوجی جرنیلوں کی طرف سے بھی حوصلہ افزائی کے بعد لیاقت علی خاں نے روس سے بعد میں ملنے والی دورہ امریکہ کی دعوت قبول کرلی۔ بلا شبہ وہ چند کروڑ ڈالر کی امداد جو دراصل قرضہ تھی' لے کر واپس آئے۔ ان کے بیگ میں مستقبل کے لئے کچھ وعدے بھی امریکہ نے ڈال دیئے تھے لیکن ہر کوئی جانتا ہے کہ لیاقت علی خان کے اس اقدام سے روس کے دل میں گرہ بیٹھ گئی جو آج تک نہیں نکل سکی۔ اور 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کو

Marfat.com

اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

امریکہ کی طرف پاکستان کے اس جھکاؤ کے باعث' جس میں بعدازاں مغربی یورپ کے ملک بھی شامل ہو گئے' پاکستان دنیا کا قرضے حاصل کرنے والا ایک بڑا ملک بن گیا جن کا بھاری سود ادا کیا جاتا ہے۔ اس سے پاکستان کا ان ملکوں پر انحصار بڑھتا گیا۔ دفاع کے لیے اہم اورجدید اسلحہ' فوجی اور فنی تربیت' عام استعمال کی اشیا اور صنعتی مشینری بھی انہی ملکوں سے مہنگے داموں درآمد کی جانے لگی جو چند بنیادی اشیا مثلاً ٹیکسٹائل وغیرہ ہی بنا سکتی تھی۔ ان قرضوں کے عوض پاکستان کی عمدہ کپاس' پٹ سن اور بعد میں زرعی اجناس خام صورت میں برآمد کی جانے لگیں۔ تاکہ ہم قرضوں کاسود ادا کرسکیں جسے ہم نے خود کو دھوکہ دینے کیلئے "قرضہ کاحق خدمت" جیسا "بے ضرر" نام دے رکھا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب پاکستان پندرہ ارب ڈالر سے زائد کا مقروض ہے۔ تاہم امریکہ نے اپنے سیاسی اورمعاشی مفادات کے لئے پاکستان کو جس فیاضی سے امداد دی اور جس سے ملک کے ابتدائی دور میں کافی مدد ملی' اس پر اظہار تحسین نہ کرنا زیادتی ہو گی۔ امریکہ ایک عظیم ملک ہے' اس کے عوام بلا شبہ بڑے دریا دل ہیں لیکن اس کی سفارتی حکمت عملی ایسی ہے کہ جب کبھی اور جہاں بھی امریکہ نے اپنی اس حکمت عملی کا استعمال کیا وہاں کے عوام کے حلق میں تلخی اور کڑواہٹ گھل گئی۔ امریکہ کی طرح سوشلسٹ روس دوسرا عظیم ملک ہے اور اس کے عوام بڑے انقلابی ہیں جنہوں نے اپنے ملک کا' جو کبھی ایک پسماندہ ملک گنا جاتا تھا' حلیہ تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اورصرف نصف صدی کی قلیل مدت میں روسی عوام نے اپنے ملک کو سپرپاور بنا دیا ہے۔ ہم ان دونوں عظیم طاقتوں کے ساتھ' کسی ایک کے مفادات کوقربان کئے بغیر' مساوی طور پر دوستی رکھ سکتے تھے۔ ہمیں اب بھی یہ سبق سیکھنا ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ اگر ہم نے زراعت پر توجہ دی ہوتی تو آج ہم غذائی شعبہ میں بھارت کی طرح خود کفیل ہو چکے ہوتے۔

لیکن ہوا کیا؟ صنعتی ترقی کے نام پر اجتماعی ضروریات کو مدنظر رکھے بغیر چند کارخانے کراچی اور پنجاب کے بعض شہروں میں ادھر ادھر قائم کئے گئے اور ملک کے وسیع اندرونی علاقوں کو یک قلم نظرانداز کر دیا گیا۔ یوں ملک کو قرضوں کے چنگل میں

Marfat.com

پھنسا دیا گیا۔ قرضے دینے والے ادارے عالمی بنک انٹرنیشنل مانٹری فنڈ وغیرہ پاکستان کی گردن پر سوار ہو گئے۔ ان اداروں نے قرضوں کی غیر ادائیگی کا اوچھا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے آہستہ آہستہ' غیر محسوس انداز میں ہماری اقتصادی اور مالیاتی پالیسیوں پر پورا کنٹرول حاصل کر لیا۔ ہمارے ملک کا قیمتوں کا ڈھانچہ درآمدی اور برآمدی اہداف ان کے تابع ہو گئے اور وہ یہاں تک ہمارے معاملات میں دخیل ہوگئے کہ ہمیں یہ بھی بتلانے لگے کہ ہمیں اپنی زمینوں میں کونسی فصل بونی چاہئے اور کونسی نہیں۔ قدرتی طور پر اس سے ہماری خارجہ پالیسی اور سیاسی صورت حال پر بھی اثر پڑتا رہا جو بڑی حد تک مغربی ملکوں کے پاس گویا رہن رکھ دی گئی۔ اس طرح روس اور دوسرے مشرقی ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات پر بہت برا اثر پڑا۔

محنت و مشقت کے بغیر قرضوں میں ملنے والے ڈالر کی بہتات سے مسلم لیگ کی دوسرے درجہ کی نااہل قیادت کی تو چاندی ہو گئی۔ اس وقت ملک کی حکومت پر انہی کا کنٹرول تھا۔ ان کے ساتھ بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے اردو بولنے والے مہاجر یا بڑے بڑے تاجر اور سندھ و پنجاب کے جاگیردار' بیوروکریسی' جرنیل' نام نہاد مذہبی تنظیمیں جن کی اکثریت درآمدی تھی' بھی تھے۔ اس چھوٹے سے گروپ کے دل میں یہ خیال سما گیا کہ قدرت نے انہیں حکمرانی کے لئے پیدا کیا ہے۔ ملک کے تمام وسائل پر صرف ان کا حق ہے' حکومت کی تمام بڑی بڑی' مرکزی اور صوبائی' ملازمتیں صرف ان کے یا ان کے عزیز و اقارب کے لئے ہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے ہندوؤں کی تمام جائیداد پر بھی ہاتھ صاف کیا جو وہ ہندوستان جاتے ہوئے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ حکومت پر قابض ٹولے نے مشرقی بنگال کے عوام' بلوچستان کے بلوچوں' سندھ کے سندھیوں اور سرحد کے پٹھانوں کو کسی چیز کے قریب تک نہ پھٹکنے دیا۔ لیکن ان کو پرچانے کے لیئے بعض غیر ضروری وزارتیں غیر اہم ملازمتیں یا گورنروں کے عہدے اور چند ایک کو لائسنس اور پرمٹ دیدیئے۔ المیہ یہ ہے کہ بلوچستان تو ان غیر ضروری ملازمتوں یا مراعات سے بھی محروم رہا۔ کوئی بلوچ وزیر بنا نہ گورنر' صوبہ کا اپنا ہائی کورٹ بھی نہ تھا' نہ ہی وہاں کوئی یونیورسٹی تھی' صوبہ میں انتخابات بھی نہ کرائے گئے' چنانچہ بلوچوں کی صوبائی حکومت ہی نہ تھی اور 1971ء

Marfat.com

تک بلوچستان پر "مرکز" کی حکومت قائم رہی جو ایک "ایجنٹ" کے ذریعے چلائی جاتی تھی۔ ان سے محروم صوبوں کے عوام کو پرچانے اور الجھائے رکھنے کے لئے چند غدار مفاد پرستوں کے اس مختصر سے گروہ نے ' حکومت اور بعض حالات میں غیر ملکی اداروں کی مدد سے اخبارات جو تقریباً سبھی بھارت سے ہجرت کر کے آنے والوں یا پنجاب کے لوگوں کی ملکیت تھے' منبر اور مختلف پلیٹ فارموں سے پراپیگنڈے کی ایک مربوط' مسلسل اور زبردست مہم شروع کی جس کے دوران اسلامی اخوت' اسلام کے شاندار ماضی اور دیانتداری پر زور دیا جاتا یا پھر "جہاد کشمیر" بھارت سے خطرے اور خدا جانے کس کس خطرے سے انہیں ڈرایا جاتا۔ اس طرح خالی خولی نعروں اور پروپیگنڈا پر لوگوں کی توجہ جمائے رکھی اس شور و غل اور غل غپاڑہ کی آڑ میں شہری سیاستدانوں اور بیورو کریسی نے ملک بھر میں بچی کھچی مراعات' حقوق اور مستقبل کے امکانات پر بھی بڑی بدمعاشی اور ریا کاری سے قبضہ جما لیا۔ اس طرح عوام کی اکثریت کو نہ صرف مادی وسائل اور ذرائع سے محروم کر دیا گیا بلکہ غریب عوام کو اخلاقی ورثہ سے بھی محروم کر دیا جو ان کی سب سے بڑی اور ایک ہی خوبی تھی کچھ وقت کے بعد جب اس سب کچھ کو ناکافی سمجھا گیا اور لوگوں کی توجہ قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ سے مزید ہٹانے کے لئے ایک نیا نعرہ گھڑا گیا کہ "پاکستان دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔" مگر اس کا بھی کوئی فائدہ ملک اور قوم کو نہ ہوا بلکہ ہمارے دوست مسلم ملک مصر اور انڈونیشیا اس نعرہ سے ناراض ضرور ہوئے۔ جب مشرقی پاکستان "آزاد" ہو گیا تو یہ نعرہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

چنانچہ پریس اور بیورو کریسی کے زرخیز دماغوں نے ایک اور نعرہ ایجاد کیا "پاکستان اسلام کا قلعہ ہے" یہ نعرہ ہر پلیٹ فارم سے بلند کیا گیا۔ یہ بھی ایک جذباتی اور کھوکھلا دعویٰ تھا۔ اگر پاکستان اسلام کا قلعہ ہوتا تو ملک کے مختلف طبقے ملک کے اندر ایک دوسرے سے "برسرپیکار" گروہوں میں اخوت اور یک جہتی پیدا کرتا ' اپنے قریبی ہمسایہ افغانستان میں امن قائم کراتا اور عراق اور ایران کے درمیان جنگ بند کراتا جہاں مسلمان کا دوسرے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل عام ہو رہا تھا۔

یہ ایک المیہ ہے کہ ایران عراق جنگ کے دور میں پاکستان کے مسٹر شریف الدین

Marfat.com

پیرزادہ اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے سیکرٹری جنرل تھے۔ مگر مسلمانوں کے درمیان قیام امن کے لئے کچھ بھی نہ کیا جا سکا۔ اس کے بجائے ایک دوسرے سے جنگ و جدل میں مشغول مسلمان ممالک دو بلاکوں یعنی روس اور امریکہ۔۔۔ میں بٹ گئے۔ یہ دونوں امریکہ اور روس اپنے اپنے حامی ملکوں یا گروہوں کو بھاری تعداد میں اسلحہ فراہم کرتے رہے۔ اور اس کے بدلے تیل یا مسلمان ملکوں کے دوسرے وسائل سے مستفید ہوتے رہے۔ یورپی ملکوں نے اس انسانی قتل عام کو روکنے کے لئے کچھ نہ کیا۔ بھلا وہ کیوں ایسا کرتے؟ ان کی اسلحہ ساز فیکٹریاں دن رات چل رہی تھیں اور ان کے شہریوں کو مکمل روزگار فراہم کر رہی تھیں اور یہ سب کچھ مسلمان ممالک کی قیمت پر کیا جا رہا تھا۔ خلیج فارس پاکستان کا سمندر تصور کیا جاتا ہے لیکن جب ایران عراق جنگ کے وقت امریکہ' روس اور دوسرے مغربی ملکوں کے جنگی بیڑے اس علاقہ میں اودھم مچاتے پھرتے تھے پاکستان کی حکومت وقت احتجاج کا ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکال سکی۔ بیرونی ممالک صرف یہ دیکھنے کے لئے آتے ہیں کہ کس علاقہ میں کس قدر ہلاکت خیز اسلحہ کی ضرورت ہے ممکن ہے کہ پاکستان کو بھی بتدریج اس جنگی اکھاڑے میں مجبوراً کودنا پڑے مگر صورت حال کو درست کرنے کے لئے وہ کچھ نہیں کر سکا۔ اس خوف سے کہ ایسا کرنے سے اس کے سرپرست ملک امریکہ وغیرہ ناراض نہ ہو جائیں اور اس طرح امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک سے ڈالر ملنا بند نہ ہو جائیں۔ چنانچہ "اسلام کا قلعہ" کا نعرہ بھی بے سود ثابت ہوا۔ مگر سازشی دماغ بہت زرخیر ہوتے ہیں۔ اور اب انہوں نے "اسلام کا قلعہ" کے نعرہ کی جگہ' کچھ عرصہ قبل' ایک اور نعرہ ایجاد کیا کہ "پاکستان امن کا جزیرہ ہے" جب تمام سرحدوں پر جنگ کی آگ بھڑک رہی ہو تو منطقی اعتبار سے ایسا نعرہ ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ محض خواہشات پر مبنی سوچ ہے کیونکہ جب ملک چاروں طرف سے جنگوں کے گھیرے میں ہو تو وہ کس طرح متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے اور کیسے "امن کا جزیرہ" کہلا سکتا ہے؟ یہ نعرہ پہلے نعروں سے بھی جھوٹا ثابت ہوا کیونکہ آج (1986-87) کراچی سے پشاور تک کوئی شہر بموں کے دھماکوں سے محفوظ نہیں جو عام کھلے مقامات کے علاوہ سرکاری اور نیم سرکاری عمارتوں اور دفاتر میں بھی ہو رہے ہیں۔ صدر بازار کراچی میں ایک

Marfat.com

دھماکہ کے دوران 70 سے زائد بے گناہ افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ملک کے نام نہاد دشمنوں کی کارروائی ہے بلکہ اس وقت کے صدر ضیاء الحق کا تو یہ ارشاد تھا کہ دھماکے بھارتی ایجنٹ کر رہے ہیں جبکہ وزیراعظم محمد خان جونیجو کا خیال تھا کہ یہ افغانوں کی کارستانی ہے مگر مخالف سیاستدانوں کا کہنا تھا کہ دھماکے خود حکومت کرا رہی ہے۔ دھماکے کون کراتا تھا' کسی کو علم نہیں لیکن دھماکوں کے الزام میں نہ تو کسی شخص کو پکڑا گیا اور نہ کسی پر عام عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ نہ کسی کو سزا دی گئی اس سے صرف ایک حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی۔۔۔ خصوصاً افغان پالیسی۔۔۔ نہایت ناقص ہے۔

اس کے علاوہ سندھ کی سڑکیں اور ٹرینوں کے ذریعے سفر بھی محفوظ نہیں۔ کوئی گاؤں ڈاکوؤں کے منظم گروہوں سے بچا ہوا نہیں۔ خواتین اور بچوں سمیت پورے گاؤں کی آبادی کا قتل جیسے کئی واقعات رونما ہو رہے ہیں ۔ لوگوں کو اغواء کیا جاتا ہے اور کھلم کھلا تاوان لے کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مقامی اخبارات 1983ء کے بعد سے ایسے واقعات سے تقریباً روزانہ بھرے ہوتے ہیں۔ کراچی کا شہر تک محفوظ نہیں جہاں روزانہ مسلح ڈکیتیوں اور لوٹ مار کی خبریں آتی رہتی ہیں جن میں تشدد اور قتل بھی ہوتے ہیں ۔

کراچی میں' سندھ میں ڈکیتی کی وارداتیں کرنے والے ان ڈاکوؤں میں سے بعض تو خاصے تعلیم یافتہ نوجوان بتائے جاتے ہیں۔ وہ تباہ کن اسلحہ مثلاً کلاشنکوف جدید ترین رائفلیں' دستی بم اور بزوکا گن تک استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان کو بتدریج بارود خانے میں تبدیل کر دیا گیا ہے امریکی' روسی اور افغان اسلحہ کھلے عام بازار میں بکتا ہے۔ یہ سب کچھ افغانستان کی جنگ اور پاکستان کی حکومت کی بے جا فیاضی اور کوتاہی اندیش پالیسی کی وجہ سے ہو رہا ہے جس کے تحت ہم نے 30 لاکھ سے زائد افغان مہاجرین کو اپنے ہاں پناہ دے دی ہے۔ کراچی' لاہور' اسلام آباد' پشاور اور کوئٹہ کا کوئی گھر ڈکیتی اور مسلح چوری کی وارداتوں سے محفوظ نہیں۔ پاکستان کی فضائی خلاف ورزیاں اور صوبہ سرحد کے دیہات پر بمباری روزمرہ کا معمول بن چکی ہے جس میں بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں۔ اس پر افغان حکومت سے ہمارے سرکاری احتجاجات کی تعداد

Marfat.com

اب تک سینکڑوں سے اوپر ہو چکی ہے' مگر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ (88-1987)

پاکستان کے استحکام اور دفاع پر ایک اور مسئلہ کے کالے سائے منڈلا رہے ہیں۔ وہ یہ کہ ہمارے حاکم برملا پاکستان کو "فرنٹ لائن مملکت" قرار دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں کوئی پوچھے کہ پاکستان کس کے خلاف فرنٹ لائن مملکت بنا ہوا ہے۔ یہ پالیسی فوراً ختم ہونی چاہئے کیونکہ اس طرح پاکستان کسی ایک یا دوسری سپرپاور کا حلقہ بگوش قرار پائے گا۔ جتنی جلد ممکن ہو ہمیں اپنے ہمسایہ برادر ملک افغانستان کے ساتھ براہ راست مذاکرات کے ذریعے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہئے تاکہ پاکستان کی سرزمین پر سے تیس لاکھ مہاجروں کا بوجھ ہٹایا جا سکے۔ اس سے سرحد کے دونوں طرف افغان مسلمان بھائیوں کا قتل عام بھی روکا جا سکے گا۔ افغان مستقبل میں ہمارے لئے نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ وہ گذشتہ صدیوں کے دوران رہے ہیں۔ وہ بھی مسلم امہ کا ایک جزو ہیں۔

گو ملک کی موجودہ (87-1985) جغرافیائی سیاسی صورت حال اور آئینی نظام میں ان مقاصد کا حصول جاگتے میں خواب دیکھنے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایسا کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اس کے لئے ہمیں وسیع القلبی 'عزم صمیم اور ملک کے اندر اتحاد و یکجہتی کی ضرورت ہے۔

جو کچھ ہو رہا ہے' اس کی ذمہ دار ناکام خارجہ پالیسی ہے۔ پاکستان اتنی مدت گزر جانے کے باوجود ایک موثر اور مستحکم خارجہ پالیسی اپنانے میں کیوں ناکام رہا ہے؟ اس کا ایک ہی معقول جواب ہے کہ صرف پانچ سال کے سوا جب ملک میں بھٹو کی حکومت تھی' عوام کی نمائندہ حکومت قائم نہیں ہوئی بلکہ ملک پر بیوروکریسی اور جرنیلوں کا راج رہا جو اپنی تربیت اور فکر کے تحت صرف اوپر سے حکم لینے کے عادی ہوتے ہیں اور اس حکم کو بجا لانا ان کی فطرت کا حصہ ہوتا ہے خواہ حکم دینے والا کوئی بھی ہو۔ عام سیاستدانوں اور سروسز سے تعلق رکھنے والے افراد کے فکر اور سوچ میں بڑا فرق ہے مسٹر بھٹو کے بدترین دشمن بھی اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کی خارجہ پالیسی پر مغز اور پر معنی تھی۔ لیکن اس پالیسی کو استحکام نہ دیا جا سکا کہ ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ملک کے خارجہ امور ایک بار پھر سرکاری ملازموں کے

Marfat.com

ہاتھ میں چلے گئے جو ہمیشہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ مراعات اور اختیار' نہ کہ وقار' کیسے حاصل کر سکتے ہیں ؟ اپنے آقاؤں کو کس طرح خوش رکھ سکتے ہیں؟ اور اپنے دوستوں اور برادری کے لئے کسی طرح زیادہ سے زیادہ ملازمتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ پالیسی امور کا فیصلہ "آقا" پر چھوڑ دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ پالیسی کا بالاخر مستقبل میں ملک پر خوشگوار اثر پڑتا ہے یا ناگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقسیم کے وقت بھارت میں ایک ایسے شخص کو پاکستان کا سفیر مقرر کردیا گیا جس نے کبھی پاکستان دیکھا ہی نہ تھا۔ پھر بھی اس وقت کی حکومت نے ایسی بے مثال تقرری مناسب تصور کی۔ گویا پاکستان میں کوئی ایسا اہل اور دانش مند شخص تھا ہی نہیں جو بھارت میں سفیر کے فرائض انجام دے سکتا اس کا جواب شاید یہی ہو کہ اس وقت کے حکمرانوں نے اقربا پروری سے کام لیا ہے۔ پاکستان کے ایک اور سفیر نے ریٹائرمنٹ کے بعد نہ صرف یہ کہ لندن میں برطانوی حکومت کی ملازمت کر لی بلکہ وہ کبھی پاکستان واپس ہی نہیں آیا۔ پاکستان کے ایک وزیر خارجہ نے یہاں سے فارغ ہونے کے بعد امریکہ میں ملازمت کرنا زیادہ موزوں تصور کیا۔ انہیں یہ سب مراعات صرف اس لیئے ملیں کہ وہ پاکستان کے شہری تھے۔ ایک اور سفیر کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے کو اس ملک میں اس عہدے پر فائز کر دیا گیا جس پر اس کا والد فائز تھا۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ دو بھائی مختلف ملکوں میں سفارت کے عہدہ پر فائز ہیں۔ ان میں سے بیشتر سول ملازم تھے۔ ان کا مرکزی حکومت کے دفاتر اور دفتر خارجہ پر اتنا کنٹرول تھا اور ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی انہیں ملازمت سے فارغ کر سکتا ہے۔ سروس کے قواعد و ضوابط' پنشن یا ریٹائرمنٹ کے قوانین' جو اکثر و بیشتر "بے سہارا اور غیر مراعات یافتہ" افسروں کے خلاف حرکت میں لائے جاتے ہیں' ان پر تو گویا لاگو ہی نہیں ہوتے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کسی ملک میں سفیر کے عہدہ پر قابض نظر آتے ہیں۔ جب بطور سفیر ان کی میعاد عہدہ ختم ہو جاتی ہے تو ان کو کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے میں کوئی آرام دہ ملازمت مل جاتی ہے۔ اس طرح پاکستان کی انتظامیہ سے افراد کی کئی نسلیں پیدا ہو چکی

Marfat.com

ہیں۔

گویا پاکستان کی مرکزی ملازمتیں جن میں دفتر خارجہ' بینکنگ' دیگر مالی ادارے' مرکزی سیکرٹری' سرکاری صنعتیں' ریلوے' تعلیمی ادارے اور اب تو قومی اسمبلی کے ممبران اور وزارتیں بھی ایک منظم جاگیرداری میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ باپ کے بعد بیٹا پھر پوتا وغیرہ ۔ اس حالت میں بلوچستان یا سندھ کے لوگوں کو کیا خاک حق ملے گا۔ اور ان صوبوں کے لوگ کس طرح آئندہ کی حکومتوں کی غلطیوں سے ہونے والے نقصانات کے حصہ دار ہوں گے' اس پر طرہ یہ کہ بھلا ایسے لوگوں سے جن کی نظر ہمیشہ مراعات' ترقیوں اور مفادات پر مرکوز رہے' سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر' فیصلوں کے لئے سوچ بچار اور قومی وقار و عزت کی آئینہ دار خارجہ پالیسی تشکیل دینے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ ایسے بیشتر لوگوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے طویل عرصہ تک سرکاری ملازمت کی ہوتی ہے وہ کسی نچلے درجے سے ترقی کرتے کرتے اوپر تک آتے ہیں اور اپنے "آقا" کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کا ڈھنگ خوب سیکھ جاتے ہیں وہ انگریزی زبان کے نشیب و فراز کو سمجھتے ہیں اور نہایت تصنع آمیز گفتگو کرتے ہیں۔ ان کا لباس دفتری ماحول کے عین مطابق ہوتا ہے اور اوپر سے ملنے والے ہر حکم کی تعمیل کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتے ہیں قومی مفاد کے کسی مسئلے پر' قوم کے مفاد میں' ڈٹ جانا انکے خمیر میں نہیں ہوتا پھر بھی کارروان' رواں رہتا ہے۔ یقیناً بلوچستان' سندھ' سرحد اور پنجاب میں ایسے لوگوں کا قحط نہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں' سیاسی ذہن کے ساتھ آزادانہ سوچ اور اچھے خاندانی پس منظر کے حامل ہیں۔ حیرت ہے کہ پھر بھی حکومت سروسز میں سے "جی حضور" قسم کے لوگوں کو ہی ہر نوع کی ملازمتیں دیتی رہی ہے اور یہ سلسلہ چالیس سال سے مسلسل جاری ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرکزی حکومت کی خارجہ پالیسی سے چاروں صوبوں کے عوام متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ چاروں صوبوں سے لوگوں کو اس میں ان کا صحیح حصہ ملنا چاہئے تاکہ وہ ملک کے اندر اور باہر جاندار اور غیر جانبدار' آزاد پالیسیاں بنانے اور ان کو چلانے میں نہ صرف شریک ہوں بلکہ ذمہ دار بھی ہوں۔

جنیوا میں 8 سال سے افغان مسئلہ پر پاکستان اور افغانستان کے درمیان ہونے

Marfat.com

والے انتہائی مہنگے اور طویل مذاکرات ختم ہو چکے ہیں۔ روس نے افغانستان سے فوجیں واپس بلا لی ہیں۔ روس اگر چاہتا تو یہ مذاکرات آج بھی جاری ہوتے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں پاکستان کے اولین دور کے وزیر خارجہ کی اس طویل کارکردگی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر پر کیا تھا۔ وہ طویل تقریریں کیا کرتے تھے۔ اکثر وہ رکے بغیر گھنٹوں بولتے رہتے۔ حالانکہ اس دوران ایوان کی بیشتر کرسیاں خالی ہو چکی ہوتیں اور یہ صورت حال سات سال تک جاری رہی۔ پاکستان کے لئے اس رویہ کے بدترین نتائج پیدا ہوئے کیونکہ اس کے نتیجے میں پاکستان کو بھارت سے تین بار جنگ لڑنا پڑی اور بالاخر ہمیں مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

بلاشبہ پاکستان کو ناک رگڑنا پڑی۔ ٹیکس گزاروں کی رقوم دفتر خارجہ کے بیورو کریسی کے ارکان کے ملکی اور غیر ملکی دوروں پر صرف ہوئیں۔ اس سے ان سرکاری افسروں بلکہ اس دور کے وزیر خارجہ کو بھی یہ موقع ملا کہ وہ امریکہ میں نہایت عمدہ تنخواہوں پر ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے اپنے دوستوں اور اعزاء کو بھی ملازمتیں دلوائیں لیکن چھوٹے صوبوں کے لوگوں کو کچھ بھی نہ ملا۔ اس سب کچھ کے باوجود ہمارے اخبارات سر ظفراللہ خان کی طویل تقریروں کو شائع کرتے' ان کی تحسین کی جاتی اور یوں ظاہر کیا جاتا کہ ہم بڑی طاقتوں کی معاونت سے' صرف تقریروں کے ذریعے کشمیر فتح کرنے والے ہیں۔ ہمیں خارجہ امور میں ہماری ماضی کی اس کارگزاری سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ پاکستان کو افغانستان کے ساتھ براہ راست مذاکرات شروع کرنے چاہئیں اور اس دھماکہ خیز خطرناک صورت حال سے خود کو بچا لینا چاہئے جو تیس لاکھ افغان مہاجرین کے افغانستان کی جنگ کے بعد' ہماری سرزمین پر آنے سے پیدا ہو چکی ہے۔ ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے پاکستان کو اپنے مفادات پر نگاہ رکھنی چاہئے اور محض چار سال میں چار ارب ڈالر کی امریکی امداد اور مغربی ملکوں کی طرف سے اناج کی خیرات کے عوض امریکی کٹھ پتلی بن کر نہیں رہنا چاہئے تیسری دنیا میں اس طرح کی جنگیں اور تصادم صنعتی ممالک کے مفادات کے مطابق ہیں۔ وہ مختصر سی خیرات دیتے ہیں' خیرات لینے والے ملک کی پروپیگنڈہ کے

Marfat.com

ذریعے توہین آمیز تشہیر کرتے ہیں۔ یوں وہ اپنے ملکوں کے لئے کثیر منافع کماتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ افغان عوام کا معاملہ ہے۔ یہ انکا اندرونی مسئلہ ہے کہ وہ کس قسم کی حکومت چاہتے ہیں۔ ہم کون ہیں؟ اور کس معیار' اصول یا قاعدہ کے مطابق افغانوں کے تصادم میں "معتبر" بنے پھرتے ہیں جبکہ ہماری سرحدیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ ہمیں افغانستان' روس' ہندوستان اور ایران کے ساتھ دوستی کی خواہش رکھنی چاہئے جو ہمارے قریب ترین ہمسائے ہیں اگر اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہم امن سے رہ رہے ہوں صرف اس صورت میں اپنے ملک کو "امن کا جزیرہ" قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے بصورت دیگر نہیں۔ امریکہ پاکستان کا ایک پرانا دوست اور مددگار ہے اسے بلاجواز ناراض کرنے یا اس کی ناراضگی مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن جب معاملہ پاکستان کے قومی مفاد کا ہو' تو پاکستان کو امریکہ کا حلقہ بگوش بننے سے انکار کر دینا چاہئے اور امریکہ کو صاف صاف بتا دینا چاہئے کہ امداد ملے نہ ملے' ہم آپ کے حلقہ بگوش بننے کے لئے تیار نہیں ۔ جب سپرپاور روس سمیت اپنے تمام ہمسایوں سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہوں گے' ہمیں بھاری فوجی اخراجات اور غیر ضروری اسلحہ کی ضرورت بھی کم ہو گی ۔ ہم اپنی چادر کے مطابق ہی پاؤں پھیلا سکیں گے۔

افغانستان کے ساتھ اختلافات ختم کر کے دوستی میں مزید تاخیر اور ایران عراق جنگ میں کسی موثر پالیسی یا کردار کے بغیر بھارت کے ساتھ فوجی محاذ آرائی کی پالیسی جو ہم سے چار گنا بڑا ہے' کا نتیجہ یہ ہو گا کہ سرحدوں پر تصادم کی فضا بڑھنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی "غیر ملکی جنگوں" میں گھسیٹ لیا جائے گا ۔ اگر' خدانخواستہ ایسا ہوا تو امریکہ اور دوسری کسی بھی طاقت کی دوستی کے باوجود' پاکستان کی سیاسی بقا اور وجود کی سلامتی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ۔ اس طرح ہم صحیح واضح اور جاندار خارجہ پالیسی اپنا کر اندرونی خلفشار اور بے راہ روی کا مقابلہ کر کے دوبارہ 1971ء کے حالات پیدا ہونے سے ملک کو بچا سکتے ہیں ۔ پاکستان کے ارد گرد اور دنیا میں دیگر روز افزوں سیاسی تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ۔ کہ وقت ہمارے ساتھ نہیں ۔ ہمیں اس دلدل سے جلد از جلد خود کو نکالنے کے لئے عزم صمیم اور قوت ارادی کی ضرورت ہے ۔ ملک کے بیشتر افراد کا بھی یہی منشا ہے ۔

Marfat.com

آئین

یہ ایک المیہ ہے کہ گزشتہ 40 سال کے دوران ملک کا ہر نیا حکمران موجود آئین کو منسوخ کرنے کے بعد عوام کے جذبات اور ان کی قسمت کے ساتھ نیا تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ بالکل ابتداء سے جمہوریت کا آغاز کرنا چاہتا ہے لیکن تعجب ہے کہ جمہوریت آ ہی نہیں پاتی کیونکہ اس کے بعد آنے والا جمہوریت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر از سر نو تجربہ کا آغاز کرنے کے لئے تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ یوں یہ شیطانی چکر چلتا رہتا ہے اور تجربہ در تجربہ سے ملک کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ کبھی ملک کا ایک حصہ الگ ہو جاتا ہے، کبھی ملک کے اندر اور باہر عوام کے حقوق اور وقار پامال ہوتے ہیں اور ملک کی عزت پر حرف آتا ہے جنرل ضیاء الحق نے جو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے عبوری آئین کے حکم مجریہ 1981ء (پی سی او) اور بعد میں آئینی ترمیم کے حکم 1985ء کے ذریعے 1973ء کے آئین کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ یہ آئین تو اب پہچانا بھی نہیں جاتا اب یہ نہ تو صدارتی آئین ہے اور نہ ہی پارلیمانی بلکہ اس میں دو مختلف نظام ہائے حکومت کے درمیان توازن پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اس کوشش کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ دونوں ترامیم جو 1981ء اور 1985ء میں کی گئیں دراصل ایک ہی شخص جنرل محمد ضیاء الحق کے ایماء پر کی گئی ہیں اگرچہ دونوں ترامیم 1985ء کی غیر جماعتی اسمبلی میں منظور کی گئیں مگر یہ منظوری بھی ایک اور مارشل لاء کی دھمکی کے سائے میں دی گئی تھی۔

اس دستاویز میں جسے اب 1973ء کا آئین کہا جاتا ہے وزیراعظم اور صدر مملکت کے اختیارات اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم غیر متوازن اور ناہموار ہے۔ اختیارات کی یہ تقسیم انگریزی نو آبادی نظریہ ـــــ مضبوط مرکز ـــــ پر مبنی ہے جسے عوام نے کئی بار، جب بھی انہیں آزادانہ انتخاب کا موقع ملا ہے، مسترد کیا ہے۔ جہاں تک بعض لوگوں کے اس موقف کا تعلق ہے کہ 1973ء کے آئین کو اس کی اصل شکل میں بحال کیا جائے۔ ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہی کافی ہے کہ اول تو اس آئین کو تو خود بھٹو حکومت کے دور میں بھی صحیح طور پر کام

Marfat.com

نہیں کرنے دیا گیا ۔ اس کے نفاذ کے ساتھ ہی اس میں بھٹو حکومت نے متعدد ایسی ترامیم کر دیں جو دور رس نتائج کی حامل تھیں ۔

دوسرے 1973ء کے بعد ملک میں متعدد سیاسی ' معاشرتی اور معاشی تبدیلیاں عمل میں آ چکی ہیں اس وقت اختیارات کی مرکزیت کو ختم کرنے کا عام مطالبہ ہو رہا ہے ۔ پھر دنیا میں بھی یہی صورت حال ہے ۔ بعض صورتوں مثلاً ہنگری اور رومانیہ جیسے ممالک میں نسلی گروپوں کے سیاسی سماجی اور ثقافتی حقوق کے لئے تو خونریزی بھی ہو چکی ہے ۔ مشرقی یورپ کے تمام ممالک اور روس کی پندرہ جمہوریتیں اسی قسم کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہیں ۔ دنیا کا کوئی ملک ' پاکستان سمیت ' سال 1990ء کے دوران چلنے والی تیز آندھی سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا ۔

فرد واحد کے اس آئین)(1985ء) میں جو خامیاں اور خرابیاں ہیں انہیں دور کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ دونوں ایوانوں میں چاروں صوبوں کے نمائندوں کی رائے سے ' مگر قومی اسمبلی میں پنجاب کی 62 فیصد اکثریت کا کلہاڑا چلائے بغیر نیا آئین بنا لیا جائے ۔ یا پھر اس وقت پی پی پی کی منتخب حکومت کو قومی اسمبلی میں معمولی اکثریت اور سینٹ میں اقلیت کے باعث قانون سازی میں جو مشکلات درپیش ہیں انکو مدنظر رکھتے ہوئے مستقبل کے لئے ایسا آئینی نظام قائم کیا جائے جو ایم آر ڈی کے چار نکاتی فارمولا کے مطابق ہو ۔

یہی بہترین حل ہے اور چاروں صوبوں کے لئے قابل عمل اور قابل قبول بھی ہو گا ۔ 62 فیصد آبادی کا صوبہ پنجاب بھی موجودہ وزیراعلیٰ اور کابینہ کے ذریعے صوبائی خود مختاری کا پوری قوت سے مطالبہ کر رہا ہے دوسرے تینوں صوبوں کا تو 1948ء کے بعد سے اب تک یہی مطالبہ رہا ہے کہ انہیں صوبائی خود مختاری عطا کی جائے ۔ وفاقی حکومت صوبائی خود مختاری کے اہم مسئلہ پر چاروں صوبوں کا متفقہ مطالبہ مسترد کر کے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے ۔ جتنی جلدی یہ کام ہو جائے ' سبھی کے لئے سود مند ہو گا ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پنجاب حکومت نے صوبہ پنجاب کے مفاد کیلئے " پنجاب بنک " قائم کر کے نہایت جرائت مندانہ اقدام کیا ہے اور اب وہ اپنا ٹیلی ویژن

Marfat.com

بھی لگا کر پنجاب کا ایک ذریعہ ابلاغ وجود میں لانے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے ۔ اگرچہ پی پی کی مرکزی حکومت ان اقدامات کی سخت مخالفت کر رہی ہے تمام صوبوں کو ' جن میں اکثریتی صوبہ پنجاب بھی شامل ہے' اپنے وسائل پر مکمل کنٹرول حاصل ہونا چاہئے 'صوبے اپنی اقتصادی پالیسی خود بنانے میں آزاد ہونے چاہئیں ' صوبوں کو مرکزی ملازمتوں میں بھی برابر کا حصہ دار ہونا چاہئے انہیں ملک کی خارجہ پالیسی اور مسلح افواج کی تعداد اور قوت کے تعین میں شریک کیا جانا چاہئے ۔ مسلح افواج پر قومی بجٹ کا تقریباً 70 فیصد حصہ خرچ ہو رہا ہے ۔ ان کی تعداد میں ملک کی ضرورت اور جغرافیائی سیاسی صورت حال کے مطابق کمی کی جانی چاہئے صوبوں میں امن و امان کے قیام کے لئے ہر صوبہ کو اپنے خرچ پر ملیشیاء تیار کرنی چاہئے ۔ بیرونی حملہ کی صورت میں یہ ملیشیاء قومی فوج کے شانہ بشانہ دفاع وطن کا فریضہ بھی انجام دے سکتی ہے ۔ اس طرح جو وسائل بچیں گے وہ تعلیم 'سائنس 'سڑکوں اور ریلوں کی ترقی اور صوبوں کے دوسرے قومی تعمیرو ترقی کے کاموں پر صرف کئے جا سکتے ہیں ۔

اس کتاب میں چھوٹے صوبوں کی محرومی کا جو سوال اٹھایا گیا ہے اس کے اثبات اور یہ بتانے کے لئے کہ چھوٹے صوبے کس طرح اعلیٰ سول ملازمتوں سے محروم کئے جاتے رہے ہیں ' ذیل میں ایک رپورٹ دی جا رہی ہے جو "ڈیلی نیوز" کراچی میں 17 اکتوبر 1987ء کو شائع ہوئی ہے ۔

"وہ پاکستان پر حکومت کرتے ہیں"

"لاہور 17 اکتوبر :۔ پاکستان پر ایک ہزار 151 بیورو کریٹ حکومت کرتے ہیں ان میں 138 کا تعلق فوج سے ہے ۔ دوسرے بیورو کریٹس میں 509 کا تعلق ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ سے ' 619 کا سیکرٹریٹ گروپ سے اور 384 کا تعلق پالیسی سروسز سے ہے ۔ گریڈ 22 کے 32 افسر ہیں جن کا تعلق سیکرٹریٹ گروپ سے ہے ان میں 4 اس سال ریٹائر ہو جائیں گے ۔

"اس کے علاوہ گریڈ 22 کے 20 افسروں کو ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ ملازمت دے دی گئی ہے ۔ گریڈ 21 کے افسروں کی تعداد 88 ہے ' ان میں سے 3 اسی سال ریٹائر ہو جائیں گے گریڈ 20 کے 219 افسر ہیں جن میں سے دو اسی سال ریٹائر ہوں

Marfat.com

گے۔

"گریڈ 19 کے 259 افسر ہیں ۔ ڈی ایم گروپ کے 509 افسروں میں سے 197 فوج سے آئے ہیں ۔ ان کے علاوہ گریڈ 22 کے 3 افسر ہیں جن میں سے ایک صفدر کاظمی کو 3 جون 1987ء کو معطل کیا گیا تھا کیونکہ اسے شکرگڑھ کوآپریٹو سوسائٹی سکنڈل میں ملوث پایا گیا تھا جبکہ ایک اور افسر سابق چیف سیکرٹری پنجاب چوہدری محمد صدیق اگلے سال ریٹائر ہوجائیں گے ۔ گریڈ 22 کے تمام افسروں کا تعلق پنجاب سے ہے"۔ مگر عام طور پر ان افسران کو ریٹائرمنٹ کے بعد کنٹریکٹ کے تحت پھر تین چار سال کی نوکری دی جاتی ہے ۔ یا سفیر بنا دیا جاتا ہے ۔ اس طرح نہ تو چھوٹے صوبوں کو سروسز ملتی ہیں اور نہ ہی نوجوان افسروں کو ترقی کے مواقع۔ دفتر خارجہ ' مسلح افواج ' اقوام متحدہ اور دیگر اداروں ' نیم سرکاری کارپوریشنوں مثلاً قومیائے گئے بنکوں ' سرکاری تحویل میں لی گئی صنعتوں جن میں سیمنٹ' کیمیکلز'فولاد اور جہاز سازی کی صنعتیں شامل ہیں اور سرکاری مقبوضہ اخبارات کی صنعت میں بھی جسے نیشنل پریس ٹرسٹ کہا جاتا ہے چھوٹے صوبوں کی نمائندگی کا یہی بلکہ اس سے بھی برا حال ہے ۔ صرف نیشنل پریس ٹرسٹ پر 1985ء کے دوران گیارہ کروڑ 50 لاکھ روپے صرف کئے گئے ۔

کسی وفاق یا نیم وفاق کی عمدہ کارکردگی کا اندازہ کاروبار مملکت میں صوبوں کی عملی شرکت سے ہوتا ہے ۔ محض زبانی جمع خرچ یا بلند بانگ دعوٰوں سے مقصد پورا نہیں ہوتا ۔ اس طرح تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عوام میں احساس محرومی بڑھتا ہے ۔ ان کے مطالبات بڑھتے ہوئے تلخی اور تشدد کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں ۔

لوگ جب دیکھتے ہیں کہ ان کی محرومیوں کو ختم کرنے کے لئے کوئی عملی اقدام نہیں کیا جاتا تو وہ حکام بالا کی لچھے دار تقریروں اور ان کے دوران کئے گئے جھوٹے اور صریحاً جھوٹے وعدوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں ۔ اس طرح حکمران اور سیاستدان عوام کا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں اور کوئی ان کی باتوں کا یقین نہیں کرتا چنانچہ اگلے انتخابات میں لوگ ان کے وعدوں پر ووٹ بھی نہیں دیتے ۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ غریب عوام سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کی لوٹ مار اور جھوٹے وعدوں سے تنگ آکر جمہوری عمل

Marfat.com

ہی سے بے زار ہو جائیں گے جو قوم کے لئے نہایت نقصان دہ ثابت ہو گا۔

بلوچستان کی مثال سرحد اور سندھ پر بھی صادق آتی ہے جہاں وفاق اور صوبوں کے درمیان فنڈز کی تقسیم صوبہ کی سماجی ' اقتصادی اور سیاسی ضرورتوں کے بجائے آبادی کی بنیاد پر ایک ازکار رفتہ منصوبہ کے تحت عمل میں آتی ہے حالانکہ امریکہ ' برطانیہ اور دوسرے جمہوری ممالک میں صوبوں یا وفاق کے یونٹوں کو ضرورت کے مطابق ہی فنڈز مہیا کئے جاتے ہیں ۔ ضرورت تو یہ ہے کہ وفاقی وسائل کے علاوہ صوبوں کو اپنے وسائل پر مکمل اختیار دیا جائے تاکہ وہ اپنی ضروریات ان سے پوری کر سکیں ۔ مسائل کا یہی معقول حل ہے ۔ لیکن ہمارے ہاں گزشتہ 40 سال سے مرکزی حکومت صوبوں کی شدید ترین ضرورتوں سے بھی صرف نظر کرتی رہی ہے اور جھوٹے وعدوں پر لوگوں کو بہلاتی رہی ہے ۔

وفاقی سروسز میں بھی چھوٹے صوبوں کو نمائندگی دیتے وقت آبادی کے تناسب والا دور از کار فارمولا ہی استعمال کیا جاتا ہے ۔ موجودہ فارمولے کے مطابق بلوچستان کو غالباً 1971ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی بنیاد پر ' وفاقی ملازمتوں میں 3ء18 فیصد حصہ دیا جاتا ہے حالانکہ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق یہ حصہ 5ء14 فیصد ہونا چاہئے ۔ صوبائی اسمبلی میں کئی بار قراردادیں منظور کی گئیں ۔ ان میں تازہ ترین قرارداد 8 فروری 1990ء کے "ڈان" کراچی میں شائع ہوئی ہے ۔ اسمبلی میں دیئے جانے والے بیانات کے مطابق کم از کم اندازے سے بھی وفاقی ملازمتوں میں بلوچستان کا حصہ دس ہزار اسامیاں ہونا چاہئے جبکہ عملی طور پر بلوچستان کے چند افراد ہی وفاقی اداروں یا کارپوریشنوں میں ملازمتوں پر فائز ہیں ۔

سندھ اور سرحد میں بھی یہی حکمت عملی کارفرما تو ہے لیکن اس پر بلوچستان کی طرح بے رحمی سے عمل نہیں کیا جاتا کیونکہ سرحد اور سندھ میں پڑھے لکھے اور بیدار مغز سیاستدانوں کی اچھی خاصی تعداد پیدا ہو گئی ہے جو اپنے صوبہ کے مفادات کے تحفظ کے لئے اسمبلیوں میں اثر و رسوخ استعمال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی فوج اور مرکزی ملازمتوں میں بھی ان صوبوں کے افراد ضرور موجود ہیں ' انہیں سے ان صوبوں کی اچھی بھلی سیاسی لابی پیدا ہو گئی ہے بدقسمت بلوچستان عام تعلیم میں بمقابلہ دوسرے

Marfat.com

صوبوں کے صفر سے زیادہ نہیں۔ مرکزی حکومت اور صوبائی بیوروکریسی کبھی بھی قبائلی نظام کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اس نظام کے انگریز کے وقت کے پالے پوسے ساٹھ یا ستر کے قریب سرداروں ملکوں کو سیاسی طور پر اور بھی مضبوط کرتی رہتی ہے ۔ تاکہ اکثریت جہالت کے اندھیرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پڑی رہے اور ان کے حقوق ان گنتی کے اشخاص کے ساتھ مل کر خود اور اپنے رشتے داروں کے لئے محفوظ رکھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی قبائلی قانون کی مخالفت بلوچ اور پٹھان بیدار مغرز سیاستدانوں ' چند نمبرداروں اور وکلاء کی مرکز سے ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں انگریزی قوانین جرگہ واپس لایا گیا اور آج بھی صوبہ کے بہت بڑے حصے میں یہ قانون رائج ہے ۔ جبکہ ہائی کورٹ نے حال ہی میں ان قوانین کو بنیادی حقوق کے خلاف قرار دیا مگر صوبائی حکومت جس پر سرداروں ملکوں اور بزنس والے لوگوں کا قبضہ ہے ۔ سپریم کورٹ میں اپیل داخل کر رکھی ہے چند دوسرے وکلاء کی طرح میں خود بھی 1985ء سے آج تک ان کالے قوانین کے خلاف اعلیٰ عدالتوں کا دورازہ کھٹ کٹھاتا رہا ہوں اور مغربی پاکستان کے ہائی کورٹ میں بعد میں بلوچستان ہائی کورٹ میں جب میں چیف جسٹس تھا ان قوانین کو کالعدم قرار دیا گیا مگر یہ قانون پھر زندہ کئے جا رہے ہیں ۔ 1990ء کے الیکشن کے دوران اور اس سے کچھ پہلے لوگوں سے مختلف جیل بھرے گئے اور نہ صرف یہ بلکہ کئی ایسے کیس بھی ہیں جہاں 69 50 40 اور تیس سال کی سزائیں جرگہ قانون کے ذریعہ ڈپٹی کمشنروں اور ان کے ماتحت افسران سے دلوائی گئیں اور جب سے نئی صوبائی حکومت عمل میں آئی ہے اس نے عام معافی کا اعلان کیا ۔ اور اس طرح سینکڑوں سزا یافتہ لوگوں کے دعاوی اب بورڈ آف ریونیو کے افسران جن کو اپیل وغیرہ کے اختیارات کے پاس ہیں جو ان سزاؤں پر نظرثانی کر رہے ہیں ۔ تحقیق کے لئے مرکزی ادارے عدالتیں اور آزادی کے لئے چمپئن قومی پریس کے لئے دروازہ کھلا ہے۔ مگر مختلف مفادات کی وجہ سے ان کی توجہ اس طرف نہیں ہو گی کیا یک جہتی اور ترقی اس طرح ملک میں قائم ہو سکتی ہے ۔

بیورو کریسی کی تازہ ترین ایجاد "پلیسمنٹ بیورو" ہے اخبارات میں عام لوگوں اور سیاستدانوں کے بیانات دھڑا دھڑ شائع ہو رہے ہیں جن کے مطابق اس "خانہ

Marfat.com

ساز" طریقہ سے وفاقی حکومت نے 35 ہزار افراد بھرتی کئے ہیں ۔ اس بھرتی کے لئے پبلک سروس کمیشن اور صوبائی سروس کمیشن کو بھی نظرانداز کر دیا گیا جو قومی ادارے ہیں ۔ حالانکہ ان کمیشنوں کو دھوکہ میں رکھنے کے بجائے ان کے ذریعے کام لینا چاہئے اور ان کو مضبوط بنایا جانا چاہئے ۔

کیا رائے عامہ کے نمائندے ۔ سیاستدان ' دانشوروں ' مضبوط مرکز کے حامی ' وحدانی طرز حکومت کے دلدادگان اور اسلامی اخوت کی بنیاد پر متحدہ پاکستان کے حامی جن کا تعلق پنجاب یا دوسرے مفاد حاصل کرنے والے گروپوں سے ہے ' ان غلطیوں کو درست کرنے اور زیادتیوں کے انسداد کے لئے آواز بلند کریں گے جو چھوٹے صوبوں کے ساتھ روا رکھی جا رہی ہیں ۔ مگر ایسا ہونے کا امکان ہی نہیں اس وقت بیورو کریسی کا جو گروپ اقتدار پر قابض ہے ' اس نے خود کو اتنا مضبوط اور پائیدار بنا لیا ہے کہ جب تک حکومت کی مختلف آسامیوں کے لئے بھرتی اور تقرر کی پالیسی میں بنیادی تبدیلی نہیں لائی جاتی اور پھر اس تبدیلی پر دل و جان سے عمل نہیں کیا جاتا چھوٹے صوبوں کے عوام کو سکھ کا سانس نصیب نہیں ہو سکتا ۔ محض دکھاوے کے لئے آسانی اقدار ' انصاف کی بنیاد یا اسلامی اخوت کا نام لے کر لمبی تقریروں ' ریٹائر ہونے والے بیورو کریٹس کی طرف سے مساوات ' بھائی چارے اور اخوت کے وعظ سے لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا ہے نہ ہی یہ تقریریں کسی کام آ سکتی ہیں ان افسروں میں سے بیشتر کو جب کوئی دوسری ملازمت خصوصاً ریٹائر ہونے کے بعد ' مل جاتی ہے تو ان کا اصل چہرہ سامنے آتا ہے اور وہ ایک بار پھر محروم طبقوں کی حق تلفی پر کمربستہ ہو جاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ اس قوم پر رحم کرے !

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان جمہوری عمل کے ذریعے ہندوستان خصوصاً مسلم اکثریت کے علاقوں ' سابق مشرقی پاکستان اور موجودہ پاکستان کے وفاقی یونٹوں سندھ ' بلوچستان ' پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے عوام کے ووٹ اور رائے کی بناء پر ' قائم ہوا تھا ۔ یہ مسٹر جناح کے یقین محکم ' سخت محنت اور مسلم عوام کا ان پر زبردست اعتماد ہی تھا جس کی بناء پر کسی فوجی ایکشن کے ذریعے نہیں ' آج ہم اس ملک کے شہری اور ایک آزاد قوم ہیں ۔

Marfat.com

چنانچہ پاکستان کی بقاء کا انحصار بھی جمہوری اصولوں اور روایات کے استحکام ' جمہوری اصولوں پر عمل ' قانون کی حکمرانی ' سب کے لئے انصاف اور مرکز اور صوبوں میں منتخب عوامی حکومتوں کے قیام پر ہے ۔ آمریت فوجی ہو یا سول اور آمر خواہ کتنا ہی فیاض کیوں نہ ہو ' ہمارے مارشل لاء کا حل نہیں ہو سکتی ۔ ہمارا ماضی کا تجربہ بھی یہی ہے غلام محمد سے جنرل ضیاء الحق تک ہر آمر عوام کے مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام رہا اور عوام نے انہیں مسترد کر دیا ۔ جب بھی عوام کو موقع ملا انہوں نے دونوں سول اور فوجی آمروں کے خلاف ووٹ دے کر ان کا خاتمہ کر دیا ۔

آمریت اور مارشل لاء ہمارے لئے ہر طرح نقصان دہ ثابت ہوا ۔ اس سے نہ صرف ملکی ترقی کو نقصان پہنچا بلکہ ملک میں جمہوریت کے قیام اور عوام کے بطور ایک قوم اتحاد اور یک جہتی کو بھی شدید نقصان اٹھانا پڑا ۔ پاکستان کے پورے معاشرہ میں اس وقت جو نسلی اور لسانی گروہ بندی ' صوبائی عصبیت اور ملک بھر کے عوام میں نفرت کی جو لہر چل رہی ہے اس کی وجہ یہی آمریت اور مارشل لاء ہے تاہم مستقبل کے بارے میں بہتری کی امید پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ عارضی نقصانات ہیں جو ہر ملک کو آزادی کے اوائل میں برداشت کرنا ہی پڑتے ہیں ۔ ہمارا قریبی ہمسایہ بھارت بھی اس نوع کے اختلافات سے مبرا نہیں البتہ وہاں کے لوگوں کو بار بار مارشل لاء بیورو کریسی کی آمرانہ حکومتوں سے واسطہ نہیں پڑا بلکہ عوام کی خواہشات اور ضروریات کے مطابق ' انتظامی یا لسانی بنیادوں پر ' آزاد ہندوستان کے کئی صوبوں کی حدود میں رد و بدل کر دیا گیا ہے ۔ لیکن یہ سب کچھ سیاسی عمل کے ذریعے ' نمائندہ اسمبلیوں کی وساطت سے ' کسی پارٹی ' فرد یا کسی جرنیل کی مرضی سے نہیں ' عوام کی مرضی کے مطابق کیا گیا ہے ۔ اور یہی جمہوریت کی کامیابی ہے ۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ضیاء دور میں نا قابل معافی مظالم کے باوجود ضیاء الحق کی آمریت سے عوام کا اختلاف رائے اور مایوسی کا اظہار دراصل عوام کی " رائے " کا اظہار تھا ۔ سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کا ذکر ہی کیا ' سرکاری ملازمتوں اور صحافیوں کو بھی نہ بخشا گیا ۔ انہیں بھی طویل قید کی سزائیں سنائی گئیں ' ملازمتوں سے برطرف کیا گیا اس کے برعکس آمریت کے خوشامدیوں اور ہر موقع پر ہاں میں ہاں ملانے والوں پر

Marfat.com

نوازشات کی بارش کی گئی جنہوں نے اپنی خوشامد کے زور پر جنرل ضیاء کو 1985ء میں غیر جماعتی انتخاب کے ذریعے سول حکومت کے قیام پر مجبور کیا۔

تحریک بحالی جمہوریت (ایم ۔ آر ۔ ڈی) اور اس میں شامل جماعتیں کو جن میں پیپلز پارٹی بھی شامل تھی، 1981ء میں بحالی جمہوریت کی ٹھوس جدوجہد پر خراج تحسین کی مستحق ہیں ۔ ساتھ ہی صوبہ پنجاب کو بھی یہ کریڈٹ ملنا چاہئے کہ ایم آر ڈی کے لیڈروں کی اکثریت کا تعلق اسی صوبہ سے تھا۔ ایم آر ڈی کی کوششوں سے ہی 10 سالہ شخصی اقتدار اور فرد واحد کی آمریت کے بعد ملک میں وفاقی اور صوبائی سطح پر انتخابات ممکن ہو سکے ۔

اس موقع پر مسٹر غلام اسحاق خان کی سیاسی دور اندیشی، دانش اور سوجھ بوجھ کو داد دینا مناسب ہوگا جنہوں نے 17 اگست 1988ء کو فضائی حادثہ میں جنرل ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد، نگران صدر کا منصب سنبھالا اور آئین کے مطابق سب سے پہلے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرائے اور پھر مختلف دباؤ کے باوجود آئینی راستے سے ہٹنے سے انکار کرتے ہوئے آئینی اور جمہوری اصولوں کے مطابق اقتدار مسز بے نظیر بھٹو کے سپرد کر دیا کیونکہ مرکز میں ان کی پارٹی کو صرف معمولی اکثریت حاصل تھی ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ 1985ء کے آئین کے تحت صدر مملکت کو یہ واضح اختیار حاصل تھا کہ وہ کسی اور شخص کو بھی وزیراعظم نامزد کر سکتے تھے مگر صدر غلام اسحاق خان نے سیدھا اور صاف جمہوری راستہ اختیار کیا۔

پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام کو اب ایک برس گزر گیا ہے ۔ ابھی پیپلز پارٹی کی حکومت کی کارکردگی یا اپوزیشن کی کارگزاری کا صحیح تجزیہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مناسب، کیونکہ پارٹی کو ابھی مزید چار سال حکومت کرنا ہے ۔ اس کے بعد ہی پیپلز پارٹی کی حکومت کی کامیابیوں یا ناکامیوں کا صحیح اور غیر جانبدارانہ اندازہ کیا جا سکے گا۔

تاہم دس سال کے اندھیرے کے بعد سیاسی آزادی کے ایک ہی سال کے دوران عوام نے اس جمہوری حکومت سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کرلیں ۔ لوگوں کو امید تھی کہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی شعبوں میں، جمہوری حکومت، بعض بنیادی تبدیلیوں کا آغاز کرے گی، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی نا تجربہ کاری اور توقعات اور امید

Marfat.com

کے برعکس اچانک حکومت مل جانے سے پیپلز پارٹی کی قیادت الجھاؤ' خود سری اور گھبراہٹ کاشکار ہو گئی ۔ چنانچہ ہر طرف سے شدید اختلاف رائے اور اختلافات کی خبریں آ رہی ہیں۔ حکومت کے بعد منظم اور مستحکم اداروں کے ساتھ اختلافات کے علاوہ اپوزیشن کے ساتھ بھی حکومت کے شدید اختلافات منظر عام پر آئے ہیں۔ بلاشبہ جمہوری حکومت نے سیاسی قیدیوں کو آزاد کیا پریس کو بے مثال آزادی دی حتیٰ کہ بعض اخبار تو مخالفوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں اور حکومت سے وابستہ افراد پر ناروا حملے بھی کئے جا رہے ہیں لیکن یہ سب کچھ یہ سوچ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ پریس کے گھٹے ہوئے جذبات بھڑک رہے ہیں اور گزشتہ دس سال سے رکی ہوئی "بھاپ" نکل رہی ہے ۔ ہاں بعض اخبارات حکمران گروہ کے کاموں کی تحسین بھی کر رہے ہیں ۔ مجھے توقع ہے کہ اخبارات میں توازن اور قومی نقطہ نظر ہی غالب رہے گا اور وہ ملکی معاملات میں متوازن رویہ اختیار کریں گے۔

موجودہ حکومت نے طلباء کی یونینیں بحال کر دی ہیں جو ایک قابل تعریف صحت مندانہ اقدام ہے ۔ مگر طلباء کو "ہتھیار ڈالنے" سطحی نعروں کو ترک کرنے اور کتابیں اٹھا کر تعلیم کی طرف متوجہ ہونے میں یقیناً کچھ وقت لگے گا مگر تعلیم کی طرف توجہ جلد سے جلد دینی چاہئے کیونکہ قوم کی تمام امیدوں کا انحصار ملک کی آنے والی نسلوں پر ہی ہے ۔

قومی اسمبلی میں معمولی اکثریت کی وجہ سے حکمران پارٹی ' جیسا کہ اخبارات میں شائع ہونے والے بعض واقعات سے ظاہر ہوا ہے' اپوزیشن رہنماؤں کے ساتھ کبھی نہ ختم ہونے والی لفظی جنگ میں ملوث ہو گئی ہے ۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ دونوں طرف سے جو بیانات کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے ان کا معیار نہایت پست ہے۔ ایک دوسرے پر ذاتی حملے ہو رہے ہیں ۔ اس صورت حال سے عام آدمی الجھ کر رہ گیا ہے ۔ یوں حکومت اور اپوزیشن نے دونوں عام لوگوں کو مستقبل کے لئے رہنمائی اور امید فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں ۔ یہ بیان بازی بند ہونی چاہئے ۔ دونوں فریقوں کو سیاسی افہام و تفہیم سے کام لینا چاہئے اور ان کے درمیان سیاسی مفاہمت ہونی چاہئے تاکہ جمہوری عمل ترقی کر سکے اور آگے بڑھ سکے ۔ ورنہ ملک میں بدترین انتشار اور

Marfat.com

ابتری پھیل جائے گی ۔ مارشل لاء کوئی علاج نہیں۔ یہ ہمارا ماضی کا تجربہ ہے اور یہ بھی کہ اس طرح فوج کی توجہ ان کے اصل فرائض ---- سرحدوں کا دفاع --- سے ہٹ جائے گی فوج سول حکومت کے بکھیڑوں میں الجھ جائے گی گذشتہ تجربوں کی روشنی میں اس کے ہمیشہ منفی نتائج بر آمد ہوئے ہیں ۔

سیاستدان

اب سیاستدانوں کے لئے چند الفاظ :۔ ہمارے سیاستدانوں کو بطور "جماعت" یا پیشہ کے ہر مارشل لاء کی حکومت' عوام کے پڑھے لکھے طبقہ اور خود سیاستدانوں نے ایک دوسرے کو لعن طعن کا نشانہ بنایا ہے بہت حد تک اس کا جواز بھی ہے ۔ قائداعظم محمد علی جناح کے بعد ملک قیادت کے بحران سے دوچار ہے ۔ ہمارے سیاستدان چند مستثنیات کے سوا گورنر جنرل غلام محمد سے نیچے تک سرکاری ملازموں کی " سکھلائی " کے مطابق رائے عامہ کو ملکی مفاد کے مطابق ڈھالنے' عوام کو قومی مسائل پر رہنمائی فراہم کرنے اور حکومت میں ہونے پر انفرادی یا پارٹی کی پالیسیوں کے مطابق عوام کی خدمت کرنے کے مشکل اور طویل' صبر آزما کام کو چھوڑ کر چور دروازوں سے وزارتوں کے حصول ' صاحبان اقتدار کے ساتھ سمجھوتوں اوروقتی مصلحتوں کے لئے مصالحتوں کی روایت پر عمل پیرا رہے ہیں ۔ سیاسی جماعتیں بھی عوام کی مدد کرنے ان کو منظم کرنے اور عوام کے اندر اختلافات کو دور کرنے کے بجائے خود ہی ادنیٰ اختلافات ' تنگ نظری ' تعصب اور مذہبی مناقشات میں الجھی رہی ہیں جب سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کی روایت ہی یہی ہو تو بھلا فوج یا کوئی بھی شخص جو اقتدار پر قابض ہو' سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کے باہمی اختلافات کو کیوں استعمال نہیں کرے گا اور ان سے وزارتوں اور دوسرے مفادات کے لئے خواہ وہ کتنی ہی بے وقعت اور بلا اختیار کیوں نہ ہو' سودے بازی نہیں کرے گا ؟ چنانچہ اگر ملک کے عوام اپنے تجربہ کی بناء پر ہر قسم اور ہر رنگ کے سیاستدانوں پر اپنا اعتماد کھو چکے ہیں تو اس کا ذمہ دار کون ہے ؟ اس کا سارا الزام خود سیاستدانوں پر ہی دھرا جاسکتا ہے ۔ حکومت کی تبدیلی محض خواہشات ' دور از کار تقاریر اور بے تحاشا لمبے لمبے ڈنر کھانے سے نہیں آسکتی ۔

Marfat.com

حال ہی میں حکومت کی طرف سے کالا باغ ڈیم کی تعمیر پر صوبوں ' ایک طرف پنجاب اور دوسری طرف سندھ ' سرحد اور بلوچستان ' کے درمیان زبردست اختلافات سامنے آئے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ڈیم کے باعث سیاسی صورت حال نہایت دھماکہ خیز ہو گئی ہے سندھ اور سرحد کے عوام اخبارات اور رہنما کالا باغ ڈیم کے خلاف زیادہ زور و شور سے احتجاج کر رہے ہیں کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ اس ڈیم کی تعمیر سے ان کی معیشت کو فوری نقصان پہنچے گا۔ حسب معمول بلوچستان کی حکومت اور عوام اس حقیقت سے بے خبر ہی نظر آتے ہیں کہ اگر دریائے سندھ میں کم پانی آیا یا بالکل نہ آیا تو بلوچستان کے نہری علاقوں کو پانی کہاں سے میسر آئے گا۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف پٹ فیڈر کینال خشک ہو جائے گی بلکہ ضلع نصیر آباد کی وسیع تر اور زرخیز اراضی کو آبپاشی کرنے کا مزید کوئی منصوبہ بھی نہیں بنایا جا سکے گا۔ اس وقت جو 5 لاکھ ایکڑ اراضی زیر کاشت ہے وہ بھی بنجر ریگستان میں تبدیل ہو جائے گی۔ بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے دوسرے صوبوں کے چیف جسٹس صاحبان کے ساتھ میں بھی دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم کے کمیشن کا رکن تھا۔ اس کمیشن کے سربراہ پاکستان کے اس وقت کے چیف جسٹس ایس انوار الحق تھے۔ 80-1979 کے دوران کمیشن کے متعدد اجلاس ہوئے جن میں مختلف صوبوں کے ماہرین اور قانون دان شریک ہوئے چونکہ حکومت نے کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا معاملہ ہی اس کمیشن کے دائرہ اختیار میں شامل نہیں کیا تھا لہٰذا جب کمیشن کا اجلاس ہوا تو میں نے اس بارے میں اعتراض کیا۔ چنانچہ میرے اس اعتراض کے بعد پاکستان کے چیف جسٹس نے عبوری آئین کے حکم کے نفاذ (24 مارچ 1981) تک کمیشن کا اجلاس ہی نہ بلایا اور اس آئینی ترمیم کے نفاذ کے بعد میں بلوچستان ہائی کورٹ کا چیف جسٹس ہی نہ رہا اور یوں میری کمیشن کی رکنیت بھی کالعدم ہو گئی۔

بعد میں اخباری اطلاعات کے مطابق نئے چیف جسٹس صاحبان نے کمیشن کا اجلاس تو منعقد کیا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے اور اگر فیصلہ کوئی ہے تو وہ ابھی تک حکومت کے صیغہ راز میں ہے۔

خواہ کچھ بھی ہو ' میری قبل ازیں اور آج بھی یہی رائے ہے کہ چاروں صوبوں

Marfat.com

کے درمیان دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم کا نہایت ہی اہم مسئلہ پاکستان کا سیاسی مسئلہ ہے اور اسے مرکز اور چاروں صوبوں کی نمائندہ حکومتیں ہی حل کر سکتی ہیں۔ میرے نظریہ کے مطابق کالا باغ ڈیم کا مسئلہ افغانستان کے ساتھ سیاسی مفاہمت اور تیس لاکھ افغان پناہ گزینوں کو پاکستان سے واپس بھیجے جانے سے کسی طرح کم اہم نہیں ہے پاکستان کے عوام نے اگر اس مسئلہ کو ہوشمندی اور پوری سنجیدگی سے نہ لیا تو اس کے نہایت خطرناک نتائج ہوں گے۔ جن سے ملک کی بقاء اور یکجہتی کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے بارے میں عوامی اختلاف رائے اور ایجی ٹیشن جیسا کہ اخبارات کی رپورٹوں سے ظاہر ہے اتنا بلند آہنگ ہے کہ پاکستان کا کوئی بھی صحیح سوچ کا حامل شہری اسے نظرانداز نہیں کر سکتا۔

دلائل اور جوابی دلائل کچھ لو اور کچھ دو ' جمہوریت کا ناگزیر حصہ ہیں۔ حکمران جماعت ہو یا اپوزیشن' دونوں کو کسی معاملہ میں اتنا آگے نہیں جانا چاہئے کہ واپسی کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اپوزیشن کا یہ جمہوری حق ہے کہ سیاسی پلیٹ فارم کے ذریعے ہر طرح عوام کو قائل کرے اور جمہوری طریقوں سے اپنی حمایت میں اضافہ کر کے نالائق حکومت کو اقتدار سے چلتا کرے۔ مگر یہ سارا عمل مسلمہ جمہوری اصولوں اور قواعد کے مطابق ہونا چاہئے۔

کسی بھی حکمران پارٹی کی طرف سے قومی مسائل کے بارے میں یک طرفہ اور متعصبانہ رویہ عوام میں مایوسی پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں ناانصافی اور لا محدود بدعنوانی جنم لیتی ہے۔ یہ بد عنوانی صرف رشوت کی صورت میں نہیں ہوتی بلکہ اقربا پروری ' صوبائی تعصب اور لسانی تعصب کی بنیاد پر نااہل افراد کو مراعات دینے کی شکل میں بھی ہوتی ہے حکمران پارٹی کو اس قسم کی صورت حال سے ہر صورت میں بچنا چاہئے کیونکہ آج کے بعد " کل " بھی آنا ہوتا ہے۔ ایسے اہم فیصلے کرتے وقت مستقبل کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے ان کی بقاء اسی میں ہے۔ کسی بھی سیاسی جماعت یا سیاسی رہنما کے لئے عوام کا اعتماد بہت بڑا اثاثہ ہوتا ہے اور عوام کا اعتماد صرف اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ پارٹی یا سیاسی رہنما جو کہتا رہا ہو اس پر برملا عمل بھی کرے۔ بد عنوانی رشوت اور نااہلی کو ختم کرنے کے لئے عملی اقدامات کئے بغیر ان

Marfat.com

برائیوں کی محض لفظی مذمت کافی نہیں۔ بدعنوانی اور نااہلی کی محض نشاندہی اور پھر "عمومی قومی" امراض کا انسداد عوام پر زیادہ مثبت اثر نہیں ڈالتا پاکستان کے عوام اب زیادہ ہوشیار ' نگران اور سیاسی طور پر زیادہ بیدار ہو چکے ہیں وہ نہ صرف سابقہ حکومتوں کے احتساب کے طالب ہیں بلکہ وہ موجودہ حکومت کا اجتماعی اور حکمرانوں کا اجتماعی اورانفرادی احتساب بھی چاہتے ہیں۔

بدقسمتی سے بڑے بڑے دعوؤں کے باوجود ' مختلف حکومتوں نے نہ تو اپنے سے پہلے کی حکومت کا احتساب کیا ہے اور نہ ہی خود کو احتساب کے لئے پیش کیا ہے جب تک احتساب نہیں ہو گا اور اس کے کوئی ٹھوس نتائج سامنے نہیں آئیں گے عوام کے اعتماد میں کمی ہوتی رہے گی۔

حال ہی میں حکومت اور اپوزیشن کی طرف سے ارکان قومی اسمبلی کی جو "ہارس ٹریڈنگ" ہوئی ہے ' جیسا کہ اخبارات میں چھپتا رہا ہے وہ نہ صرف ان کے لئے داغ ملامت ہے جو اس ہارس ٹریڈنگ میں ملوث تھے بلکہ یہ جمہوری عمل کے لئے بھی نقصان دہ ہے۔ یہ عوام کے اعتماد کا بدترین استحصال ہے اور اس سے بیرونی دنیا میں پاکستان کو "بدنامی" ملی ہے۔

ملک کا مستقبل جمہوری عمل کے تسلسل اور انتخابات کے ذریعے عوام کی مرضی کے مطابق حکومتوں کی تبدیلی میں مضمر ہے۔ چور دروازوں سے اقتدار کا حصول جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے ' ملک کے مستقبل کے لئے خطرناک ہو گا۔ اگر جمہوریت اور جمہوری عمل مسلسل جاری رہے تو بدعنوان ' نااہل ' سیاسی موقع پرست اور ازلی خوشامدی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی منظر سے غائب ہوتے چلے جائیں گے۔ جمہوری عمل میں لوگ ان کو مسترد کر دیں گے بلکہ دھتکار دیں گے بشرطیکہ اپوزیشن اور حکمران پارٹی جمہوری عمل کو صحیح اصولوں کے مطابق جاری رہنے دیں تو عوام بلاشبہ ان خوشامدیوں ' بدعنوان ' اور نااہل موقع پرستوں کو اپنے ووٹ نہ دے کر قوم کو اس لعنت سے نجات دلائیں گے۔ ۔۔۔ اور یوں ایک نئی صبح طلوع ہو گی۔ جس کے بعد ہم سب ذمہ دار اور معزز شہریوں کی طرح باہمی امن وامان کے ساتھ کسی بھی خطرے ' شکوک اور ایک دوسرے سے نفرت کئے بغیر' جیسا کہ اس وقت ہے ' زندگی بسر کر سکیں گے۔

Marfat.com

حرف آخر۔۔۲

مارچ ۱۹۹۰ء تا مارچ ۱۹۹۱ء

مارچ ۱۹۹۰ء میں اس کتاب کی (انگریزی میں) اشاعت کے بعد دنیا انقلابی نوعیت کی جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیوں کی زد میں رہی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی طرح اگست ۱۹۹۰ء کے صبر آزما مہینے میں خلیج فارس کی مختصر ریاست کویت کے آس پاس دور حاضر کی جدید ترین فوجی قوت اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی بری' بحری اور فضائی فوج کے ۵ لاکھ سے زائد جوانوں اور افسروں کا اجتماع دیکھا۔ جبکہ کویت کے اندر عراق کی لاکھوں جوانوں پر مشتمل فوج مورچہ زن تھی۔ اس تباہ کن جنگی قوت کے اجتماع کی بنیادی وجہ عراق کے آمر صدر صدام حسین کی طرف سے کویت پر یک طرفہ اور جارحانہ قبضہ تھی۔ عراق کی اس آشکار غنڈہ گردی کے باعث جہاں اس خطہ میں طاقت کا توازن بگڑ گیا' وہاں عرب ممالک' عالم اسلام' یورپ امریکہ۔ سوویت یونین اور جنوب مشرقی ایشیاء میں وہاں سے بھی کم عرصہ کے دوران' کئی ممالک کی وفاداریاں بدل گئیں' صف بندی درہم برہم ہو گئی اور کئی عالمی تنظیموں میں واضح تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

یہ محاذ آرائی کیسے شروع ہوئی۔ پہلے تو عراق نے کویت کے علاقے پر اپنا تاریخی حق جتایا۔ جس کا اصل مقصد تو دونوں طرف سے تیل کی دولت پر زبردستی قبضہ کرنا تھا۔ پھر عراق کی طرف سے عرب اتحاد کا نعرہ لگایا اور اسرائیل مخالف موقف اختیار کیا گیا تو دوسری طرف سے امریکہ کی قیادت میں اقوام متحدہ کے تمام ارکان نے اس پر شدید مذمت کا اظہار کیا اور وہ ایک چھوٹے سے ملک کی آزادی اور سلامتی کو بچانے کے لئے متحد ہو گئے۔ جس کے پاس عراق کی دس لاکھ فوج کے بالمقابل صرف ۳۰ ہزار فوج تھی۔ مگر یہ سب کچھ تو ماضی قریب کی باتیں ہیں اور قاری کے ذہن میں ان واقعات کی یاد تازہ ہے۔ لہٰذا ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

ہاں ایک بات یقینی ہے کہ دنیا ایک بار تو تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر آ کھڑی

Marfat.com

ہوئی تھی جو شاید صدیوں تک سب سے بڑی اور تباہ کن جنگ کی حیثیت میں یاد رکھی جاتی۔ کیونکہ اگر یہ عالمی جنگ شروع ہو جاتی تو اس سے دنیا کے وسیع خطے تباہ و برباد ہو جاتے۔ تمام اقوام کے لاکھوں ر کروڑوں افراد لقمہ اجل بن جاتے پھر اس جنگ کے باعث ماحول میں تبدیلیاں رونما ہوتیں' ایٹمی اور جراثیمی و کیمیائی میزائلوں کے استعمال سے دنیا کے براعظموں میں وہ تباہی مچتی کہ دنیا ایک بار پھر پتھر کے دور میں دھکیل دی جاتی.... اور جب جنگ کا یہ ہولناک دن اختتام کو پہنچتا تو کوئی فاتح اور کوئی مفتوح نہ ہوتا۔ انسان نے گزشتہ چار صدیوں میں علم اور سائنس کے محاذ پر جو کامیابیاں حاصل کی ہیں' آن واحد میں ان پر پانی پھر جاتا اور سپر طاقتوں سمیت' انسان کو اگر کوئی زندہ بچ جاتا' زندگی کا آغاز از سرنو کرنا پڑتا۔ تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ صورت منظور نہ تھی چنانچہ اس نے انسانیت کو خود اپنے ہاتھوں ایک بار پھر تباہ ہونے سے بچا لیا۔

بلاشبہ بعض دوسرے عوامل بھی موجود تھے جن کے باعث خلیج کی مختصر مگر فیصلہ کن جنگ' عالمی جنگ کی شکل اختیار نہ کر سکی۔ یورپی ممالک کے ذہنوں میں دوسری جنگ عظیم کی تلخ یادیں ابھی تازہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے آنکھیں بند کرکے چھلانگ لگانے کے بجائے تحمل اور احتیاط سے کام لیا۔ یہ ان کا دانشمندانہ رویہ تھا۔ خصوصاً جرمنی نے اس جنگ میں نیم دلانہ شرکت کی جب کہ برطانیہ کے سوا' دوسرے یورپی ممالک پر مفید اثرات مرتب ہوئے۔ یورپ' جاپان' بلکہ روس چین اور تیسری دنیا کے دوسرے ممالک کی طرف سے بھی خلیج کی جنگ کے متعلق کوئی زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ اس سے امریکہ اور اس کے اتحادی مجبور ہو گئے کہ وہ اس جنگ کو جلد از جلد ختم کر دیں۔ لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ اگر ایسا کوئی اور موقع آیا تو بھی یہی صورت حال ہو گی۔

اس جنگ کے سیاسی اور سماجی اثرات تو ابھی کافی عرصہ تک محسوس کئے جاتے رہیں گے۔ اگرچہ اس جنگ کے حالات و واقعات میں کئی سبق پوشیدہ ہیں مگر انسان کی یہ سرشت ہے کہ وہ تاریخ سے کم کم ہی سبق سیکھتا ہے۔ حالانکہ تاریخ خود کو دہراتی رہتی ہے۔ خیر جو بھی ہو' ایک سبق تو یہ ملا ہے کہ آمریت اور فرد واحد کی حکمرانی خواہ

Marfat.com

وہ کتنا ہی شفیق اور مہربان کیوں نہ ہو' پہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو اس کے اپنے عوام کو' پھر اس کے ہمسایہ ممالک کو اور دنیا کو' کسی فرد واحد کو اس ملک کے عوام یا ہمسایہ ممالک کی قسمت سے کھیلنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔ آمریت تو ریت کے گھروندے کی طرح بیٹھ جاتی ہے جیسا کہ صدام حسین کے ساتھ ہوا۔ اس کی "ام الحرب" کو اتحادیوں نے "شکست کی ماں" میں تبدیل کر دیا۔ ثانیاً ایسے ممالک کے درمیان سیاسی معاہدے' جہاں مطلق العنان یا نیم مطلق العنان حکومتیں قائم ہوں جو عوام کی شراکت اور دلی حمایت سے محروم ہوں' عرب لیگ اور اسلامی کانفرنس کی طرح بے اثر اور بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی تنظیمیں قائم کرنا کوئی غلط کام نہیں۔ بشرطیکہ انہیں متعلقہ ممالک کے عوام کی حمایت حاصل ہو۔ عوام کی حمایت ٹھوس دلائل پر مبنی وسیع تر پراپیگنڈہ کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے' محض ماضی کے کارناموں اور کامرانیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے نہیں۔ جبکہ حقائق کا سامنا کرنے کی اہلیت اور عزم بھی نہ ہو۔ یہ اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں' سائنسی ٹیکنالوجی اور جمہوری اصولوں کا دور ہے۔ دنیا بارہویں صدی کی صلیبی جنگوں کے دور سے نہیں گزر رہی۔ عالم عرب یا عالم اسلام کے اتحاد کے خالی خولی نعرے' جن کو پورا کرنے کا عزم اور وسائل نہ ہوں' ایسے ہی نتائج پیدا کر سکتے ہیں جیسے کہ خلیج کی جنگ سے پیدا ہوئے ہیں۔ تمام عرب اور تمام اسلامی ممالک مل کر بھی عراق کو پورے عالم عرب اور عالم اسلام کی تباہی کی راہ پر گامزن ہونے سے نہ روک سکے۔ مستقبل میں ان تنظیموں کو' ماضی کی طرح محض "مباحثہ سوسائٹیوں" اور سماجی اجتماعات کی صورت اختیار نہیں کرنی چاہئے جہاں مختلف حکمران عوامی خزانہ کو ضائع کرتے ہوئے محض طویل تقریریں کرنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں یا مختلف ممالک کے بیوروکریٹ کسی مقصد کے بغیر محض ایک دوسرے کی تعریف کے لئے آتے ہیں۔ ان تنظیموں کے منشور پر نظرثانی کی جانی چاہئے اور نئی نسل کو انہیں از سرنو مرتب کرنا چاہئے تاکہ ان میں کچھ تو سکت ہو اور یہ کسی کام کے تو ثابت ہوں۔

خلیج کی تباہ کن جنگ کے بعد' سرد جنگ سے پہلے اور سرد جنگ کے بعد کا طاقت کا توازن درہم برہم ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے دو سپر طاقتوں میں سے ایک' روس جو

Marfat.com

طاقت کا توازن برقرار رکھے ہوئے تھا اپنے اندورنی سیاسی و معاشرتی مسائل میں بری طرح الجھ گیا ہے۔ چنانچہ آئندہ کچھ عرصہ کے لئے روس اس قابل نہیں ہو سکتا کہ ماضی کی طرح امریکہ کی اندھی قوت کے سامنے چٹان بن سکے تاکہ امریکیوں کو اہم عالمی مسائل کے بارے میں اپنے راستے بدلنے پر مجبور کیا جا سکے۔ تاہم جہاں تک روس کے اہم مفادات اور دوستوں کا تعلق ہے' روس اپنی مشکلات کے باوصف امریکہ کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ نہ ہی عوامی جمہوریہ چین طویل عرصہ تک دنیا میں رونما ہونے والے واقعات سے آنکھیں بند کر سکتا ہے۔ ابھی تک روس کی فوجی قوت بھی صحیح و سالم ہے اور وہ کسی بھی امکانی' ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کا اہل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روس اپنے عوام کو زیادہ متحد رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ چنانچہ جلد ہی روس ایک یورپی اور ایشیائی قوت بن کر پھر ابھرے گا جو امریکہ کی عالمی تھانیداری کو چیلنج کر سکے گا اور بتا سکے گا کہ صرف امریکہ ہی دنیا میں بنیادی انسانی حقوق' جمہوریت' اور چھوٹے ممالک کا محافظ نہیں ہے۔ میرے خیال میں خود امریکہ کے عوام بھی امریکہ کے اس خود ساختہ اور نہایت بوجھل کردار کو جاری رکھنے پر خوشدلی سے رضا مند نہیں ہوں گے۔ جس پر بھاری مالی اور انسانی وسائل صرف ہو رہے ہیں۔ وہ بھی تو دوسری اقوام کی طرح اس زمین پر رہتے ہیں۔ قوموں کی اس برادری میں ہر ملک کو دوسرے ملک کے ساتھ اپنے رویہ میں توازن اور دوسروں کے جذبات و احساسات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زیادہ عرصے تک "تھانیداری" کا رناسپاس ہوتی ہے اور اس سے مختلف محاذوں پر امریکہ کو زک اٹھانا پڑے گی۔ ایک بڑی فوجی اور اقتصادی قوت کے ناطے امریکہ نے جو عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں' انہیں نقصان پہنچے گا پھر ماضی میں جمہوریت اور انسانی کاز کے لئے امریکیوں کی جدوجہد کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جائے گا۔

خلیج کی جنگ کے بعد امریکہ کی طرف سے "نئے عالمی نظام" کا نظریہ پوری دنیا میں زیر بحث ہے۔ اس کے نظام کا مطلب مختلف ممالک کے درمیان نئی صف بندی اور قوت کا نیا توازن ہے۔ اول تو روس کی اندورنی مشکلات اور مسائل کے باوجود یہ امر محال ہے کہ روس کو نئے عالمی نظام میں نظرانداز کیا جائے یا روس کو نظرانداز کر

Marfat.com

کے کوئی نیا عالمی نظام معرض وجود میں لایا جا سکے۔ اقوام عالم' خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک کا مفاد اسی میں ہے کہ روس کو ایسے معاملات کو طے کرنے میں اس کا جائز کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے جو اقوام عالم پر اثر انداز ہو سکتے ہوں۔ مشرق وسطیٰ ہو یا یورپ' ایشیا ہو یا بحرالکاہل کے ممالک روس دنیا میں کسی جگہ بھی اپنے عالمی مفادات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ خلیج کی جنگ سے امریکہ' برطانیہ اور بعض دوسرے ممالک کے علاوہ جن ممالک کو براہ راست فائدہ پہنچا ہے' ان میں اسرائیل سرفہرست ہے۔ اسرائیل کو غریب فلسطینیوں پورے عالم عرب اور عالم اسلام کے علاوہ تیسری دنیا کے بعض ایسے ممالک کی قیمت پر فائدہ پہنچایا گیا ہے جو ماضی میں فلسطینی عوام کے مفاد کے چمپئن رہے ہیں۔ اس وقت عراق کی تباہی' عالم عرب اور عالم اسلام میں شدید نااتفاقی کے باعث اسرائیل علاقہ کی بالادست فوجی قوت بن چکا ہے۔ جسے نہ صرف امریکہ کی اشیرباد حاصل ہے بلکہ امریکہ اسے جدید ترین اسلحہ بھی مفت فراہم کر رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں سیاسی اور فوجی قوت کا یہ "منیارہ بابل" کب تک قائم رہتا ہے؟ علاقہ کی ہر آن بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال کے پیش نظریہ بجائے خود ایک سوالیہ نشان ہے۔

امریکی مدبر یقیناً اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ اسرائیل کو وہ جس انداز میں' تھوک کے بھاؤ' فوجی اور اقتصادی امداد فراہم کر رہے ہیں۔ اس کے نتائج نفع بخش نہیں ہوں گے۔ کوئی یورپی ملک' اپنے طویل تر اقتصادی اور سیاسی مفادات کے پیش نظر' اسرائیل کے متعلق امریکیوں کے رویہ کی دل سے حمایت نہیں کرے گا۔ چنانچہ خلیج کی جنگ میں تمام عرب اور مسلم ممالک کو امریکہ' برطانیہ اور دوسری "غیر حاضر" طاقتوں کے ہاتھوں جو ذلت اور رسوائی اٹھانا پڑی ہے اس کے ازالہ کے لئے مسئلہ فلسطین کا منصفانہ اور آبرومندانہ حل ناگزیر ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اسرائیل اپنی موجودہ سیاسی اور فوجی قوت کے بل پر آئندہ دس سال میں دنیا کو تیسری عالمی جنگ میں کم از کم مشرق وسطیٰ کو ایک بڑی جنگ میں دھکیل دے گا۔ ایسا تو ہوتا ہی رہا ہے اور دوبارہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جائے جہاں اسے شیطان اور گہرے سمندر میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑ جائے۔ تو یہ قوم نئے عزم اور اتحاد کے

Marfat.com

ساتھ شیطان کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ آخر نہتے ویت نامیوں نے امریکہ جیسی سپرپاور کا مقابلہ نہیں کیا تھا اور امریکہ کے جدید ترین تباہ کن اسلحہ' کیمیکل اور دوسرے خطرناک ہتھیاروں کے باوجود ویت نامی ڈٹ نہیں گئے تھے اور امریکہ کو ویت نام سے اپنا بستر گول کرنا پڑا۔ بلاشبہ ویت نامی عوام نے عظیم جانی اور مالی قربانیاں پیش کیں۔ لیکن انہوں نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ عوام کے متحدہ عزم کی قوت ہی' اگرچہ بڑی قربانیوں اور طویل ابتلا کے بعد ہی سہی' کامیاب اور ناقابل تسخیر ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ عرب اور عالم اسلام یا کوئی بھی دوسرا ملک' ایسی بلندیوں کو نہیں چھو سکتا جبکہ ان کی ماضی کی تاریخ بھی ایسی ہی مثالوں سے اٹی پڑی ہے۔ مستقبل کے بارے میں تو کوئی بھی شخص کچھ بھی کہہ سکتا ہے کیونکہ کوئی بھی قطعی طور پر یہ پیش گوئی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ کسی قوم کے لئے مستقبل کے بطن سے کیا برآمد ہو گا؟ اس وقت جو سیاسی اور جغرافیائی صورتحال ہے' اور حالات جو رخ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے پیش نظر بعض امور کی طرف اشارہ تو کیا جا سکتا ہے اور بنی نوع انسان کی بھلائی کے پیش نظر بعض تجاویز بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔

امریکہ نے جو نیا عالمی نظام پیش کیا ہے' اس کا مقصد امریکہ کو دنیا کا تھانیدار بنانا اور خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک کو جنگ کے خطرات سے ڈرا کر زبردستی رکھنا اور سب سے بڑے حلیف اسرائیل کو اس کے عرب ہمسایوں کے خلاف استعمال کرنا ہے۔ لیکن ایسا نظام زیادہ دیر چل نہیں سکے گا۔

ادھر یورپ جرمنی اور فرانس کی متحدہ قیادت کے تحت ابھر رہا ہے۔ اس وقت برطانیہ گومگو کی حالت میں ہے کہ وہ امریکہ کی حمایت کرے یا یورپ کے پلڑے میں اپنا وزن ڈال دے۔ اپنے سیاسی اور اقتصادی مفادات کے پیش نظر یورپ متحد ہو کر ایک مضبوط بلاک قائم کر سکتا ہے اور وارسا پیکٹ کے ممالک کی امداد و تعاون سے عالمی معاملات کو نمٹانے میں اپنا جائز حق طلب کر سکتا ہے۔

امریکہ عالمی طاقت ہے اور رہے گا۔ وہ ایک طویل عرصہ تک دوسرے ممالک سے کٹ کر بھی گزارا کر سکتا ہے جس کے دوران وہ دیکھتا رہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک باہمی معاملات کس انداز میں اور کس طرح نمٹاتے ہیں۔ پھر جنوبی امریکہ کے

Marfat.com

ممالک' اگرچہ وہ زیادہ موثر نہیں ہیں' ہمیشہ امریکہ کے ساتھ رہیں گے جس سے امریکہ خود کو بڑا بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ خلیج کی جنگ نے بلاشبہ عربوں کو ذلیل و رسوا کیا' آمریت کا پول کھول دیا اور تمام ہمسایوں کے خلاف کسی ایک ملک کی زیادتی میں پنہاں کمزوری کو آشکار کر دیا۔ پھر پوری دنیا حرکت میں آ گئی اور اس علاقہ کے ہر انسانی شعبہ میں تباہی مچ گئی۔ لیکن یہ سب کچھ عرب عوام کے لئے برائی کے پردے میں رحمت ثابت ہو گا۔

عرب یقیناً اپنی ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر غور کریں گے۔ وہ اپنی کمزوریوں کا از سرنو جائزہ لیں گے۔ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں گے وہ یہ عزم لے کر اٹھیں گے کہ سب سے پہلے انہیں ہر طرح کے نعرہ باز حکمرانوں سے نجات حاصل کرنی ہے' پھر تیل کی دولت پر کنٹرول حاصل کر کے اسے عوام کے مفاد میں منصفانہ طور پر خرچ کرنا ہے اور عربوں کی اس دولت کو محض آرٹ گیلریوں کی آرائش اور دنیا بھر میں گھوڑوں کی ریس پر ضائع نہیں ہونے دینا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہیں عوام کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنانا ہو گا' جدید سائنسی علمی اور ٹیکنالوجی حاصل کرنا ہو گی اور سب سے بڑھ کر اسلام کے نظام ضبط و نظم کو دل سے اپنانا ہو گا جو اپنی روح میں نہایت ہی انسان دوست اور شفیق ہے۔ وہ ہر نوع کی ناانصافی اور عدم مساوات کے نہ صرف خلاف ہے اور اس سے نفرت کرتا ہے بلکہ وہ اپنے پیروکاروں کو ہر نوع کی ناانصافی' بدعنوانی اور عدم مساوات کی مزاحمت' معاندت اور مقابلہ کرنے اور اسے برباد کرنے کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ میری رائے میں سچی محبت' تحمل' بردباری' عفو و درگزر کے اسلامی اصولوں کے ساتھ ساتھ ہی چل سکتی ہے۔ اس طرح جب وہ عوام کے اتحاد کا مقصد حاصل کر لیں گے تو مستقبل میں وہ کسی بھی جارحیت کا متحد ہو کر مقابلہ کریں گے۔ اگرچہ روس بذات خود ایک سپر طاقت ہے۔ لیکن اسے بھی اتحادیوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایشیا میں روس کے تمام مسلم ہمسائے کچھ نہ کچھ دیئے بغیر' اپنے مفاد کی خاطر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتے ہیں۔ عوامی جمہوریہ چین بھی ایشیا میں ایک سپر طاقت ہے' پھر بھارت' پاکستان' ایران ' افغانستان' انڈونیشیا اور فلپائن بھی کسی مقصد کی خاطر عالمی سیاست میں اتحاد و تعاون کر سکتے ہیں اور یوں

Marfat.com

تیسری عالمگیر جنگ کو ناممکن بنا سکتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا ماضی کی طرح روس اور امریکہ کے دو بلاکوں کی بجائے طاقت کے اعتبار سے پانچ یا چھ بلاکوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ اس سے مختلف اقوام کے درمیان طاقت کے توازن پر نہایت صحتمندانہ اثرات مرتب ہوں گے اور مستقبل میں طویل عرصہ کے لئے عالمی امن کی ضمانت مل جائے گی۔

اب میں پاکستان کی طرف آتا ہوں۔ پاکستان بھی مارچ ۹۰ء سے مارچ ۹۱ء تک کے سال میں، خلیج کی جنگ کے باعث، زبردست سیاسی زیرو بم اور اتھل پتھل کی زد میں رہا۔ اگست ۱۹۹۰ء میں بے نظیر بھٹو کی جمہوری اصولوں کے مطابق منتخب حکومت کو، جسے قومی اسمبلی کے ایوان میں معمولی سی اکثریت حاصل تھی۔ جس کے باعث وہ بنیادی نوعیت کی ضروری قانون سازی نہ کر سکی، برطرف کر دیا گیا۔ صدر غلام اسحاق خان نے آئین کی بدنام آٹھویں ترمیم کے تحت اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو موقوف کر دیا۔ صدر کے اس انتہائی اقدام کی وجوہ کی ایک طویل فہرست ہے جس کے مطابق بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں بے لگام بدعنوانی اور رشوت ستانی کا ارتکاب کیا گیا، قومی تحویل میں لئے گئے بنکوں کا سرمایہ بے رحمی سے لوٹا گیا، ان بنکوں اور کئی دوسرے سرکاری اداروں کے فنڈز اپنے منظور نظر افراد اور پارٹی کے ارکان پر لٹائے گئے، نچلے گریڈ سے لے کر اعلیٰ گریڈ کی سرکاری آسامیوں پر تقرریوں میں زبردست اقربا پروری اور دوست نوازی سے کام لیا گیا۔ ان تقرریوں میں کسی قاعدے یا قانون کی بھی پرواہ نہ کی گئی۔ قومی اور صوبائی اسمبلی کے ووٹوں کی سرعام خرید و فروخت کی گئی۔ جسے حرف عام میں "ہارس ٹریڈنگ" کا نام دیا گیا۔ اس مقصد کے لئے بھی سرکاری فنڈز کا ناجائز اور بے محابا استعمال کیا گیا اور کاروبار مملکت میں انتہائی لاپرواہی اور نااہلی کا ثبوت دیا گیا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی سنگین الزامات بھٹو حکومت پر لگائے گئے۔

ان الزامات کی بنیاد پر ہی صدر مملکت نے مختلف خصوصی عدالتوں میں وزیر اعظم، ان کے شوہر، بعض وفاقی وزراء اور اعلیٰ عمال حکومت کے خلاف بیس سے زیادہ ریفرنس پیش کئے جو زیر سماعت ہیں۔

Marfat.com

تمام اسمبلیوں کے از سرنو انتخابات کرائے گئے جن میں تمام توقعات کے برعکس پیپلز پارٹی کو تباہ کن شکست سے دوچار ہونا پڑا اور اسلامی جمہوری اتحاد نے' جو کئی سیاسی جماعتوں کا جمگھٹا سا ہے' میاں محمد نواز شریف سابق وزیر اعلیٰ کی قیادت میں کامیابی حاصل کی۔ اسلامی جمہوری اتحاد کو قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہو گئی۔ سینٹ میں بھی اسلامی جمہوری اتحاد کو بھی بڑی تعداد میں نشستیں حاصل ہیں اور تمام صوبائی حکومتیں بھی آئی جے آئی کے ارکان کی قیادت میں قائم ہو گئیں۔ مسٹر نواز شریف کی حکومت کو (یہ سطور لکھے جانے تک) برسر اقتدار آئے صرف چار ماہ گزرے ہیں۔ چنانچہ ابھی اس حکومت کی کارکردگی پر تبصرہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ایسا کرنا قرین انصاف ہوگا۔ میاں نواز شریف نے اقتدار سنبھالنے کے بعد حسب معمول کچھ سیاسی بیانات دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے قومی تحویل میں لی گئی صنعتوں اور بینکوں کو' جو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں سرکاری قبضہ میں لئے گئے تھے' واپس نجی شعبہ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے خود انحصاری اور اپنے وسائل سے کام چلانے' آزاد خارجہ پالیسی اپنانے' قانون کی حکمرانی کی بحالی اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ مالی خود مختاری دینے کے لئے بھی اقدامات کا اعلان کیا ہے۔ یہ بات تو سبھی کو معلوم ہے کہ ہمارے سیاست دان نہ صرف عوام بلکہ اہل سیاست میں بھی اپنا اعتماد کھو چکے ہیں۔ چنانچہ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ میاں نواز شریف نے جن پالیسیوں کا اعلان کیا ہے انہیں کب اور کس حد تک عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔

پاکستان آج بھی کم و بیش انہی مسائل و مشکلات کا شکار ہے جنہیں ہر حکومت' تمام سیاست دان' اہل دانش اور عام لوگ تسلیم کرتے چلے آتے ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ان مشکلات اور مسائل سے' جو قابل حل ہیں' ملک کو کون اور کب نجات دلائے گا؟

میں نے اس کتاب میں خصوصاً اس کے تین آخری ابواب "محروم صوبے اور پسے ہوئے عوام" "اجارہ دار پریس" اور پھر آخری باب "حرف آخر" میں قانون کی حکمرانی نہ ہونے' سیاسی تنظیموں اور سرکاری شعبوں میں محاسبہ کے عدم وجود' پرلے درجے کی اقربا پروری اور ہولناک بدعنوانی' آزاد خارجہ پالیسی نہ ہونے' معاشرے میں

Marfat.com

تقسیم اور قومی اتحاد کی بجائے چھوٹے موٹے مفادات کی بنا پر گروہ بندی' دریائے سندھ کے پانی کی منصفانہ تقسیم اور متنازعہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا ذکر کیا ہے۔ صدر ضیاء الحق کے مارشل لا کے بعد معاشرے میں ایک نیا رجحان فروغ پذیر ہے۔ یہ رجحان قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں پر چند خاندانوں کی اجارہ داری کا قیام ہے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں جہاں ایک ہی خاندان کے چار پانچ افراد مثلاً باپ' بیٹا' داماد' بھائی' عم زاد' ماں بیٹی' شوہر' بہن اور بھائی مختلف حلقوں سے منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچ گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ نام نہاد عوامی نمائندے جو ہارس ٹریڈنگ کی پیداوار ہیں سیاسی تربیت سے محروم ہیں۔ لہٰذا رائے عامہ کی نمائندگی نہیں کرتے۔ یوں عوامی نمائندگی ایوب خان دور کے کوئی دو سو خاندانوں میں مرکز ہو گئی ہے۔ چنانچہ اگر عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے اور سیاسی بیداری پھیلانے میں اگر کوئی ترقی ہوئی ہے تو اسے ترقی معکوس ہی کہا جائے گا۔ انتخاب میں ہوتا کیا ہے' عوام کو مختلف ذریعوں سے بھیڑ بکریوں کی طرح جمع کیا جاتا ہے۔ ان کے دلوں میں بعض شخصیات کا رعب ڈالا جاتا ہے یا پھر تصوراتی مقامی مسائل کا تذکرہ کر کے عوام کی توجہ حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن جب عوام کے ووٹ مل جاتے ہیں تو پھر عوامی بہبود کے کاموں میں ان سے کوئی رائے نہیں لی جاتی۔ بلاشبہ یوں منتخب ہونے والے وزارتوں' سرکاری عہدوں' غیر ملکی تعیناتی بنکوں سے قرضے اور دوسری سہولتوں کی سودے بازی خوب کرتے ہیں۔ یوں عوام کو ملنے والی سہولتیں بھی ان کے خاندان' عزیز و اقارب اور دوستوں کی جھولی میں ڈال دی جاتی ہیں۔ اگر اس رجحان کو روکا نہ گیا' جس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا' تو وہ دن دور نہیں جب عوام انتخابی عمل پر ہی اعتماد کھو بیٹھیں گے۔ دوسرے الفاظ میں وہ جمہوریت سے مایوس ہو جائیں گے جو اس ملک کی اساس ہے اور اپنی تمناؤں کے بر آنے کے لئے دوسرے ذرائع بروئے کار لانے پر غور شروع کر دیں گے۔ ۱۹۷۷ء میں مارشل لا کے نفاذ کے وقت ایسے ہی حالات پیدا ہوئے تھے۔ بلوچستان خصوصاً مری قبائل کے علاقہ میں وسیع پیمانے پر ہنگامے ہوئے۔ وہاں ہماری فوج کا ایک معتدبہ حصہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ہدایت پر متعین کیا گیا تھا۔ یہ طریق کار نہ صرف یہ کہ پاکستان کے لئے صحتمندانہ مثال نہ تھی بلکہ اس سے

Marfat.com

ملک عالمی سطح پر قوموں کی برادری اور غیر ملکی پریس میں بھی سخت بدنام ہو رہا تھا۔ بلوچستان میں پولیس اور فوج کے استعمال کا آغاز گورنر نواب آف کالا باغ کے دور میں ہوا۔ تاہم جب بلوچستان میں عطاء اللہ مینگل کی سربراہی میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت کو بلاجواز برطرف کیا گیا تو سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت نے بطوراحتجاج استعفاءدے دیا۔ حکومت نے اپنے اقدام کا جواز پیدا کرنے کے لئے بلوچستان اور سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی کے تمام سرکردہ رہنماؤں کوبغاوت اور مسلح شورش کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ ان گرفتاریوں کی بنیادی وجہ اسلام آباد میں عراقی سفارت خانہ سے اسلحہ کی برآمدگی تھی جس کے بارے میں یہ مفروضہ کھڑا ہو گیا کہ یہ اسلحہ بلوچستان میں حکومت کے خلاف استعمال کے لئے لایا گیا ہے۔ چنانچہ حیدر آبار (سندھ) میں ایک خصوصی ٹریبونل قائم کیا گیا۔ جس میں سردار عطاء اللہ مینگل ' سردار خیر بخش مری' خان عبدالولی خاں' شیر محمد مری اور متعدد دوسرے نیپ رہنماؤں کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ اس وقت میں سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کراچی میں بطور جج متعین تھا۔ اس موقع پر دو افراد نے جن میں اس دور کے سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی شامل تھے' مجھ سے رابطہ پیدا کیا اور کہا کہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی خواہش ہے کہ میں تین ججوں پر مشتمل حیدر آباد ٹریبونل کی سربراہی قبول کر لوں۔ گویا یہ حکومت کی طرف سے مجھ پر احسان کیا جا رہا تھا۔ اس واقعہ اور قومی اہمیت کے حامل کئی دیگر واقعات کی تفصیل میری اگلی کتاب <AND MATTERS MEN> میں دی جا رہی ہے۔

حیدر آباد میں مقدمہ کا اصل مقصد تو سیاسی انتقام ہی تھا' اور اس وقت عمومی رائے بھی یہی تھی۔ چنانچہ میں نے حیدر آباد ٹریبونل کی سربراہی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب مجھ سے ٹریبونل کی سربراہی قبول کرنے پر اصرار کیا گیا تو میں نے وزیر اعظم کے پیغامبروں کو' جن میں سے ایک دو اللہ کے فضل سے اب بھی بقید حیات ہیں' صاف صاف الفاظ میں بتایا کہ میں کسی قیمت پر بھی ان کی پیشکش قبول نہیں کروں گا اور اگر وزیر اعظم نے اپنی بات پر مزید اصرار کیاتو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ اس پر معاملہ ختم ہو گیا۔ حکومت نے تین اور جج اس ٹریبونل کے لئے مقرر کر دیئے

Marfat.com

اور یہ مقدمہ ۱۹۷۹ء کے مارشل لا کے نفاذ تک جاری رہا۔

نیز' جو بھی ہوا' چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق اور گورنر بلوچستان کی حیثیت میں جولائی ۱۹۷۷ء سے ستمبر ۱۹۷۸ء کے دوران جو طویل خط و کتابت ہوئی اس کا حوالہ دیئے بغیر یہ کہنا کافی ہو گا کہ جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں پہلی دو میٹنگوں کے دوران چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور دوسرے چوٹی کے جرنیلوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں مری بلوچ اور گورنر بلوچستان کی حیثیت سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے فوج اور بلوچوں کے درمیان مفاہمت کرا دوں' کیونکہ یہ ایک قومی خدمت ہو گی۔ انہوں نے اس بات پر بار بار زور دیا کہ اگر مفاہمت ہو جائے تو فوج علاقہ سے واپس بلائی جائے گی اور بلوچستان میں امن قائم ہو جائے گا۔ جرنیلوں کے عزائم نیک تھے۔ یہ کام بھی باعث عزت تھا۔ تاہم میں نے یہ مشکل کام شروع کرنے سے پہلے کچھ مطالبات پیش کئے۔ میں نے کہا کہ بلوچوں کو معافی دی جائے اور تمام گرفتار شدہ' مری اور بلوچ رہا کر دیئے جائیں جنہیں قبل ازیں مختلف فوجی عدالتوں سے تین سے پندرہ سال کی سزائیں دی جا چکی ہیں۔ میں نے ذاتی طور پر امن و امان کی ضمانت دی کہ رہائی کے بعد مری اور بلوچ قبائل کے یہ افراد پرامن زندگی بسر کریں گے۔ میرا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ بلوچستان میں عام معافی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ تمام قبائلی جو پہاڑوں پر چڑھے ہوئے ہیں یا سرحد عبور کر کے افغانستان چلے گئے ہیں' واپس اپنے گھروں میں آ جائیں۔ میرا تیسرا مطالبہ تھا کہ پٹ فیڈر کے میدانی علاقہ میں ۲۵ ہزار ایکڑ زمین مختص کی جائے جو افغانستان سے واپس آنے والے اور دوسرے مری یا بلوچ قبائلیوں کو الاٹ کی جائے۔ یہ حکومت کی طرف سے خیر سگالی کا ایک اظہار ہو گا۔ ہر خاندان کو جس کا سربراہ ہلاک ہو گیا ہو یا جن کے بھیڑوں اور بکریوں کے گلے ضائع ہو گئے ہوں' ۲۵ ایکڑ زمین الاٹ کی جائے۔ یہ ان کے نقصان کا معاوضہ تصور کیا جائے گا۔ میں نے ۵ کروڑ روپے کا بھی مطالبہ کیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس موقع پر جنرل ضیاء الحق (مرحوم) نے کہا تھا "یہ رقم تو بہت زیادہ ہے" اس پر میں نے جواب دیا کہ یہ روپیہ بھی آپ ہی کے وطن کے لوگوں کو ملے گا جنہوں نے بڑی تکالیف برداشت کیں ہیں اور سخت نقصان اٹھایا ہے۔ پھر اس سے ان میں اعتماد

Marfat.com

پیدا ہو گا اور ان کے زخموں پر مرہم رکھا جائے گا۔ میں نے یہ درخواست بھی کی کہ حیدر آباد ٹریبونل ختم کر دیا جائے۔ مقدمہ واپس لے لیا جائے اور تمام رہنماؤں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے۔

میں جنرل ضیاء الحق اور ان کے جرنیلوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے کسی مزید بحث مباحثے کے بغیر میری تمام تجاویز منظور کر لیں۔ اس امر کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ جہاں تک رقم اور زمین کی تقسیم کا تعلق تھا' میں نے تجویز پیش کی کہ ایک مشترکہ جرگہ بنایا جائے جس میں بلوچ' چند غیر جانبدار پٹھان سردار اور سابق شاہی جرگہ کے کچھ ارکان شامل کئے جائیں۔ یہ جرگہ متاثرین سے درخواستیں وصول کرے' ان کی تصدیق کرے اور پھر قبائلی روایات کے مطابق حقداروں کو رقم اور اراضی فراہم کر دی جائے۔ اس اتفاق رائے کے بعد میں نے پورے بلوچستان کا دورہ کیا۔ دورے کا آغاز میں نے لہو سے کیا۔ وہاں سے کاہان' منڈاہی اور ماوند گیا جو مری علاقہ میں ہے۔ وہاں سے ڈیرہ بگٹی اور سوئی پہنچا جو بگٹی علاقہ میں ہیں' پھر قلات خضدار' پنجگور' گوادر اور تربت پہنچا۔ میرے ساتھ ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل عبدالسعید (مرحوم)' میرا سیکرٹری اور دوسرا سرکاری عملہ تھا۔ میں نے بلوچوں کو حکومت کی عام معافی کی پالیسی سے آگاہ کیا اور بتایا کہ حکومت نقصان اٹھانے والوں کو معاوضہ دے گی۔ میں نے بلوچوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف پائی جانے والی بدگمانیوں کو دور کر دیا۔ میں نے انہیں حیدر آباد ٹریبونل کے خاتمہ اور مقدمہ واپس لئے جانے کے بارے میں بھی بتایا۔ اس کا قبائل پر نہایت عمدہ اور تسلی بخش اثر ہوا۔ سب لوگ پہاڑوں سے اتر آئے اور افغانستان سے بھی لوگ واپس آ گئے۔ حیدر آباد کا مقدمہ ختم ہو گیا۔ تمام قیدی رہا کر دیئے گئے۔ یوں بلوچستان میں ایک بار پھر امن کا دور دورہ ہو گیا اور فوج واپس بلا لی گئی۔

حیدر آباد ٹریبونل میں تین سال تک ایک جھوٹے مقدمہ کی سماعت اور اس دوران نیپ کے لیڈروں کی نظر بندی سے جو تلخیاں پیدا ہو گئی تھیں' انہیں کم کرنے اور حکومت اور ان رہنماؤں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کے لئے میں نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق اور سردار عطاء اللہ ' سردار خیر بخش مری اور بعد

Marfat.com

میں میر غوث بخش بزنجو کے درمیان گورنر ہاؤس کوئٹہ میں ملاقاتوں کا اہتمام کیا۔ اس کے نتیجے میں حکومت اور بلوچ رہنماؤں کے درمیان حقیقی مفاہمت بڑھنا شروع ہوئی۔ لیکن بعد میں مجھے بتایا گیا کہ بلوچستان کے امور کے نام نہاد "ماہرین" نے' اب بھی ایسے "ماہرین" کی بڑی تعداد موجود ہے' میری تمام کوششوں کو سبوتاژ کر دیا۔ چنانچہ مفاہمت کا یہ عمل آگے نہ بڑھ سکا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد حکومت نے مجھ سے مشورہ لینا بند کر دیا۔ میں نے بھی اپنی کوششیں ترک کر دیں۔ علاوہ ازیں جلد ہی میری جگہ نئے گورنر کا تقرر کر دیا گیا اور میں بطور چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ اپنے عہدے پر واپس چلا گیا۔ تاہم بطور گورنر میں نے ایسے قواعد اور مفصل طریق کار کا تعین کر دیا جس کے تحت جرگہ متاثرہ افراد سے درخواستیں وصول کر سکے اور ۵ کروڑ روپے کی رقم اور ۲۵ ہزار ایکڑ اراضی کی حقدار افراد میں تقسیم کا فیصلہ کر سکے۔ جنہیں بلوچستان میں دس سال کی بدامنی کے دوران نقصان پہنچا تھا۔ بعد میں قبائلی اور بعض دوسرے لوگ مجھے بتاتے رہے کہ حکومت کے بعض منظور نظر افراد کو معاوضہ دیا گیا ہے لیکن اس مقصد کے لیے متعلقہ قواعد وضوابط کو قطعی طور پر نظرانداز کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے وفاقی حکومت اور بلوچستان کے درمیان اعتماد میں اضافہ کے لئے جوکوششیں کی تھیں انہیں شدید نقصان پہنچا اور حقدار لوگوں کو کچھ بھی نہ ملا۔ تاہم جب جنوری ۱۹۸۹ء میں مجھے ایک ماہ کے لئے بلوچستان کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا تو میں نے زمین کے متعلق تحقیقات کرائیں جو بڑی فیاضی سے فوجی افسروں نے بطور معاوضہ تقسیم کی تھی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ بلوچستان کے ایک وزیر اعلیٰ کو فنڈز کی شدید کمی محسوس ہوئی' اس نے تمام اخلاقی اور مالی قانونی تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک کروڑ روپے بجٹ کی کمی کو پورا کرنے کے لئے استعمال کر لئے۔ لیکن ایک وزیر اعلیٰ تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ اس نے محض کاغذ کے ایک پرزے پر یہ لکھ کر' پچاس لاکھ روپے نکلوا لئے کہ ۱۹۷۷ء کے فنڈ میں سے یہ ادائیگی پاکستان کے مفاد میں کی جا رہی ہے لیکن اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی نہ اس کا کوئی مقصد بیان کیا گیا۔ کیا یہ بات باعث صدمہ اور شرمناک نہیں؟ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وفاقی حکومت کی طرف سے حساب فہمی یا محاسبہ کا کوئی انتظام ہی

Marfat.com

نہیں' جب مزید بتایا گیا کہ تین کروڑ روپے گورنر بلوچستان نے۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۸ء کے دوران استعمال کر لئے مگر اس کی کوئی تفصیل مجھے نہیں بتائی گئی۔ جب میں نے صوبہ کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے استعفا دیا تو مجھے بتایا گیا کہ اب اس رقم کا کوئی وجود ہی نہیں۔ یوں میری اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی ایک مفید کوشش رائیگاں گئی جو ہم نے حکومت اور بلوچستان کے عوام کے درمیان حقیقی مفاہمت پیدا کرنے اور بلوچستان کے متاثرہ افراد کی امداد کے لئے کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ایسے حالات ہوں تو حکومت اور عوام کے درمیان اعتماد کی عمارت کیسے تعمیر کی جا سکتی ہے جب اعلیٰ سطح پر لوٹ مار کا بازار گرم ہو۔

میں جب وزیر اعلیٰ بنا تو اسی نوع کی لوٹ کھسوٹ اور غبن کا ایک اور واقعہ میرے علم میں آیا۔ جس میں کروڑوں روپے اس طرح خورد برد کئے گئے کہ ہر ایم پی اے کو تین سال کے عرصہ میں تین کروڑ روپے صرف کرنے کا اختیار دیا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس عرصہ کے دوران وفاقی حکومت کو سرکاری فنڈز کی تھوک کے حساب سے خورد برد کی رپورٹ کی گئی اس پر ایف آئی اے نے تحقیقات کی۔ ایف آئی اے کے افسروں نے اس سلسلے میں بلوچستان کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ اس کے بعد جو رپورٹ پیش کی گئی وہ ہر کسی کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ ایک ارب ۲۲ کروڑ روپے کی کل رقم میں سے جو ایم پی اے حضرات کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ ۳۰ فیصد رقم چھوٹی موٹی ترقیاتی سکیموں پر صرف کی گئی۔ یہ سکیمیں صاف پانی کی فراہمی' دیہات میں چند ایک سڑکوں کی تعمیر اور بعض سکولوں کی عمارات کی تعمیر پر صرف کی گئی۔ لیکن یہ تمام سکیمیں ادھوری پڑی تھیں اور ان میں سے کوئی بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ یوں فنڈ کی ۷۰ فیصد رقم خرد برد کر لی گئی۔ یہ المناک رپورٹ جنوری 1989ء میں جب بلوچستان کا وزیر اعلیٰ تھا' میرے علم میں آئی۔ میں نے اسی ماہ وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہونے سے قبل میں نے فائل پر خصوصی احکام لکھے کہ نئی آنے والی حکومت اس معاملہ کی مفصل تحقیقات کرائے' سرکاری سرمایہ کے غبن کے چوروں کو مناسب سزا دی جائے۔ ان سے غبن شدہ رقوم وصول کی جائیں اور عوامی بھلائی کی ان سکیموں پر صرف کی جائیں جو عوام کے لئے

Marfat.com

شروع کی گئی تھیں۔ نئی انتظامیہ کے لئے راہ فرار ممکن نہ تھی نہ تھی۔ اس نے ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن نے صوبہ کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ کافی اخراجات اور ایک سال کی مدت صرف کرنے کے بعد کمیشن نے حکومت کو رپورٹ پیش کی جس میں ایف آئی اے کی رپورٹ کی حمایت کی گئی تھی۔ اس رپورٹ کے بعض حصے چند ایک اخبارات میں بھی شائع ہوئے۔ لیکن اس رپورٹ پر نہ تو عمل کیا گیا اور نہ ہی کسی کو سرکاری رقوم کی خورد برد کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس تحقیقاتی رپورٹ کا ایک حصہ ماہ نامہ "ہیرالڈ" (اپریل ۱۹۹۰ء) کے صفحہ ۷۵-۷۶ پر "انگشت شہادت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ رپورٹ کے بعض دلچسپ حصے درج ذیل ہیں۔

"کمیٹی کا یہ متفقہ خیال ہے کہ قانون ساز اداروں کے ارکان کو ترقیاتی سکیموں پر عمل درآمد کی سپرد داری غیر آئینی اقدام تھا۔ اسمبلی کے رکن کے فرائض میں قانون سازی ہوتی ہے۔ ترقیاتی سکیموں پر عملدرآمد سے اس کا کوئی تعلق نہیں--- کہ ۲۹ کروڑ ۴۷ لاکھ ۷۰ ہزار روپے کی کثیر رقم کے استعمال کا کوئی نشان ہی نہیں ملتا--- مزید برآں ۲۳ کروڑ روپے کی لاگت سے ۲۳۹ ترقیاتی سکیموں پر کام کا آغاز کیا گیا۔ یہ ترقیاتی سکیمیں یا تو علاقہ کے بااثر افراد کی منفعت کے لئے تھیں یا پھر متعلقہ ایم پی اے کو ہی ان سے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ پھر چار کروڑ سات لاکھ ۲۰ ہزار روپے ایسے منصوبوں پر صرف کر دیئے گئے جن سے بلوچستان اسمبلی کے ارکان کے عزیز و اقارب ہی مستفید ہو سکتے تھے۔ ان منصوبوں کو بناتے یا ان پر عمل کرتے وقت عام لوگوں کی بھلائی کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔"

ہیرالڈ نے مزید لکھا "۱۹۸۵ء کی برخاست شدہ اسمبلی کے گیارہ ارکان دوبارہ رکن اسمبلی منتخب ہو گئے ہیں اور ان میں چار تو بگٹی کابینہ کے ممبر ہیں باقی چار یا تو بگٹی کی مخلوط حکومت کی دوسری پارٹیوں سے وابستہ ہیں یا جو آئی جے آئی میں ہیں یا پھر اس کی اپنی پارٹی بلوچستان قومی اتحاد سے تعلق رکھتے ہیں' اب یہ کام قاری کا ہے کہ وہ ذرا پنجاب' سندھ اور سرحد کا تصور کرے جہاں اس طرح اربوں روپے ایسی ہی سکیموں پر صرف کئے گئے ہیں۔ کیونکہ ان صوبوں میں صرف ہونے والی رقوم بلوچستان کے

Marfat.com

مقابلے میں کہیں زیادہ ہوں گی۔ عوام جو امیدیں لگائے بیٹھے رہتے ہیں آج بھی پینے کے صاف پانی' چھوٹی موٹی ڈسپنسریوں' ٹیوب ویلوں زراعت کے لئے پانی' سڑکوں اور دوسری ضروریات زندگی سے محروم ہیں۔ وہ ان رقوم سے محروم چلے آ رہے ہیں جو ان کی بہبود کے لئے مختص کی جاتی ہیں اور یہ فنڈز سیاستدانوں اور نام نہاد عوامی نمائندوں کی جیب میں چلے جاتے ہیں۔ اس حکومت کے دور میں ارکان سینٹ اور قومی اسمبلی کے ارکان کو بھی ہر سال الگ الگ' عوامی ترقیاتی سکیموں کے نام پر بھاری رقوم دی جاتی رہی ہیں۔ لیکن یہ رقوم کہاں گئیں۔ اس کا تو بخوبی تصور کیا جا سکتا ہے۔

سرکاری فنڈز کی خورد برد کی روک تھام کے لئے میں نے بطور وزیر اعلیٰ وزیراعظم کو تجویز پیش کی کہ سب سے پہلے وہ ذاتی محاسبہ کا اہتمام کریں اور پھر بطور پالیسی وہ تمام ترقیاتی منصوبے جو ایم پی اے' ایم این اے یا ارکان سینٹ کے ذریعے تکمیل پا رہے ہیں۔ ان کو ختم کر دیا جائے۔ ان پر سرکاری خزانہ سے بھاری رقوم بلا نتیجہ صرف ہو رہی ہیں۔ عوامی بھلائی کی تمام ترقیاتی سکیمیں۔ ماضی کی طرح' سرکاری اداروں کے ذریعے ہی مکمل کرا لی جائیں جن کے قواعد اور مالیاتی ضوابط کو مزید سخت بنایا جائے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری سفارشات پر کان نہیں دھرا گیا کیونکہ بے نظیر حکومت نے بھی ارکان اسمبلی کو بھاری رقوم دینے کا سلسلہ جاری رکھا اور اب میاں نواز شریف کی حکومت بھی غالباً اسی حکمت عملی پر عمل پیرا ہے۔

یہ کہنا بڑا آسان ہے کہ ہمیں اپنے وسائل پر انحصار کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے لئے اولین اصول "محاسبہ" ہونا چاہئے سرکاری فنڈز کی شکل میں عوامی نمائندوں کو سیاسی رشوت ختم ہونی چاہئے۔ گزشتہ دنوں کوئٹہ میں سرکاری رقوم کے خورد برد کی بات ہو رہی تھی۔ میرے ایک دوست نے جو ایک بڑے سرکاری عہدہ پر فائز ہیں' بجا طور پر کہا کہ حکومت کے مختلف شعبوں میں سرکاری فنڈز کے غبن اور خورد برد کو دیکھ کر تو امریکہ یا پاکستان کو امداد دینے والے دوسرے کسی ملک کو الزام نہیں دیا جا سکتا کہ انہوں نے پاکستان کی امداد بند کیوں کی ہے۔ کیا نئی حکومت ایک کمیشن قائم کرنے کی جرات کر سکتی ہے جو ملک بھر میں سیاستدانوں کو عوامی ترقی کے نام پر دیئے جانے

Marfat.com

والے فنڈز کے خرد برد کی تحقیقات کرکے مجرموں کو ننگا کرے ان سے سرکاری فنڈز وصول کرے اور ایسے لوگوں کو کم از کم پانچ سال کے لئے عوامی نمائندگی کا نا اہل قرار دے اور یوں محاسبہ اور حکومت پر عوامی اعتماد کو بحال کرے؟

یہ واقعی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے!

Marfat.com

تتمہ جات

۱۹۷۰ء میں ون یونٹ کے خاتمہ کے بعد مجھے سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کراچی کا جج مقرر کیا گیا۔ یہ ہائی کورٹ نئی قائم ہوئی تھی اور میں نہ صرف پاکستان بھر میں بلکہ کسی بھی ہائی کورٹ میں پہلا جج تھا جو بلوچستان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس حیثیت میں چھ سال تک فرائض ادا کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۷۶ء میں مجھے نئی بلوچستان ہائی کورٹ کوئٹہ کا پہلا چیف جسٹس مقرر کیا گیا۔ میں نے تنکا تنکا چن کر بلوچستان ہائی کورٹ قائم کی۔

۶ جولائی ۱۹۷۷ء کو دوسرے صوبوں کے چیف ججوں کی طرح مجھے بھی بلوچستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ میں اس منصب پر ستمبر ۱۹۷۸ء تک فائز رہا۔ اس کے بعد دوسرے چیف جسٹس صاحبان کی طرح میں بھی ہائی کورٹ میں بطور چیف جسٹس اپنے منصب پر واپس آگیا۔

بلوچستان ہائی کورٹ کے "فل کورٹ" کے ایک فیصلہ کے بعد چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر صدر مملکت نے ایک یک طرفہ حکم "چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر آرڈر نمبر ایک (۱۹۸۱ء) جاری کیا۔ جس پر اس کتاب میں بھرپور بحث کی گئی ہے۔ اس آرڈر کے تحت کئی اور ججوں کی طرح مجھے بھی ۲۵ مارچ ۱۹۸۱ء کو میرے منصب سے قبل از وقت سبکدوش کر دیا گیا حالانکہ چیف جسٹس کے عہدے کو آئنی تحفظ حاصل ہے اور آئین کے مطابق مجھے اس منصب سے ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہونا تھا۔ اس ضمن میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے حکم کا جو نوٹیفیکشن جاری ہوا' اس کی نقل بطور تتمہ "الف" ان تتمہ جات میں شامل ہے۔

۱۹۸۸ء میں جب میں ایک آپریشن کے بعد کراچی میں سرجن رحیم کے کلینک میں آرام کر رہا تھا' مجھ سے ٹیلی فون پر بار بار یہ استدعا کی گئی کہ میں نگران وزیراعلیٰ بلوچستان کا عہدہ سنبھال لوں اور یہ کہ مجھے ایک قومی فریضہ سمجھ کر اس منصب پر خدمات ادا کرنی چاہئیں۔ مجھ سے یہ درخواست اس سیاسی بحران پر قابو پانے کے لئے کی جا رہی تھی جو وزیراعلیٰ مسٹر ظفراللہ جمالی کے مشورے پر گورنر موسیٰ خان کے حکم سے بلوچستان اسمبلی کو برطرف کرنے سے پیدا ہو گیا تھا۔ تا آنکہ یہ تنازعہ ہائی کورٹ

Marfat.com

کے حکم سے حل کر دیا جائے جہاں متحارب فریق گورنر کے حکم کی آئینی حیثیت کو زیر بحث لا رہے تھے۔

میں نے بڑی رد و قدح کے بعد یہ عارضی منصب قبول کر لیا۔ درحقیقت جنرل موسیٰ خود ہی کراچی آ گئے اور مجھ سے ہسپتال میں ہی نگران وزیراعلیٰ کے عہدہ کا حلف لیا۔ (میرے تقرر کا حکم جو گورنر نے جاری کیا تتمہ "ب" کی صورت میں شامل اشاعت ہے" میں نے یہ منصب اس صاف صاف مفاہمت کے ساتھ قبول کیا۔ جیسا کہ میں نے کوئٹہ میں بطور نگران وزیراعلیٰ اپنی پہلی پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ میں عدالت عالیہ کے فیصلہ کی حرف بحرف پابندی کروں گا۔ اگر عدالت نے اسمبلی کو بحال کر دیا تو میں وزارت اعلیٰ کے منصب سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ اگر فیصلہ اس کے برعکس ہوا تو میں صوبہ میں انتخابات کراؤں گا۔ خود صوبائی اسمبلی کا انتخاب نہیں لڑوں گا اور پھر مستعفی ہو جاؤں گا۔

۲۳ جنوری ۱۹۸۹ء کو بلوچستان ہائی کورٹ نے فیصلہ سنا دیا۔ عدالت عالیہ نے صوبائی اسمبلی بحال کر دی میں نے وعدہ کے مطابق اسی روز گورنر کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

میں نے گورنر کو جو استعفا پیش کیا اس کی نقل گورنر بلوچستان کا میرے نام خط اور صدر پاکستان کے نام میرا خط تتمہ ج' د اور ہ کے طور پر شامل ہیں جو آپ اپنا ثبوت ہیں۔

آخر میں ایک خط کی فوٹو سٹیٹ بھی تتمہ جات میں شامل ہے جو میں نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو صدر ضیاء الحق کو لکھا تھا (دیکھئے ضمیمہ و) یہ خط قارئین کی دلچسپی کے لئے شامل اشاعت کیا جا رہا ہے اس خط سے ملک کی سنگین سیاسی اور آئینی صورت حال کے بارے میں میرے احساسات کا اظہار ہوتا ہے' جن سے اس دور میں ملک گزر رہا ہے۔

تتمہ "الف"

حکومت پاکستان
وزارت قانون و پارلیمانی امور

Marfat.com

(شعبہ قانون)

نوٹیفیکشن

نمبر ایف ۱۲(۳)/۸۱-۱۷ ii (بی) عبوری آئین کے حکم مجریہ ۱۹۸۱ء (سی - ایم - ایل اے آرڈر نمبر ایک) کی رو سے مندرجہ ذیل افراد ۲۵ مارچ ۱۹۸۱ء سے بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور جج کے عہدے پر برقرار نہیں رہے۔

۱۔ مسٹر جسٹس میر خدا بخش مری' چیف جسٹس

۲۔ مسٹر جسٹس ایم۔ اے۔ رشید' جج

عبدالجلیل صدیقی
سیکشن آفیسر

مینجر پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان پریس۔
برائے اشاعت در غیر معمولی گزٹ آف پاکستان حصہ سوم
نمبر ایف ۱۲ (۳)/۸۱-۱۷ ii (بی) اسلام آباد مورخہ ۷ اپریل ۱۹۸۱ء
نقل برائے:-

۱۔ سی - ایم - ایل - اے سیکرٹریٹ راولپنڈی
۲۔ سیکرٹری برائے گورنر بلوچستان کوئٹہ
۳۔ چیف سیکرٹری حکومت بلوچستان کوئٹہ
۴۔ پری رجسٹرار ہائی کورٹ بلوچستان کوئٹہ (دو فاضل نقول کے ساتھ جو متعلقہ افراد کو فراہم کی جائیں گی)
۵۔ اکاؤنٹنٹ جنرل بلوچستان کوئٹہ

تتمہ "ب"

حکم

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین مجریہ ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۱۰۹ کی دفعہ (۳) کے تحت حاصل شدہ اختیارات اور صدر پاکستان کی پیشگی منظوری کے ساتھ' میں جنرل (ریٹائرڈ) محمد موسیٰ' مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) خدا بخش مری کو فوری طور پر بلوچستان کی نگران حکومت کے سربراہ کے طور پر بلوچستان کا وزیراعلیٰ مقرر کرتا ہوں۔

Marfat.com

جنرل (ریٹائرڈ) محمد موسیٰ ہلال جرات
گورنر بلوچستان
مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

تتمہ "ج"

وزیراعلیٰ بلوچستان

ڈیر سر!

بلوچستان ہائی کورٹ کے فیصلہ مجریہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۹ء کے احترام میں، جس کے تحت بلوچستان کی اسمبلی کو بحال کر دیا گیا ہے، میں اپنا اور اپنی کابینہ کا استعفا پیش کرتا ہوں۔

شکریہ

جسٹس (ریٹائرڈ) میر خدا بخش مری
نگران وزیراعلیٰ
مورخہ ۲۳ جون ۱۹۸۹ء

تتمہ "د"

گورنر بلوچستان
ڈی او نمبر ۰۰۲۱ر پی ایس ۸۹
گورنر ہاؤس کوئٹہ

جنرل (ریٹائرڈ) محمد موسیٰ
۲۲ جنوری ۱۹۸۹ء

مائی ڈیر جسٹس میر خدا بخش مری

مجھے آپ کا اور آپ کی کابینہ کا استعفا ملا۔ آپ کا استعفا جمہوری اصولوں اور روایات کے عین مطابق ہے۔ آپ نے اور آپ کے وزرا نے صوبہ کی انتظامیہ کو عمدگی سے چلانے میں جو مشقت اٹھائی اور جس محنت سے کام کیا میں اس پر خراج تحسین کرتا ہوں۔ صوبہ کے عوام کے مفاد کے مطابق میں چاہوں گا کہ آپ اس وقت تک وہ فرائض جو آپ کو اور آپ کی کابینہ کو سونپے گئے ہیں۔ ادا کرتے رہیں جب

Marfat.com

تک آپ کا جانشین وزیر اعلیٰ کا منصب نہیں سنبھال لیتا

آپ کا مخلص
محمد موسیٰ

جسٹس (ریٹائرڈ) میر خدا بخش مری
نگران وزیر اعلیٰ بلوچستان
تتمہ "ہ"

کوئٹہ ۲۵ جنوری ۱۹۸۹ء

محترم صدر جناب غلام اسحاق خان

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے' میں نے ۲۳ جنوری ۱۹۸۹ء کو اسی وقت استعفا پیش کر دیا تھا جب بلوچستان ہائی کورٹ کے فیصلہ کا اعلان کیا گیا۔ صوبائی گورنر نے مجھے اس وقت تک صوبہ کے نگران وزیر اعلیٰ کے فرائض ادا کرتے رہنے کو کہا ہے جب تک میرا جانشین وزیر اعلیٰ کا منصب نہیں سنبھال لیتا۔

نگران وزیر اعلیٰ بلوچستان کے منصب سے میرے استعفے کا مقصد قانون کی حکومت کو مستحکم کرنا اور بڑی ہی مشکل سے گیارہ سال بعد حاصل ہونے والی جمہوریت کے عمل کو مضبوط بنانا تھا۔ میں یہ سب کچھ صرف اور صرف آپ کی امداد اور تعاون سے ہی کرنے کے قابل ہوا ہوں۔

میرے استعفا اور میرے نام گورنر بلوچستان کے خط محررہ ۲۴ جنوری ۱۹۸۹ء کی ایک نقل جناب کی اطلاع کے لئے حاضر ہے۔

بہترین تمناؤں کے ساتھ
آپ کا مخلص
جسٹس (ریٹائرڈ) میر خدا بخش مری

مسٹر غلام اسحاق خان
صدر' اسلامی جمہوریہ پاکستان
ایوان صدر راولپنڈی

Marfat.com

صاحبزادہ میاں جمیل احمد نقشبندی لاہور پاکستان ذخیرہ

تتمہ "و"

کوئٹہ

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء

۲۔ جیل روڈ کوئٹہ

فضیلت ماب جنرل ضیاء الحق صاحب صدر پاکستان

میں نے مشکل وقت میں بطور چیف جسٹس اور بلوچستان کے گورنر کی حیثیت میں ملک کی جو خدمات انجام دی ہیں' ان کی اور آپ سے جو جان پہچان ہے' اس کی بنا پر میں چند دفعات آپ کے ذاتی غور و فکر کے لئے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

ایک سابق جج کی حیثیت سے میں متعدد معذوریوں کا شکار ہوں۔ کیونکہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو بھی قاضی (جج) مقرر ہو جاتا ہے' وہ اسی اذیت سے گزر رہا ہوتا ہے جس اذیت سے وہ جانور گزرتا ہے جسے کسی تیز دھار چھری سے ذبح کرنے کے بجائے اس کا گلا زخم زخم کر دیا جائے۔

۱۔ جناب والا۔ قانونی یا دوسرے مباحث میں پڑے بغیر' مجھے یہ بتانے کی اجازت دیجئے کہ قرآن حکیم کا ایک بنیادی حکم یہ بھی ہے کہ "کسی شخص کو اس کا موقف سنے بغیر سزا نہیں دی جانی چاہئے" یہ اصول ہمارے سمیت تمام مہذب ممالک کی عدلیہ کا ناگزیر حصہ اور سماجی انصاف کی بنیاد بن چکا ہے اور یہ ماضی کے تمام آئینوں کا حصہ رہا ہے۔ اس مفید اصول کا مقصد سیاسی تبدیلیوں اور کسی بھی دور میں کسی بھی حکومت کی روزمرہ پالیسیوں کی ضروریات سے قطع نظر' شہریوں اور مملکت کے جائز حقوق کا تحفظ ہے۔ اس طرح یہ اصول عدلیہ کے توسط سے' عام لوگوں اور حکومت کے درمیان ایک ربط اور مکالمہ کا ذریعہ رہا ہے جس سے منظم انتظامیہ کو اونچ نیچ کے بغیر چلانے میں مدد ملتی ہے۔

۲۔ اگر میری یادداشت صحیح ہے تو میں نے آپ کے دورہ کوئٹہ کے دوران' آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی تھی کہ صرف خدا کی کرسی ہی مضبوط اور محترم ہے اور میری کرسی کمزور ترین۔ اگر کسی وجہ سے میری ضرورت باقی نہ رہے تو مجھے اس کی پیشگی اطلاع دے دی جائے۔ میں فوراً یہ کرسی خالی کر دوں گا کیونکہ موجودہ آئینی نظم میں اس کی کمزوری سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ مگر بد قسمتی سے مجھے اس حق سے

Marfat.com

محروم رکھا گیا اور میرا موقف سنے بغیر مجھے سزا سنا دی گئی۔

۳۔ جہاں تک سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت میں چھ سال تک چار سال بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے اور ایک سال سے زائد عرصہ تک صوبہ کے قائم مقام گورنر کی حیثیت سے میری کارگزاری کا تعلق ہے۔ مجھے اس کا ذرہ بھر بھی ملال نہیں۔ نہ ہی میں اس پر معذرت خواہ ہونے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کیونکہ میں نے اس دوران معقولیت اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور اس کے مطابق صرف وہی کام کیا جسے میں ملک اور اپنے ہم وطنوں کے مفاد میں تصور کرتا تھا۔

۴۔ جناب والا۔ حکومت کے عمال خصوصاً وزرا رات دن تقریریں کرتے رہتے ہیں جو اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ملک اپنی ۳۳ سالہ تاریخ کے مشکل ترین دور سے گزر رہا ہے چنانچہ عوام سے اتحاد و یکجہتی کی اپیلیں کی جاتی ہیں۔ صورت حال ایسی ہو سکتی ہے کیونکہ ہم بعض اندرونی اور بیرونی عوامل کی وجہ سے گوناگوں مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ہمارے ایک ہمسایہ ملک میں اچانک سیاسی تبدیلی آئی تھی تو میں نے آپ کی توجہ فوری طور پر اس کی طرف دلائی تھی۔ ہم بطور قوم بڑھتے ہوئے خطرات کو خود سے دور رکھنے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں یا ہوں گے اس کا فیصلہ تو تاریخ ہی کرے گی۔

۵۔ ایک بات تو بہر حال یقینی ہے کہ پیشہ ور مقرروں کی لچھے دار تقریریں اب ماضی رفتہ کی باتیں ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو "چور کو کہتے ہیں اپنا کام جاری رکھو اور سادھ کو کہتے ہیں' ہوشیار رہنا" بھلا ان کی تقریریں لوگوں پر خاک اثر انداز ہوں گی۔ کیونکہ ماضی میں ان لوگوں کی تیزی سے وفاداریاں بدلنے کی عادت تو ان کے چہرے پر رقم ہے۔ علاوہ ازیں ریا کاری کی باتیں لوگوں کے دل کو نہیں لگتیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی وجہ سے عوام متحد ہونے کے بجائے زیادہ غیر متحد ہوتے چلے جاتے ہیں اور تقریروں کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال کا اگر کوئی علاج ہے تو جناب صدر فطری طور پر یہ علاج آپ کو ہی دریافت کرنا ہے۔

Marfat.com

۶۔ تاریخ میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے' جب کسی کے پاس اقتدار آتا ہے تو یہ خواہ کتنی ہی نچلی سطح پر کیوں نہ ہو' جھوٹے' خوشامدی مفاد پرست بے آبرو لوگوں کا ٹولہ اس کے گرد گھیرا ڈال لیتا ہے۔ یوں ملک اور عوام سے اس کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے سچائی معنی کھو چکی ہوتی ہے۔ وہ صاحب اقتدار کو' اپنے مانگے تانگے کے علم سے' کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں حقیقی علم کی دولت سے نوازتا ہی نہیں۔ اپنی باتوں سے یا اپنے مصنوعی عادات و اطوار سے' چاپلوسی سے' متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جونہی ان کے ممدوح پر برا وقت آتا ہے تو وہ اس سے فوراً الگ ہو جاتے ہیں جیسا کہ وہ ماضی میں اپنے آقاؤں کے ساتھ کر چکے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسے لوگ تو عوام کو جوابدہ نہیں ہوتے۔ وہ کسی سے وفا کرتے ہی نہیں بلکہ وہ سر عام یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ وہ تو محض اپنی عقل کی وجہ سے زندہ ہیں اس نوع کی صورت. حال سے بچنے کے لئے قرآن حکیم اور حدیث رسول سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے اور قرآن و حدیث سے رہنمائی حاصل کرنے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

۷۔ آخر میں' میں ایک نہایت ہی افسوسناک رجحان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو حکومت صوبوں خصوصاً بلوچستان کی طرح کے چھوٹے صوبوں میں' رقبہ میں چھوٹے نہیں' اختیار کئے ہوئے ہے۔ وہ یہ کہ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی صوبہ کے شہری رات بھر میں دوسرے تیسرے بلکہ چوتھے درجہ کے شہری بن جاتے ہیں۔ اور انہیں اس حکومت کے سامنے اپنی وفاداری یا حب الوطنی کا ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے جو ان الفاظ' وفاداری' حب الوطنی کے معانی سے بھی آشنا نہیں ہوتی۔ ہم اس علاقہ میں جب برطانیہ کی غیر ملکی حکومت سے نبرد آزما تھے اور اس کے بعد تحریک پاکستان میں بڑھ کر حصہ لے رہے تھے تو ہم محب وطن تھے جب پاکستان معرض وجود میں آگیا' تو ہمیں صوبائی ہو یا مرکزی' ہر بیورو کریٹ کے سامنے اپنی شناخت ثابت کرنا پڑتی تھی۔ جناب والا! ان سے منہ کا مزہ تلخ ہو جاتا ہے۔ ماضی میں ملک کے لئے میری خدمات کے باوجود میں بھی حکومت کے اس رویہ کا شکار ہوں' مثال کے طور پر میں نے اپنا پاسپورٹ تجدید کی غرض سے جمع کرایا مگر میرا پاسپورٹ دو ماہ تک صرف اس لئے روکا گیا کہ اسلام آباد سے ہدایات نہیں آئی تھیں۔ حالانکہ

Marfat.com

میرے ڈاکٹروں نے مجھے سختی سے مشورہ دیا تھا کہ میں اگست میں ضرور باہر چلا جاؤں۔ دوسرے انتظامیہ عام ٹیکس دھندگان کا روپیہ اسی طرح ضائع کر رہی ہے کہ میرے پیچھے سی آئی ڈی اور انٹیلی جنس کے اہلکاروں کو لگا دیا گیا ہے تاکہ میری سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔ یہ کیا بات ہے کہ کل تو صوبہ میں اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھا مگر آج میں ایک مشتبہ قرار پایا ہوں میں حیران ہوں یہ سب کچھ کیا ہے؟ جناب والا یہ بڑا تکلیف دہ ہے

۸۔ جناب والا! کیا یہ سوچنا غلط ہو گا کہ میں تیسرے یا چوتھے درجے کا شہری بن چکا ہوں ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیا کوئی مجھ سے ذاتی انتقام لے رہا ہے' حالانکہ میں جانتا ہی نہیں کیوں؟ اسلام میں تو ذاتی انتقام کی کوئی گنجائش ہی نہیں یہ انتقام معمولی ہو یا بہت بڑا' کیونکہ اسلام تو عفو و درگزر کا دین ہے۔ آخر میں مجھے حافظ شیرازی کا ایک شعر پیش کرنے کی اجازت دیجئے جو ان حالات میں صادق آتا ہے۔

گناہ گرچہ بنود' اختیار ما حافظ
نو در طریق ادب کوش' وگو گناہ فراست

آپ کا مخلص ترین
میر خدا بخش مری
بی اے ایل ایل بی' بار ایٹ لا
سابق جج سندھ بلوچستان ہائی کورٹ
سابق چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ و سابق
قائم مقام گورنر بلوچستان مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء
(بذریعہ پی آئی اے)

فضیلت ماب جنرل محمد ضیاء الحق
صدر پاکستان و چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر راولپنڈی
نوٹ۔ ہمارے مرحوم جرنیل صاحب کو اس خط کا جواب دینے کی بھی توفیق نہ ہوئی!

Marfat.com

اظہارِ تشکّر

یہ کتاب پاکستان کے تمام جمہوری، سیاسی، قانونی، عدالتی اور آئینی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ مطالعے کا دائرہ ضرورتاً وسیع اور متنوّع ہے۔ زاویۂ نگاہ کی نوعیت کہیں عمومی ہے اور کہیں خصوصی۔

اس کتاب کی تصنیف میں پاکستانی اور غیر ملکی مصنّفین کے معیاری شہ پاروں سے استفادہ کیا گیا ہے جس کے لیے میں اُن کا بیحد ممنون ہوں۔ جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی، کتاب کے متن میں ہی اُن کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ اسی لیے علیٰحدہ کتابیات منسلک نہیں کی گئی۔

میں مندرجہ ذیل پاکستانی و غیر ملکی اخبارات و جرائد اور مجلّات کا بھی احسان مند ہوں۔ ان سے وسیع تر اقتباسات ناگزیر تھے تاکہ ایک ہی موضوع پر تحریر کے دو مختلف اسلوبوں کو اجاگر کیا جا سکے :۔

1. *Amnesty International Report on Pakistan Year 1981* – London.
2. *Far Eastern Economic Review*–Hong Kong, 1981.
3. *Sind Quarterly* – Karachi.
4. *The Daily Dawn* – Karachi.
5. *The Daily Muslim* – Islamabad.
6. *The Daily Guardian* – London.
7. *The Daily Telegraph* – London.
8. *The Daily Observer* – London.
9. *The Pakistan Legal Decisions, Journal,* Supreme Court of Pakistan.
10. *In Defence of the Continuity of Law; Pakistan's Courts in Crisis of State* by Dr. Dietre Conrad – Director of South Asia Institute, University of Heidiberg– West Germany.
11. *Pakistan Law Journal,* Vol. XIII, 1985 – Magazine Section.
12. *Constitution of Pakistan, 1965.*

Marfat.com

13. Constitution of Pakistan, 1962.
14. *Constitution of Pakistan, 1973.*
15. *The Revival of Constitutional Order, 1985.*
16. *The Provisional Constitutional Order, 1985.*
17. *Pakistan Geopolitics* by Dr. Ikram Azam (Published by PFI Islamabad 1989)

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسّلام پرنٹر اور پبلشر

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

مارشل لا آئین اور عدالتیں

انتخابات میں ہوتا کیا ہے؟ عوام کو مختلف ذریعوں سے بھیڑ بکریوں کی طرح جمع کیا جاتا ہے۔ ان کے دلوں میں بعض شخصیات کا رعب ڈالا جاتا ہے یا پھر تصوراتی مقامی مسائل کا تذکرہ کر کے عوام کی توجہ حاصل کی جاتی ہے لیکن جب عوام کے ووٹ مل جاتے ہیں تو پھر عوامی بہبود کے کاموں میں ان سے کوئی رائے نہیں لی جاتی۔ بلاشبہ یوں منتخب ہونے والے وزارتوں، سرکاری عہدوں، غیر ملکی تعیناتی، بنکوں سے قرضے اور دوسری سہولتوں کی سودے بازی خوب کرتے ہیں۔ یوں عوام کو ملنے والی سہولتیں بھی ان کے خاندان، عزیز و اقارب اور دوستوں کی جھولی میں ڈال دی جاتی ہیں۔ اگر اس رجحان کو روکا نہ گیا جس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، تو وہ دِن دُور نہیں جب عوام انتخابی عمل پر ہی اعتماد کھو بیٹھیں گے۔ دوسرے الفاظ میں وہ جمہوریت سے مایوس ہو جائیں گے جو اس ملک کی اساس ہے اور اپنی تمناؤں کے بر آنے کے لیے دوسرے ذرائع بروئے کار لانے پر غور شروع کر دیں گے۔

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

969 0 01115 4

Rs. 150

Marfat.com

مارشل لا آئین اور عدالتیں

انتخابات میں ہوتا کیا ہے؟ عوام کو مختلف ذریعوں سے بھیڑ بکریوں کی طرح جمع کیا جاتا ہے۔ ان کے دلوں میں بعض شخصیات کا رعب ڈالا جاتا ہے یا پھر تصوراتی مقامی مسائل کا تذکرہ کر کے عوام کی توجہ حاصل کی جاتی ہے لیکن جب عوام کے ووٹ مل جاتے ہیں تو پھر عوامی بہبود کے کاموں میں ان سے کوئی رائے نہیں لی جاتی۔ بلاشبہ یوں منتخب ہونے والے وزارتوں، سرکاری عہدوں، غیر ملکی تعیناتی، بنکوں سے قرضے اور دوسری سہولتوں کی سودے بازی خوب کرتے ہیں۔ یوں عوام کو ملنے والی سہولتیں بھی ان کے خاندان، عزیز و اقارب اور دوستوں کی جھولی میں ڈال دی جاتی ہیں۔ اگر اس رجحان کو روکا نہ گیا جس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، تو وہ دِن دُور نہیں جب عوام انتخابی عمل پر ہی اعتماد کھو بیٹھیں گے۔ دوسرے الفاظ میں وہ جمہوریت سے مایوس ہو جائیں گے جو اس ملک کی اساس ہے اور اپنی تمناؤں کے بر آنے کے لیے دوسرے ذرائع بروئے کار لانے پر غور شروع کر دیں گے۔

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

969 0 01115 4

Rs. 150

Marfat.com